اسلام کا نظریۂ ملکیت

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

www.KitaboSunnat.com

اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ

۱۳ - ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور (پاکستان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

اسلام کا نظریۂ ملکیت

حصۂ اوّل

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

www.KitaboSunnat.com

اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ

۱۳ - ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور (پاکستان)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ)

طابع : اشفاق مرزا، مینجنگ ڈائرکٹر
ناشر : اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور
مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

اشاعت :

، اوّل	فروری ۱۹۶۸ء	۲۰۰۰
، دوم	جون ۱۹۷۳ء	۱۰۰۰
، سوئم	مئی ۱۹۸۰ء	۱۱۰۰
چہارم	جون ۱۹۸۶ء	۱۱۰۰

قیمت :- ۹۶/۲۴ روپے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۹-۰۰ بے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
06264

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

اِس کتاب کے مؤلف ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی پہلی کوششیں اسلام میں عدلِ اجتماعی (اردو ترجمہ "العدالۃ الاجتماعیۃ" مُصنفہ سید قطب شہید) اور اسلام کا نظامِ محاصل (ترجمہ کتاب الخراج امام ابو یوسفؒ) اہلِ علم سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اب آپ کی تازہ تحقیقی تالیف "اسلام کا نظریہ ملکیت" پیشِ خدمت ہے۔

قارئین کو اس کتاب کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس کے تفصیلی مطالعہ ہی سے ہوگا۔ البتہ ہم یہ بات یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے معاشی لٹریچر میں یہ ایک بیش بہا اضافہ ہے اور معاشیات کا اعلیٰ مذاق رکھنے والے طلباء اور محققین اس کو ایک مفید اور سودمند کتاب پائیں گے۔

ابتداءً کتاب کا مسودہ بارہ ابواب پر مشتمل ایک جلد میں شائع کرنے کے خیال سے مرتب کیا گیا تھا۔ لیکن کتابت و ترتیب میں ضخامت بڑھ جانے اور کاغذ کی ہوش رُبا گرانی کی وجہ سے قارئین کی سہولت کی خاطر اس کو ۲ حصوں میں شائع کیا جارہا ہے۔ تاکہ ہر جیب و استطاعت کے زیادہ سے زیادہ افراد اس بیش قیمت تالیف سے استفادہ کرسکیں۔

اِس کتاب کے حصہ اوّل میں حسبِ ذیل ابواب شامل کیے گئے ہیں:

۱۔ فکری پس منظر۔

۲۔ فرد و اجتماع کے مابین حقوقِ ملکیت کی تقسیم۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳ - انفرادی ملکیت کے ذرائع -
۴ - مالک کے حقوق -
۵ - انفرادی حقوقِ ملکیت کے حدود -
۶ - مالک کی ذمہ داریاں -
۷ - اجتماعی ملکیت -

حصہ دوم میں حسب ذیل ابواب شامل کیے گئے ہیں :

۸ - ریاست کی ملکیت کے ذرائع -
۹ - ریاست کے مالکانہ حقوق -
۱۰ - ریاست کے مالکانہ حقوق کے حدود -
۱۱ - اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں -
۱۲ - ریاست اور انفرادی حقوقِ ملکیت -

ہمیں اُمید ہے کہ کتاب کے دونوں حصوں کے مطالعہ سے قارئین کو موضوع کے جملہ پہلوؤں پر سیر حاصل بحث اور وسیع معلومات حاصل ہوں گی -

کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم اس کو اپنے روایتی معیار پر آفسٹ کی نفیس کتابت و طباعت پر شائع کر رہے ہیں - اُمید ہے کہ قارئین اس کو پسند فرمائیں گے -

نیاز مند :

اشفاق مرزا ، مینجنگ ڈائرکٹر
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور

۱۳ شعبان المعظم ۱۳۸۷ھ
مطابق ۱۶ نومبر ۱۹۶۷ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرستِ ابواب

حصّۂ اوّل

۱ ۔ فکری پس منظر ۲۳
۲ ۔ فرد و اجتماع کے مابین حقوقِ ملکیّت کی تقسیم ۸۵
۳ ۔ انفرادی ملکیّت کے ذرائع ۱۲۷
۴ ۔ مالک کے حقوق ۱۵۳
۵ ۔ انفرادی حقوقِ ملکیّت کے حدُود ۲۰۵
۶ ۔ مالک کی ذمّہ داریاں ۲۴۹
۷ ۔ اجتماعی ملکیّت ۲۸۹

حصّۂ دُوم

۸ ۔ ریاست کی ملکیّت کے ذرائع ۷
۹ ۔ ریاست کے مالکانہ حقوق ۶۱
۱۰ ۔ ریاست کے مالکانہ حقوق کے حدود ۷۷
۱۱ ۔ اسلامی ریاست کی معاشی ذمّہ داریاں ۹۱
۱۲ ۔ ریاست اور انفرادی حقوقِ ملکیت ۱۵۵

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست مضامین

عرضِ ناشر	۳
تعارف	۱۳
۱۔ پہلا باب، فکری پس منظر	۲۳
(الف) نظریۂ کائنات	۲۳
کائنات	۲۳
انسان	۲۴
حیات	۲۸
اسلامی تصورِ ملکیت	۳۱
(ب) نظریۂ اجتماع	۳۸
فرد	۳۸
اجتماع	۳۹
فرد و اجتماع	۴۶
اجتماعی ادارے	۴۷
ریاست	۴۸
فرد و ریاست	۵۴
اسلامی نظریۂ اجتماع اور مسئلہ ملکیت	۶۳

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ج) مزاجِ شریعت	۶۴
مقاصدِ شریعت	۶۴
قوانینِ شریعت	۶۷
انفرادی حقوق	۷۰
قانون و اخلاق	۷۳
فرض کفایہ	۷۷
مزاجِ شریعت اور نظریۂ ملکیت	۸۳
۲۔ دُوسرا باب، فرد و اجتماع کے مابین حقوقِ ملکیت کی تقسیم	۸۵
انفرادی ملکیت کا حق	۸۶
ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت کے دلائل	۹۳
(ل) انفرادی ملکیت کا خلافِ فطرت ہونا	۹۳
(ب) انفرادی ملکیت کا پیداوار کے اجتماعی طریقہ سے متصادم ہونا	۹۷
(ج) انفرادی ملکیت کا پیداواری عمل میں مزاج پیدا کرنا	۱۱۳
(د) دولت کی عادلانہ تقسیم کے لیے اجتماعی ملکیت کی ضرورت	۱۱۷
اسلام اور ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت	۱۱۸
آزادی اور جمہوریت کے لیے انفرادی ملکیت کی ضرورت	۱۱۹
اخلاقی اور رُوحانی ارتقار کے تقاضے	۱۲۲
استحصال بے جا کا امکان کم کرنے کی مؤثر تدابیر	۱۲۴
۳۔ تیسرا باب، انفرادی ملکیت کے ذرائع	۱۲۷
حقِ ملکیت کی تعریف	۱۲۰
حصولِ ملکیت کے شرعی طریقے	۱۳۲
(ل) مباح چیزوں پر قبضہ	۱۳۲
۱۔ احیار اموات	۱۳۳

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ شکار ۱۳۹
۳۔ معدنیات اور دفینے ۱۴۱
(ب) انتقالِ ملکیت بذریعہ معاہدہ ۱۴۳
(ج) وراثت ۱۴۴
(د) ثمراتِ ملکیت ۱۵۱
۴۔ چوتھا باب، مالک کے حقوق ۱۵۲
(ا) حقِ استعمال و تصرّف ۱۵۳
(ب) نفع آور کاروبار کا حق ۱۵۴
نفع: ذاتی کاروبار ۱۵۶
۲۔ شرکت ۱۶۶
۳۔ مضاربت ۱۶۷
سُود کی حرمت ۱۷۱
کرایہ ۱۷۸
۱۔ زرعی زمینوں کا کرایہ (لگان) ۱۸۲
۲۔ مزارعت ۱۸۴
(ج) انتقالِ ملکیت کا حق ۱۹۲
(د) حقِ تحفظ ۱۹۷
۱۔ مال کو جمع کرنے کا حق ۱۹۸
۲۔ ناقص ملکیت ۲۰۱
۵۔ پانچواں باب، انفرادی حقوقِ ملکیت کے حدُود ۲۰۵
(ا) حقِ استعمال و تصرّف کے حدُود ۲۰۶
۱۔ مال کو ضائع کرنے کی ممانعت ۲۰۷
۲۔ غیر شرعی مصارف پر مال صرف کرنے کی ممانعت ۲۱۴

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳- اسراف کی ممانعت ۲۱۵

۴- تنعم اور عیش کوشی کی ممانعت ۲۲۳

۵- مضرت رساں استعمالِ ملکیت کی ممانعت ۲۳۰

۶- ذی رُوح املاک پر تصرف کے حدود ۲۳۵

(ب) نفع آور کاروبار کے حدُود ۲۳۷

(ج) حقِ انتقالِ ملکیت کے حدُود ۲۴۲

(د) حقِ تحفظ کے حدُود ۲۴۳

۶- چھٹا باب، مالک کی ذمہ داریاں ۲۴۹

(ا) نفقاتِ واجبہ ۲۵۲

۱- زوجہ کا نفقہ ۲۵۶

۲- ماں باپ اور اولاد کا نفقہ ۲۵۷

۳- دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ ۲۵۸

(ب) فریضۂ زکوٰۃ ۲۵۹

(ج) مزید انفاقِ مال کی ذمہ داری ۲۶۱

۱- مہماں کا حق ۲۶۸

۲- اضطراری حالات میں مبتلا اہلِ حاجت کے حقوق ۲۷۲

(د) قرض اور عاریت ۲۸۰

(ھ) حقوقِ ارتفاق ۲۸۴

۱- حقِ شرب ۲۸۴

۲- حقِ مجری ۲۸۵

۳- حقِ مسیل ۲۸۶

۴- حقِ گذرگاہ ۲۸۶

۵- حقِ جوار ۲۸۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۷۔ ساتواں باب ، اجتماعی ملکیت	۲۸۹
(ا) مخصوص مشترکہ ملکیت	۲۹۰
(ب) عام مشترکہ ملکیت	۲۹۲
۱۔ عالمی مشترکہ املاک	۲۹۳
۲۔ ملکی مشترکہ املاک۔	۲۹۵
۳۔ مقامی مشترکہ املاک	۲۹۹
(ج) اجتماعی ملکیت	۳۰۱
۱۔ اجتماعی اداروں اور انجمنوں کی املاک	۳۰۲
۲۔ مقامی حکومت کی املاک	۳۰۳

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقدمہ طبع ثانی

دوسری اشاعت کے لیئے نظرِ ثانی کرتے وقت کتاب کے بعض مقامات پر جزئی ترمیمات کردی گئی ہیں۔ ان ترمیمات کا تعلق زیادہ تر کتاب کے پہلے اور بارھویں باب سے ہے۔ میں ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں جنہوں نے نظرِ ثانی کے سلسلہ میں مجھے مشورے دیئے ہیں۔

مسلم یونی ورسٹی۔ علی گڈھ

۲۷ رجمادی الاوّل ۔ ۱۳۹۰ھ

یکم اگست ۱۹۷۰ء

محمد نجات اللہ صدیقی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تعارف

جب سے ہمارا معاشرہ اسلام کو عام مذاہب کی طرح صرف عبادات و رسوم کا ایک مجموعہ یا محدود معاشرتی تعلقات کے بارے میں چند ضوابط سمجھنے کی بجائے ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے دیکھنے لگا ہے، اسلامی نظام کے مختلف پہلوؤں کی طرف اس کی توجہ بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ توجہ قدرتی طور پر ان شعبوں کی طرف زیادہ ہے جن کی مزید تنظیم کا مسئلہ موجودہ تمدن نے زیادہ پیچیدہ اور اہم بنا دیا ہے۔ سماجی علوم و مسائل کا ہر طالب علم آج یہ جاننا چاہتا ہے کہ اسلام ان پیچیدہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے حل میں ہماری کیا رہنمائی کر سکتا ہے جن سے دورِ جدید کا انسان دوچار ہے۔

عرصے سے یہ مزاج بنا ہوا تھا کہ مغربی تہذیب کی بنیادی قدروں اور اس کے مخصوص طریقوں ہی کو ہر مسئلہ کا واحد حل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن مختلف تاریخی عوامل نے اس مزاج کو بدلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مغرب خود ہی اپنے انتشار سے تنگ آ کر اپنی قدروں پر نظرِ ثانی کر رہا ہے۔ مغربی مفکرین بھی اسی نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ خرابیوں کی اصل وجہ مادی وسائل کی کمی نہیں بلکہ زیادہ بنیادی اور گہری ہے۔ موجودہ تہذیب کی بنیادوں کو علیٰ حالہٖ باقی رکھتے ہوئے صرف ہیئتِ تنظیم اور تفصیلی ضوابط میں تبدیلی کے ذریعہ اصلاحِ حال ممکن نہیں ہے ایک نئی ذہنیت، نئے مزاج اور نئے بنیادی اصولوں کے بغیر وہ فساد نہیں دور ہو سکتا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو خاندانی زندگی سے لے کر معیشت اور بین الاقوامی سیاست تک زندگی کے ہر شعبہ میں رونما ہو چکا ہے۔

انہی تاریخی عوامل نے متعدد اسلامی ممالک کے اندر یہ رجحان پیدا کیا ہے کہ امورِ مملکت کی تنظیم اور اجتماعی اداروں کی تشکیل میں اسلامی ہدایات کو رہنما بنایا جائے۔ عرصہ دراز تک مغربی اقوام کی سیاسی محکومیت کے بعد اب ان ممالک کو پہلی بار اس بات کا موقع ملا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کی تنظیم اپنے پسندیدہ اصولوں کے مطابق کریں۔ ان تمام ممالک میں ان کی حکومتوں کی موجودہ روش کے باوجود عوام، اہلِ علم اور ذہین طبقہ کے اندر ایک معتد بہ تعداد ایسے لوگوں کی پائی جاتی ہے جو اپنے ملک کے اجتماعی نظام کو اسلامی ہدایات کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں اور ہر ملک میں حکومت کو اس عوامی خواہش کا اثر قبول کر کے اس سلسلہ میں کچھ ایجابی قدم بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔ بدلے ہوئے حالات میں زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کتاب و سنت اور اسلاف کے دیے ہوئے علمی سرمایہ کی روشنی میں جدید اسلامی قانون سازی وقت کا ایک اہم تقاضا بن چکی ہے۔ مگر حکومتیں اور مجالس قانون ساز اس اہم ذمہ داری سے اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں جب تک اسلامی علوم کے طلبہ ان مسائل پر تحقیق کا حق نہ ادا کریں۔ خصوصیت کے ساتھ معاشی امور میں جدید اسلامی قانون سازی کا مسئلہ آج اسلامی مفکرین اور مسلمان ماہرینِ معاشیات کی اولین توجہ کا مستحق ہے۔ اس سلسلہ میں مسئلہ ملکیت بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ملکیت کے بارے میں جدید اسلامی قانون سازی کا مزاج کیا ہونا چاہیے؟ ان قوانین کو کن مقاصد کا تابع اور کن حدود کا پابند ہونا چاہیے؟ حقوقِ ملکیت کے باب میں انفرادی اور اجتماعی مصالح کے درمیان توازن کس طرح قائم رکھا جائے؟ اس ضمن میں ریاست کیا مفید عمل انجام دے سکتی ہے؟ یہ اس سلسلہ کے چند بنیادی سوالات ہیں۔ کتاب و سنت میں ان سوالات کے اصولی جواب موجود ہیں اور فقہاءِ اسلام نے اپنے دور کے تمدنی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تفصیلی اصول و ضوابط بھی مرتب کیے ہیں۔ لیکن جدید تمدنی حالات کو سامنے رکھ کر ایسے اصول ہم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کو خود مرتب کرنے ہیں، جن کو جدید اسلامی قانون سازی کی بنیاد بنایا جا سکے۔
حکمت کے بارے میں اسلامی ہدایات کے مطالعہ کا محرک صرف یہی نہیں ہے کہ اسلامی ممالک میں ان ہدایات کو قانون سازی کی بنیاد بنایا جا سکے۔ ان ہدایات کا مطالعہ خود اسلام کے مطالعہ کا ایک پہلو ہے، اور ہر اُس فرد کے لیے باعثِ دلچسپی ہے جو اسلام کو سمجھنے کے لیے یا اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہتا ہو۔ ان ہدایات میں سے بہت سی ہدایات ایسی ہیں جن کا تعلق تمام تر انفرادی زندگی سے ہے اور ان پر ہر حال میں عمل کیا جا سکتا ہے۔ مزید برآں جن مسلمانوں کو آج اس بات کا موقع نصیب نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک کے اجتماعی نظام کو اسلام کے سانچہ میں ڈھال سکیں۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات اپنی حقیقی شکل میں ملک کے ان دوسرے باشندوں کے سامنے پیش کی جائیں جو اسلام سے رسمی تعلق نہیں رکھتے تو ان کو ان تعلیمات کی موزونیت پر مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ اسلام کے بارے میں اچھی رائے قائم کر سکیں گے، اور ملک کے نظام کے بارے میں رائے قائم کرتے وقت ان تعلیمات کو بھی سامنے رکھیں گے۔

کسی صحیح رائے تک پہنچنا اسی وقت ممکن ہے جب طرزِ مطالعہ صحیح ہو اور ابتداء ہی سے ایسا زاویۂ نگاہ نہ اختیار کر لیا جائے جو مطالعہ کو غلط راہوں پر ڈال دے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلامی نظام کا مطالعہ کرتے وقت اسے کسی دوسرے نظام کے حوالہ سے سمجھنے یا ان نظاموں کے اپنے تصورات اور اصطلاحوں کی روشنی میں اسلام کی حقیقت جاننے کی کوشش نہ کی جائے۔ خواہ یہ دوسرا نظام سرمایہ داری یا اشتراکیت ہو یا مذہبی اصولوں کا کوئی مجموعہ۔ کسی نظام کا مطالعہ کرتے وقت جس چیز پر نگاہ رکھنی چاہیے وہ انسانی زندگی کے عام حالات اور وہ مسائل ہیں جن کا حل مقصود ہو۔ اسلامی نظام کو اس کی اپنی زبان و اصطلاحات کے ذریعہ اُسی کی فضا میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی انسان کی انفرادی و اجتماعی نیز داخلی و خارجی زندگی سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متعلق وہ عملی مسائل سامنے رکھنے چاہییں جن سے ہم آج دوچار ہیں۔ البتہ اس بات کی تمیز ضروری ہے کہ موجودہ مسائل میں سے کونسے مسائل انسانی زندگی کی عین ساخت اور طبیعت، اور جدید فنی ترقی کے نتیجہ میں قدرتی طور پر پیدا ہوئے ہیں اور کون سے مسائل کسی مخصوص نظام کی بدسلیقگی اور بے اعتدالی کی پیداوار ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تقابلی مطالعہ کے خلاف ہیں اور یہ نہیں پسند کرتے کہ اسلامی نظام کا مطالعہ سرمایہ دارانہ یا اشتراکی نظام سے موازنہ کرتے ہوئے کیا جائے۔ ہمارا منشا یہ ہے کہ مطالعہ صحیح طریقہ سے کیا جائے۔ موازنہ ان تصورات اور قدروں اور زندگی کے مختلف شعبوں کی تنظیم کے ان طریقوں کے مابین ہونا چاہیے۔ جو دو مختلف نظام تجویز کرتے ہیں۔ ان کی تہہ تک پہنچے بغیر دو مختلف نظاموں کے تفصیلی قوانین و ضوابط کا یا ان کے زیرِ اثر تشکیل پانے والے اجتماعی اداروں کا باہم مقابلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اجتماعی اداروں کے بارے میں فیصلہ کن چیز ان کی ہیئت نہیں ان کی روح اور مزاج ہے۔ اسی طرح قانون کے اندر جاری وساری روح خود قانون سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اس لیے ظاہری مماثلت یا بعض مظاہر کے اشتراک کی بنا پر دو مختلف نظاموں کے بارے میں یکساں ہونے کا گمان نہیں کرنا چاہیے۔

اسلام اپنی فکری بنیادوں، اپنے مزاج، اپنی بنیادی قدروں اور اپنے اصول قانون کے اعتبار سے ان سارے نظاموں سے یکسر مختلف ہے جن سے انسانی ذہن آج آشنا ہے یا پہلے کبھی آشنا رہا ہے۔ یہ بات مذہبی نظاموں کے بارے میں بھی درست ہے اور مادی نظاموں کے بارے میں بھی۔ اداروں اور ہیئتوں میں اشتراک کا سوال صرف دو ایسے نظاموں کے درمیان پیدا ہوسکتا ہے جو اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے یکساں اور کم از کم چند بنیادی امور میں متفق ہوں۔ کمیونزم (یا سوشلزم) اور سرمایہ داری کے درمیان اس طرح کا اشتراک پایا جاسکتا ہے کیونکہ یہ شرط یہاں پوری ہوجاتی ہے۔ یہ دونوں نظام انسان، اس کی زندگی، اور کائنات کی مادی توجیہ میں کسی حد تک ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ ان کے قانونی نظاموں میں جو روح جاری

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وسائل ہے وہ بھی بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ اختلاف صرف تنظیمی ہیئتوں اور حقوق و اختیارات کی تقسیم میں ہے۔ کہیں انفرادیت غالب ہے اور کہیں ایک مخصوص قسم کی اجتماعیت، اس کے برعکس اسلام حیات، کائنات اور انسان کے بارے میں ان دونوں مادی نظاموں سے مختلف ایک منفرد فکر کا حامل ہے۔ اس کا یہ فکر موجودہ عیسائیت اور ہندوازم وغیرہ دوسرے مذاہب سے بھی مختلف ہے۔ اس کا نظام قانون بھی ایک جداگانہ مزاج رکھتا ہے۔ اور وہ طریقہ بھی علیحدہ اور ممتاز ہے جو وہ اپنے اصولوں کے عملی نفاذ کے لیے اختیار کرتا ہے۔

اسلامی نظام کی اس منفرد حیثیت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔ مگر مسئلہ ملکیت کے ضمن میں تو اسے ایک لمحہ کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہیے۔ عام طور پر ملکیت کے سلسلہ میں دو ہی طریقے سامنے آتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح مطلق انفرادی ملکیت کا قائل ہونا یا اشتمالیت کی طرح مکمل اجتماعی ملکیت کا اصول اپنا لینا۔ اتنی لچک ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ جہاں حالات مجبور کریں وہاں بعض استثنائی شکلیں گوارا کر لی جائیں۔ جو لوگ اسلام کو موجودہ نظاموں کے حوالہ سے اسی کی اصطلاحوں میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بآسانی یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ ملکیت کے مسئلہ میں اسلام سرمایہ داری یا اشتراکیت کا طریق کار اختیار کرتا ہے۔

بعض لوگ ظاہری مماثلت کی بنا پر یہ رائے بھی قائم کر لیتے ہیں کہ اگر اسلامی ہدایات کے مطابق دورِ جدید میں کسی ملک کے نظامِ معیشت کی تنظیم عمل میں آئی تو اس کے عملی مظاہر سرمایہ دارانہ نظام سے چنداں مختلف نہ ہوں گے۔ بعض پڑھے لکھے لوگ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے یہ رائے ایک غیر علمی بلکہ غلط طرزِ مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

اسلام کے ایسے شارحین بھی موجود ہیں جن کو اسلام اور اشتمالی یا اشتراکی نظام کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں نظر آتا۔ اسلام تمام انسانوں کی ضروریات کی تکمیل کو اپنا ایک مقصد قرار دیتا ہے، زبردست طبقاتی تفاوت کو نہیں پسند کرتا اور اجتماعی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقاصد کے حصول کے لیے انفرادی آزادی کو چند حدود کا پابند کرنا ہے۔ اسی مماثلت کی بنا پر وہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ دورِ جدید میں اسلامی ہدایات کے مطابق اجتماعی زندگی کی تنظیم نو کے نتیجہ میں جو نظام وجود میں آئے گا وہ اشتراکیت سے بہت قریب یا اسی کی طرح کا ہو گا۔ یہ رائے بھی غلط طرزِ مطالعہ کا نتیجہ ہے، اور اس غلطی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں نظاموں کے بنیادی فکر، ان کے مقاصد، اور ان مقاصد کے حصول کے لیے اختیار کیے جانے والے ان مختلف طریقوں پر غور کیا جائے جو یہ دونوں نظام اختیار کرتے ہیں۔

اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ملکیت کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اسلام کی رہنمائی کو قدرے تفصیل کے ساتھ سامنے لایا جائے۔ چونکہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اسلام کی ہدایات اس کے بنیادی عقائد، توحید، رسالت، اور آخرت پر مبنی ہیں اور ان سے گہرا ربط رکھتی ہیں۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا ہے کہ پہلے باب میں وہ بنیادی تصورات اجمالاً پیش کر دیے جائیں جو اسلام نے کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں عطا کیے ہیں۔ ان تصورات کا مطالعہ اس طرح کیا گیا ہے کہ مسئلہ ملکیت سے ان کا تعلق پوری طرح واضح ہو جائے۔ اس ضمن میں اسلامی نظریۂ اجتماع پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اسلامی معاشرہ میں فرد و اجتماع کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے بعض مباحث کی قانونی نوعیت کے پیشِ نظر شریعتِ اسلامی کے مزاج... اس کے مقاصد اور اس کے مناہج پر بھی اجمالی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد دوسرے باب میں فرد و اجتماع کے مابین حقوقِ ملکیت کی تقسیم پر گفتگو کر کے انفرادی ملکیت کے ذرائع اور مالک کے حقوق پر بحث کی گئی ہے۔ یہ حقوق چونکہ بعض حدود کے پابند ہیں اور ان کے ساتھ مالک پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہیں۔ لہٰذا ان امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جیسا کہ فہرستِ موضوعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا۔

انفرادی ملکیت کے پہلو بہ پہلو اجتماعی ملکیت کے مطالعہ کو بھی کافی اہمیت دی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئی ہے۔ اجتماعی ملکیت کے مطالعہ میں ریاست، اس کی ملکیت کے ذرائع، اس کے مالکانہ حقوق، اور ان حقوق کے حدود پر گفتگو کی گئی ہے۔ گیارہویں باب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان مالکانہ حقوق کے ساتھ اسلامی ریاست پر جو معاشی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں ان پر قدرے تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔ اس کتاب کے آخری اور سب سے طویل باب میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ اسلامی ریاست انفرادی حقوقِ ملکیت میں کن حالات میں، کن مقاصد کے تحت، کس حد تک مداخلت کر سکتی ہے۔ دورِ جدید میں ملکیت سے متعلق جو نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر اسی سے ہے، اور جس معیار پر ایک طالب علم مختلف معاشی نظاموں کو پرکھے گا ان میں اس بات کو خاص اہمیت حاصل ہو گی کہ انفرادی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اجتماعی مصالح کے تحفظ کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کتاب کے آخری دو ابواب کا موضوع علماء اور محققین کی خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔

جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے زیرِ غور مسئلہ کا معاشیاتی تجزیہ کر کے اس کے مختلف پہلو واضح کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ایک مختصر کتاب میں نفع، سود، کرایہ، یا قیمتوں کی تعیین، محاصل اور معاشی ترقی کے لیے منصوبہ بندی جیسے اہم مسائل کا اتنا گہرا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ ان مسائل کا حق ہے، لیکن ہمیں امید ہے کہ ان موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو کرتے وقت جو تجزیہ کیا گیا ہے وہ باعث دلچسپی ہو گا۔

کسی موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرنے والے کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی طرف جو بات بھی منسوب کرے اس کے حق میں اسلامی ماخذ سے سند فراہم کرے۔ ہم نے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کی ہے۔ جہاں زیرِ بحث موضوع پر قرآن کریم سے کوئی حکم نکلتا ہے وہاں اس کا حوالہ دیا گیا ہے اور متعلقہ آیات نقل کر دی گئی ہیں۔ احادیث سے استدلال میں حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ حدیث کے مستند مجموعوں کا حوالہ دیا جائے۔ بالعموم حدیثوں کا متن بھی نقل کر دیا گیا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر اس اصول کی پابندی نہیں کی جا سکی ہے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور چند ایسی حدیثیں بھی نقل کی گئی ہیں جو صحاح ستہ یا دوسرے مستند مجموعوں میں نہیں پائی جاتیں۔ ایسے تمام مقامات پر ہم نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ زیرِ بحث نکتہ پر دوسرے ماٰخذ سے بھی سند فراہم کریں، یا اصولی دلائل پیش کریں، تاکہ نسبتاً کم قابلِ اعتماد مجموعۂ حدیث سے نقل کی جانے والی روایت کی حیثیت صرف تائیدی ہو، اس پر ہماری بحث کا مدار نہ ہو۔

اسلام کے فقہی سرمایہ سے بھی حسبِ استطاعت فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حتی الامکان زیرِ بحث مسائل میں اہلِ سنت کے چاروں فقہی مکاتب: حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی — کی رائیں سامنے رکھی گئی ہیں اور حسبِ ضرورت نقل بھی کی گئی ہیں لیکن جس طرح اپنی کم مائگی کے پیشِ نظر ہمارے لیے یہ نہیں ممکن ہو سکا کہ اہلِ سنت کے ان مکاتبِ فقہ کے علاوہ دوسرے مکاتبِ فقہ کی قیمتی رایوں سے استفادہ کر سکیں اسی طرح یہ بھی ممکن نہ ہو سکا کہ ہر مسئلہ پر آئمۂ اربعہ اور ان کے فقہی مکاتب کی رایوں کا احاطہ کیا جا سکے۔ جہاں ایسا ممکن نہیں ہو سکا ہے وہاں ہم نے فقہ حنفی پر بھروسہ کیا ہے اور اکثر اس کی صراحت بھی کر دی ہے۔ بعض مقامات پر قصداً اس بات سے اجتناب کیا گیا ہے کہ اپنے نزدیک قابلِ ترجیح رائے کے علاوہ دوسری رائیں بھی مع دلائل کے نقل کی جائیں اور ان پر مفصل بحث کی جائے۔ البتہ ایسے مقامات پر عموماً ہم نے ایسے فقہی ماٰخذ کی نشان دہی کر دی ہے جن سے مراجعت کر کے بحث کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔

جا بجا اس بات کی ضرورت پڑی ہے کہ اسلامی تاریخ سے کسی اصول کے مطابق عمل کی نظیریں پیش کی جائیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ یہ نظیریں خلفاء راشدین کے دَور کی ہوں۔ جہاں کسی دوسرے دور کا واقعہ نقل کیا گیا ہے وہاں اپنے علم کی حد تک اس بات کا اطمینان کر لیا گیا ہے کہ اسلامی اصولوں کے مطابق وہ نظیر قابلِ استناد ہے۔

جہاں کسی مسئلہ پر ہم نے اپنی ذاتی رائے ظاہر کی ہے وہاں اس بات کی صراحت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر دی گئی ہے اور وہ دلیلیں بھی پیش کر دی گئی ہیں جن کی بنا پر وہ رائے اختیار کی گئی ہے جدید مسائل پر اسلامی ہدایات کے انطباق کے ضمن میں جابجا معاصر اسلامی مفکرین کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، اور ان کے حوالے دیے گئے ہیں۔

حاشیہ پر جن مآخذ کے حوالے دیے گئے ہیں ان کے سنِ طبع، مطبع وغیرہ کی صراحت آخر کتاب میں دی ہوئی "کتابیات" میں یک جا کر دی گئی ہے۔ یہ تفصیلات ہر کتاب کے پہلی بار حوالہ کے ساتھ بھی درج کر دی گئی ہیں۔

اس موضوع پر کام کے سلسلہ میں میں نے اپنے جن اساتذہ اور رفقاء سے استفادہ کیا ہے، ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہاں ان سب کے نام گنانے، اور ان سے کیے ہوئے استفادہ کی نوعیت بیان کرنے کے بجائے میں اللہ تعالیٰ سے ان بزرگوں اور احباب کو اجرِ حسن عطا فرمانے کی دعا کرتا ہوں۔ البتہ چند نام ایسے ہیں جن کا ذکر لازمی ہے۔

میرے محترم استاد مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی نے اس کتاب کے ابتدائی مسودہ کو، جو اب سے چار پانچ برس پہلے تیار ہو گیا تھا، بغور دیکھا ہے اور ترمیم و اضافہ کے سلسلہ میں مجھے تفصیلی مشورے دیے ہیں۔ اس کے بعد بھی میں وقتاً فوقتاً ان سے رہنمائی حاصل کرتا رہا ہوں۔ ڈاکٹر ابو نصر محمد خالدی صاحب نے بھی کتاب کے بیشتر حصہ کا مسودہ ابتداً دیکھا ہے اور آخر کے چند ابواب کا نقریباً آخری شکل میں مطالعہ کیا ہے۔ پہلے بھی اور اب بھی آپ نے بہت توجہ سے مجھے تفصیلی مشورے دیے، متعدد غلطیوں پر متنبہ کیا، اور ترمیمیں تجویز کیں۔ اگرچہ میں نہیں کہہ سکتا کہ موجودہ شکل میں یہ کتاب ان کے معیار کے مطابق ہے۔ اس کتاب میں جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں ان کی ذمہ داری تمام تر میرے سر ہے۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کی رہنمائی کے بغیر شاید یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔

کتاب کا پہلا باب چراغِ راہ۔ کراچی میں، دوسرا باب زندگی۔ رام پور میں، اور گیارھواں باب برہان دہلی اور ترجمان القرآن۔ لاہور میں چھپ چکا ہے۔ یہ حصے اب کافی ترمیم و اضافہ کے بعد اس کتاب میں شامل کیے جا رہے ہیں۔ ان مقالات کی اشاعت کے بعد مجھے متعدد حضرات سے مشورے حاصل کرنے کا موقع ملا ہے جس کے لیے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ان حضرات کا اور ان رسالوں کے مدیر حضرات کا مشکور رہوں۔

آخر میں اس کتاب کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ درخواست کروں گا کہ اگر وہ استدلال میں کوئی کمزوری، رائے قائم کرنے میں غلطی، یا مآخذ اسلامی سے استناد میں کوتاہی پائیں تو مجھے ان نقائص سے آگاہ کریں تاکہ آئندہ ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ خاص طور پر اہلِ علم سے درخواست ہے کہ وہ اس بارے میں بخل سے نہ کام لیں۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ میرے قلم کی کوتاہیوں سے پہنچنے والے نقصان کو بے اثر کردے، اور اسلام کی جو ترجمانی صحیح طور پر کی گئی ہو اس کے لیے دلوں میں قبول کی صلاحیت عطا فرمائے۔ ربّنا تقبّل منا انک انت السمیع العلیم۔

محمد نجات اللہ صدیقی
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ
۳۰ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ، ۲۵ فروری ۱۹۶۳ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلا باب

فکری پس منظر

(۱) نظریۂ کائنات

اسلامی نظام کی ساری تفصیلات کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں اس بنیادی فکر کے قدرتی اور منطقی نتائج کے طور پر اُبھری ہیں جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ ملکیت کا اسلامی تصور بھی اسی فکر کا پرتو ہے۔ زندگی کے بارے میں اِس کلی فکر سے جو مزاج بنتا ہے اسی کا ایک مخصوص پہلو ملکیت کا اسلامی مزاج بھی ہے۔

کائنات :

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ پوری کائنات ایک خالق کی تخلیق کا نتیجہ ہے اور اسی کی تدبیرِ محکم ساری حرکت و ارتقا کا باعث ہے۔ وہی اللہ جو خالق و مدبّر ہے اس پوری کائنات کا حاکم و مالک بھی ہے۔ اس نے یہ کارخانۂ تخلیق چند حکمتوں کے پیشِ نظر قائم کیا ہے۔ یہ کائنات ایک بامقصد وجود ہے۔ اس میں جو کچھ بھی ہے، طرح طرح کی مخلوقات، ازلی حسن و جمال، مسلسل حرکت و ارتقاء، ان سب کا وجود، ان کا نشو و نما اور ان کے بقاء و عدم کے قوانین کائنات کے مقاصد اور تخلیق کی حکمتوں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے تحت اور انہی کی خاطر ہیں :-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ، مَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ . (الدخان: ۳۸-۳۹)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے مابین جو کچھ ہے اسے یونہی بے مقصد نہیں پیدا کر دیا ہے - ہم نے ان کی تخلیق مقصد کے تحت کی ہے - لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کا) علم نہیں رکھتے -

انسان :

دوسری تمام مخلوقات کی طرح انسان بھی اللہ کا مملوک اور محکوم ہے - لیکن یہ مخلوق بعض خصوصیات کی حامل ہے - انسان مقصدِ تخلیق اور حکمتِ وجود سے کچھ خصوصی رشتے رکھتا ہے - اسے نظامِ کائنات میں ایک مخصوص حیثیت عطا کی گئی ہے - اس کا ایک امتیاز یہ ہے کہ وہ کائنات کی دوسری موجودات کی تسخیر اور ان کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی قوت رکھتا ہے -

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ: ۱۳)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے یہ سب اُسی کی طرف سے ہے -

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا -

(بنی اسرائیل : ۷۰)

ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں - ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور انہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی -

اس امتیازی حیثیت کے عین تقاضے کے طور پر انسان کو خدا کے حضور ذمہ دار

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور جوابدہ بھی گردانا گیا ہے۔ ان قوتوں اور صلاحیتوں کے استعمال، کائنات میں جو وسیع مواقع حاصل ہیں ان سے استفادہ کرنے، غرض اپنی ذات اور اس کائنات میں اپنے جملہ تصرفات کی بابت انسان اپنے مالک کے حضور جوابدہ ہے۔

وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی۔ ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی۔ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی۔ (النجم : ۴۰ - ۴۲)

اور، یہ کہ اس کے اعمال کا عنقریب جائزہ لیا جائے گا اور پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور یہ کہ سب کو بالآخر تیرے رب ہی کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔

اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

عن ابن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یزول قدما ابن آدم یوم القیامۃ من عند ربہ حتی یسئل عن خمس: عن عمرہ فی ما افناہ، وعن شبابہ فی ما ابلاہ، وعن مالہ من این اکتسبہ، وفی ما انفقہ وماذا عمل فی ما علم۔

(ترمذی - ابواب صفۃ القیامۃ)

ابن مسعود سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن پانچ امور کی بابت جوابدہی کے بغیر ابن آدم اپنے رب کے سامنے سے نہ ہٹ سکے گا۔ اپنی عمر کی بابت کہ اسے کس کام میں صرف کیا۔ جوانی کی بابت کہ اسے کس فکر میں بڑھاپے تک پہنچایا۔ مال کے بارے میں کہ اسے کہاں سے کمایا اور اسے کس مد میں خرچ کیا۔ اور یہ کہ اسے جو کچھ علم حاصل ہوا اس میں سے کتنے پر عمل کیا۔

یہ جوابدہی تمام تر قوتِ تسخیر ہی کی بنا پر نہیں، نہ اس تک محدود ہے۔ انسان کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ حاکمِ اصلی اور مالکِ حقیقی نے اُسے زمین پر اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے:۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ: ۳۰)

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔

یہ نیابت بھی ایک بامقصد نیابت ہے اور فرائضِ نیابت کی تفصیل الٰہی ضابطۂ ہدایت کے ذریعہ انسان کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ انسان کا اصل امتحان اس میں ہے کہ وہ اس منصب کا حق ادا کرے اور یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسی ضابطۂ ہدایت کا نام اسلام ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ (آلِ عمران: ۱۹)

خدا کے نزدیک معتبر دین صرف اسلام ہے۔

وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ۔ (آلِ عمران: ۸۵)

اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہاں ہو تو اس کا یہ طریقہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

انسان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس طرزِ زندگی سے کامل وفاداری کا ثبوت دے۔ نہ صرف یہ کہ اُخروی فلاح کا واحد ذریعہ یہی ہے بلکہ یہی طرزِ زندگی دُنیوی فلاح کا بھی ضامن ہے۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (طٰہٰ ۱۲۳-۱۲۴)

پھر جو میری ہدایت پر چلے گا وہ نہ گمراہ ہو گا نہ بدحال اور جو میری یاد سے کترائے گا اس کی دُنیوی زندگی تنگ حال ہو گی اور قیامت کے دن ہم اُسے اندھا اُٹھائیں گے۔

خلافت کی گراں بار ذمہ داریاں ادا کرنے اور دینِ اسلام کے مطابق زندگی گذارنے کا موزوں طریقہ یہ ہے کہ لوگ باہمی تعاون سے کام لیں اور ایک ایسی اجتماعیت کی تشکیل عمل میں لائیں جو زندگی کے تمام شعبوں کی تنظیم اسلامی ہدایات کی روشنی میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرے۔ دُنیوی اور اُخروی فلاح کے لیے اس طرح کی اجتماعیت ناگزیر ہے۔

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ، اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (العصر)

زمانہ گواہ ہے کہ انسان خسارہ میں رہتا ہے بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائیں، عمل صالح اختیار کریں، ایک دوسرے کو حق کی تلقین کریں اور ایک دوسرے کو ثابت قدمی کی نصیحت کرتے رہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ...... (آلِ عمران: ۱۰۲)

اور سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط تھامے رہو اور افتراق و اختلاف کا شکار نہ ہو ......

یہ یکجہتی اور تعاون نہ صرف یہ کہ کامیاب زندگی کی لازمی شرط ہے بلکہ یہی اصل فطرت کا تقاضا بھی ہے۔ سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے سبب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ سب ایک ہی رب کے بندے اور ایک ہی مقصد کی طرف بڑھنے والے افراد ہیں۔ ان سب کی فلاح و سعادت کے اصول اور سب کے حقیقی مفادات یکساں ہیں۔ لہٰذا ان کے درمیان فطری رشتہ اخوّت و تعاون اور مواسات و بہی خواہی کا ہے نہ کہ کشمکش اور نزاع کا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ...... (الحجرات: ۱۳)

اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

وحدتِ بنی آدم کے اس تصور کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"عبداللہ ابن دینار بروایت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! اللہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے تم سے جاہلیت کی نخوت دُور کر دی اور آباؤ اجداد پر فخر کرنے کا دستور ختم کر دیا۔ کیونکہ لوگ دو ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ نیک، پرہیزگار اور اللہ کے نزدیک معزز آدمی اور بدکار، بدبخت اور اللہ کے نزدیک ذلیل آدمی تمام انسان آدم کے بیٹے ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے بنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، "اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو"[1]

نیز یہ فرمایا کہ :۔

انا شهيدٌ ان العباد كلّهُمْ اخوة[2]۔

میں گواہ ہوں کہ سارے بندگانِ خدا بھائی بھائی ہیں۔

حیات :

انسان کو کائنات میں اس کا صحیح مقام بتانے کے ساتھ قرآن کریم نے انسانی زندگی کی آزمائشی نوعیت کو بھی اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ زندگی کا جو دَور اس دُنیا میں گذرتا ہے اس کا مقصود انسان کی آزمائش ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس صاحبِ اختیار و ارادہ ہستی میں سے کون لوگ واقعتہً خیر پسند ہیں اور کون لوگ ایسے ہیں جو خیر کو ترک کر کے شر کی طرف بڑھتے ہیں۔ جب زندگی کا یہ دَور ختم ہو جائے گا تو انسان ایک دوسرے دَور میں داخل ہوگا جو دائمی ہے۔ اس دوسرے دَور میں انسان فلاح و سعادت سے بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور دردناک عذاب کا مستحق بھی قرار پا سکتا ہے۔ اس بارے میں فیصلہ کن چیز یہ ہوگی کہ اس نے اپنی زندگی کے پہلے دَور میں خیر پسندانہ کردار ادا کیا یا شر پسندی

---

[1] : ترمذی : کتاب التفسیر۔ سورۂ حجرات۔ باختلافِ الفاظ اسی مفہوم کی حدیثیں ترمذی۔ کتاب المناقب اور ابوداؤد، کتاب الادب میں بھی آئی ہیں۔

[2] ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ۔ باب مایقول الرجل اذا سلّم، عن زید ابن ارقم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا ثبوت دیا۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (الملک: ۲)

وہ ذات جس نے موت وحیات کا سلسلہ اس لیے جاری کیا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون لوگ عمل کے اعتبار سے اچھے ثابت ہوتے ہیں۔

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ۔ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّہٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (الانعام: ۱۶۶)

وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے زیادہ بلند درجے دیے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے بیشک تمہارا رب سزا دینے میں بہت تیز ہے اور بہت درگذر کرنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔

زندگی کی اس آزمائشی نوعیت کا تعلق اصلاً فرد سے ہے۔ کسی گروہ سے وابستگی فرد کو اس کی انفرادی جواب دہی سے نہیں بچا سکتی۔

وَکُلُّھُمْ اٰتِیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَرْدًا (مریم: ۹۵)

ان میں کا ہر شخص قیامت کے دن خدا کے حضور میں اکیلا اور خالی ہاتھ حاضر ہونے والا ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہر فرد پہلی ذمہ داری یہ محسوس کرے کہ اسے خود صحیح طرز زندگی سے ہمیشہ وابستہ رہنا ہے۔

عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ (المائدہ: ۱۰۵) تمہیں اپنی ذات کی فکر کرنی چاہیے۔

کیونکہ اپنے حسنِ عمل یا بدعملی کا نتیجہ خود اسی کو بھگتنا ہوگا۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم: ۳۷-۳۸)

یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائیگا۔ اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ بھی نہیں مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہو۔

مگر زندگی کی آزمائشی نوعیت کے اصلاً فرد سے متعلق ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا تعلق صرف اس کی انفرادی زندگی سے ہے۔ فرد کی اجتماعی زندگی بھی دُنیا و آخرت میں اس کی کامیابی یا ناکامی میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی اس کی انفرادی زندگی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسانی زندگی اپنی عین فطرت کے اعتبار سے انفرادیت اور اجتماعیت دونوں پر مشتمل ہے۔ فرد کی بہت سی ذمہ داریاں اس کی اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو ادا کیے بغیر وہ زندگی کے اس امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ خدا کی رضا حاصل کرنے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اپنی حدِ استطاعت میں فساد کو مٹانے اور خدا کے احکام اس کی زمین پر اس کی خلق پر جاری کرنے کا وہ فرض نہ انجام دے جو خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد کیا گیا ہے۔ پھر کسی فرد کی دُنیوی اور اُخروی فلاح کا انحصار بڑی حد تک اس پر ہوتا ہے کہ وہ جس اجتماع کا ایک جزو ہے وُہ صالح ہے یا فساد زدہ۔ اگر اجتماع فساد زدہ ہو تو فرد کا امتحان زندگی سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا بعث دشوار ہو جاتا ہے۔

انسانی زندگی کی اسی اجتماعی نوعیت کے پیشِ نظر دنیا میں عروج و زوال کا انحصار افراد کے بجائے جماعتوں کے صالح یا غیر صالح ہونے پر رکھا گیا ہے۔ خدا صالح جماعتوں اور خیر پسند قوموں کو دنیوی فلاح سے نوازتا اور بگڑی ہوئی قوموں اور فساد زدہ جماعتوں کو زوال و ہلاکت کے گھاٹ اُتارتا ہے۔ دنیا میں جماعتوں کے ساتھ قوانینِ الٰہی کا یہ سلوک ان جماعتوں کے اپنے کردار پر مبنی ہوتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (الرّعد: ۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔

اجتماعی فساد کا لازمی نتیجہ زوال و ہلاکت ہے۔ جو افراد انفرادی طور پر اس فساد سے بچتے رہے ہوں وہ بھی اس انجام کی لپیٹ میں آئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (الانفال: ۲۶)

اور بچو اس فتنہ سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ محدود رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو

اسلامی تصوّرِ ملکیّت :

کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں اسلام کے اس کلّی فکر سے ملکیّت کے بارے میں ایک خاص تصوّر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

۱۔ کائنات کی کوئی چیز، اس کا ایک حقیر ذرہ بھی اصلاً انسان کی ملک نہیں۔ دوسری اشیا کا کیا ذکر خود اپنی ذات پر بھی انسان کو اس قسم کے مالکانہ حقوق نہیں حاصل ہیں۔ اس کے مالکانہ حقوق جن چیزوں پر بھی ہیں اللہ تعالیٰ ہی کے بخشے ہوئے ہیں۔ اس کی اپنی جان جسم اور قوتیں، زمین، کھیت اور گھر بار، اس کا سارا مال، اس کی تمام املاک اللہ کی طرف سے اسے امانتاً سپرد کی گئی ہیں۔

قُلْ لِمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ......
قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ.... سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (المؤمنون: ۸۴-۸۸)

پوچھیے کہ زمین اور اس کی ساری موجودات کس کی ملک ہیں۔ بتاؤ اگر تمہیں علم ہو۔ وہ جواب دیں گے "سب کچھ اللہ کا ہے"... پوچھیے کہ ساری چیزوں کی حکمرانی کس کے ہاتھ میں ہے..... وہ جواب دیں گے کہ اللہ کے ہاتھ میں۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ
.... اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ
شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۔ (الواقعہ: ۶۳-۷۲)

تم نے اپنی کھیتی پر غور کیا ہے؟ اسے تم اُگاتے ہو یا اس کے اصل اُگانے والے ہم ہیں؟ .... تم نے اس آگ پر غور کیا ہے جسے تم سلگاتے ہو؟ اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہی ہیں؟

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۔ (البقرہ: ۲۸۴)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وَآتُوهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ۔ (النور: ۳۳)

اور ان مکاتب (غلاموں) کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ۔ (الحدید: ۷)

اللہ نے جن اموال پر تم کو (اپنا) نائب بنایا ہے۔ ان میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو۔

یہ آیات واضح طور پر آگاہ کرتی ہیں کہ انسان کے پاس جو مال و املاک ہیں ان کا اصل مالک اللہ ہی ہے۔ انسان محض نائب کے طور پر ان املاک میں تصرّف کا مجاز ہے۔ ظاہر ہے کہ نائب کا تصرّف انہی حدود کے اندر اور انہی مقاصد کے تحت ہونا چاہیئے جو مالکِ حقیقی نے مقرّر کر دیے ہوں۔ نائب کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل مالک نے دیے ہوں اور اسے ان ذمہ داریوں کو بھی ادا کرنا ہو گا جو اللہ تعالیٰ نے حقوقِ ملکیّت کے ساتھ انسانوں پر عائد کی ہوں۔ اس فکر کا تقاضا ہے کہ انسان کے مالکانہ حقوق مطلق نہیں بلکہ محدود اور مقیّد ہوں۔ مالکانہ تصرّف کے باب میں خود کو پوری طرح آزاد سمجھنا گمراہ قوموں اور بگڑے ہوئے افراد کا شعار ہے۔ قرآن متعدد ایسے افراد و قوموں کے کردار سامنے لاتا ہے جو خود کو مختارِ کل سمجھ بیٹھے اور اس طرح اپنے اللہ کو حریف اور مدِّ مقابل بنانے کی جرأت کی۔ اسی طرح کی ایک بھٹکی ہوئی قوم نے حضرت شعیب علیہ السّلام کی دعوت یہ کہہ کر رد کی تھی کہ:

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ (ھود: ۸۷)

انہوں نے کہا: اے شعیب (علیہ السّلام) کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرّف کرنے کا اختیار نہ ہو۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جغفور ملکیت میں اس بے قیدی اور انانیت کا مظاہرہ اپنے مزاج کے اعتبار سے شرک کے مترادف ہے اور استکبار کی اس روش کا انجام جہنم ہے۔ سورۂ قلم میں اصحاب الجنّۃ کا واقعہ اور سورۂ کہف میں اس سے متعلق تمثیل سامنے لاکر قرآن ہمیں اسی حقیقت پر متنبہ کرنا چاہتا ہے۔ قارون کی کہانی سنا کر وہ ہمیں آگاہ کرنا ہے کہ دُنیوی مال و متاع کو الٰہی ہدایت سے بے نیاز ہو کر برتنے کا انجام بہت بُرا ہے۔ ذیل کی آیات اس ذہنیت کی عکّاسی کرتی ہیں جس کو قرآن مٹانا چاہتا ہے اور ساتھ ہی ان آیات میں مطلوبہ ذہنیت کی طرف رہنمائی بھی ہے۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوأُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ ، إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۔ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۔ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي

...... (القصص: ۷۶ - ۷۸)

"قارون موسیٰ (علیہ السلام) ہی کی قوم کا ایک فرد تھا لیکن اس نے ان کے خلاف متکبرانہ روش اختیار کی۔ ہم نے اسے اتنے خزانے عطا کیے تھے کہ اس کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کے لیے بھی بھاری پڑتی تھیں (اس کے استکبار کا یہ عالم تھا کہ) جب اس کی قوم نے اس سے کہا کہ "اِترا مت، اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ اور جو کچھ اللہ نے تجھے دے رکھا ہے اس کے ذریعہ آخرت (میں بھلائی) طلب کر اور (اس دنیا میں سے اپنا حصہ نہ بھول جا۔ جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے اسی طرح تو بھی (دوسرے انسانوں کے ساتھ) بھلائی کر اور زمین میں فسادی بن کر نہ رہ۔ اللہ فسادیوں کو پسند نہیں فرماتا" تو وہ بولا کہ مجھے جو کچھ ملا ہے اپنے ذاتی علم و لیاقت کی بنا پر ہی ملا ہے ......

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ ملکیت کے بے محدود اختیارات بھی نہ تو بے مقصد ہو سکتے ہیں نہ بجائے خود ملکیت کوئی مقصد بن سکتی ہے۔ جب کائنات میں تمام موجودات کی وہی حیثیت برحق اور مطلوب ہے جو مقصدِ تخلیق سے ہم آہنگ ہو اور جب انسانی زندگی خود ایک مقصد رکھتی ہے تو انسانی ملکیت کے بجائے خود مقصد بن جانے یا بے مقصد ہونے کے کیا معنی ؟ مال و املاک کی صحیح حیثیت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ انھیں مقصدِ زندگی کا ذریعہ سمجھا جائے۔ انسان کو منصبِ خلافت کے پیشِ نظر، اور دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی حاصل کرنے کے لیے جو کردار ادا کرنا ہے ملکیت کو اسی کردار کے حصول میں مدد کرنی چاہیے۔ اسی مقصد کی خاطر انسان کو یہ حق عطا کیا گیا ہے، اور یہی قرآن و سنت کی نظر میں اس کی صحیح حیثیت ہے۔ اسی حقیقت کی طرف مندرجہ ذیل آیات میں بھی اشارہ ملتا ہے:

اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا ۔ (النساء : ۵)

تمہارے اموال جن کو اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِى الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (اعراف: ۱۰)

ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے یہاں سامانِ زیست فراہم کیا۔

كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۔ (سبا : ۱۵)

اپنے رب کی دی ہوئی روزی کھاؤ اور اس کا شکر بجا لاؤ۔

وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (توبہ : ۴۱)

اپنی جان و مال کے ذریعہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے بھی مال و املاک کی اسی حیثیت پر زور دیا ہے:۔

عن ابی واقد اللیثی رضی اللہ عنہ قال : کنّا نأتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا انزل علیہ فیحدثنا فقال لنا ذات یوم إنّ اللہ عزّ وجل قال : انّا انزلنا المال لاقام الصلوٰۃ وایتاء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الزکوٰۃ، ولو کان لابن آدم وادٍ لاحبّ ان یکون لہٗ ثانٍ ولو کان لہ وادیان لاحبّ ان یکون الیھما ثالث ولا یملاء جوف ابن آدم الا من تراب، ثم یتوب اللّٰہ علی من تاب[1]

ابو واقد اللیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو ہم آپ کے پاس حاضر ہوتے تھے اور آپ ہمیں سناتے تھے۔ ایک دن آپ نے ہم سے فرمایا کہ اللہ عزّوجل نے فرمایا ہے: "ہم نے مال اس لیے دیا ہے کہ نماز قائم کی جائے اور زکوٰۃ ادا کی جائے ابنِ آدم کی (حرص کا یہ عالم ہے کہ اس) کے پاس اگر ایک وادی (یعنی چراگاہ) ہو تو وہ چاہے گا کہ ایک اور مل جائے اور اگر اس کے پاس دو وادیاں ہوں تو وہ چاہے گا کہ ان کے ساتھ ایک اور بھی ہو۔ ابنِ آدم کا پیٹ صرف مٹی سے بھر سکتا ہے۔ پھر جو توبہ کریگا اور باز آجائیگا اللہ اسے معاف کر دے گا"

نیز آپ نے فرمایا کہ: "نعم العون علی تقوی اللّٰہ المال[2]

اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے میں مال بڑا اچھا مددگار ہے۔

یہی بات ایک دوسری حدیث میں بھی کہی گئی ہے:

"ہم سے موسیٰ بن علی بن رباح نے حدیث بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ عمرو بن العاص نے کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا بھیجا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے حکم دیا کہ میں اپنے کپڑے اور ہتھیار لے کر آؤں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ وضو فرما رہے تھے۔ آپ نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا پھر نگاہ نیچی کر لی اور فرمایا: "عمرو! میرا ارادہ ہے کہ

---

[1]: مسندِ امام احمد۔ سند ابی واقد اللیثی (جلد ۵۔ صفحہ ۲۱۹) مطبع میمنیہ۔ مصر ۱۳۱۳ھ

[2]: علی المتقی بن حسام الدین برہان پوری، عن جابرؓ: کنز العمال۔ جلد ۲۔ صفحہ ۵۰۔ نمبر ۲۰۱۵ بحوالہ مسند دیلمی۔ طبع دائرۃ المعارف۔ حیدر آباد۔ ۱۳۱۲ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تجھے ایک فوج کا کمانڈر بنا کر بھیجوں تا کہ اللہ تجھے مالِ غنیمت دلائے اور محفوظ بھی رکھے۔ میری خواہش ہے کہ تجھے مال میسر آ جائے" عمرو کہتے ہیں کہ اس پر میں نے یہ کہا کہ اے اللہ کے رسول میں مال کی طلب میں اسلام نہیں لے آیا ہوں بلکہ میری غرض صرف اسلام ہے اور یہ کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ رہوں۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ اے عمرو! صالح آدمی کے لیے صالح مال کتنی عمدہ چیز ہے[۱]"

مال و املاک کی صحیح حیثیت یہی ہے کہ وہ صالح طریقہ سے زندگی بسر کرنے کا ذریعہ ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور طویل حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کے بارے میں فرمایا کہ:

فمن اخذه بحقه و وضعه فی حقه فنعم المعونة هو۔[۲]

پس جو اس کو جائز طریقہ سے کمائے اور حق کے مطابق خرچ کرے تو (اس کے لیے) یہ بہت اچھا مددگار ہے۔

۳۔ ملکیت کے یہ مقاصد اور وحدتِ بنی آدم کا اسلامی تصور تقاضا کرتا ہے کہ خدا نے انسان کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہ چند افراد یا کسی طبقہ کی میراث بن کر نہ رہ جائیں بلکہ ان سے تمام انسانوں کو مستفید ہونے کا موقع ملے۔ بنی آدم ایک خاندان ہیں اور کائنات کی جن اشیاء اور قوتوں کو اس پورے خاندان کی تحویل میں دیا گیا ہے ان سے استفادہ میں سارے انسانوں کو ایک خاندان کے افراد کی طرح کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ملکیت کے باب میں ایک انسان اور دوسرے انسان کا باہمی تعلق صلہ رحمی، مواسات اور ایثار و تعاون پر مبنی ہونا چاہیے نہ کہ خود غرضی اور کشمکش و نزاع پر۔ قرآن مال و املاک کی کسی ایسی تقسیم کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں جو انسانوں کے ایک طبقہ کو مقصدِ زندگی کے

---

[۱]: حاکم: مستدرک، جلد ۲ صفحہ ۲۔ حاکم نے لکھا ہے کہ یہ حدیث مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ طبع حیدرآباد، ۱۳۴۰ھ۔ نیز بخاری: الادب المفرد صفحہ ۴۷-۴۸ مطبع تازیہ مصر ۱۳۴۹ھ۔

[۲]: مسلم: کتاب الزکوٰۃ۔ باب تخوف ما یخرج من زھرۃ الدنیا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصول کے ناگزیر ذرائع سے محروم کر دے یا بیشتر وسائل حیات کو چند افراد، کسی ایک گروہ یا طبقہ کے ہاتھوں میں مرکز کر دے۔ ملکیت قیامِ حیات اور تزکیہ و ترقی کا ذریعہ ہے اور خدا کی مرضی یہی ہے کہ یہ ذریعہ ہر ایک کو حاصل ہو اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ یہ اسلامی تصورِ ملکیت کا تیسرا پہلو ہے جو خدا کی ساری مخلوق کو ایک بڑا خاندان سمجھنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ[1]

ساری مخلوق خدا کی عیال ہیں اور اللہ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وُہ ہے جو اس کی عیال کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔

الخلق کلھم عیال اللہ فاحبھم الی اللہ انفعھم لعیالہ[2]

ساری خلقِ خدا اللہ کی عیال ہیں اور اللہ کو ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ ہے جو اس کی عیال کے لیے سب سے زیادہ مفید ہو۔

۴۔ آخری بات جو اسلامی نظریۂ حیات سے واضح ہوتی ہے وہ انسان کے مالکانہ حقوق کی آزمائشی نوعیت ہے۔ ملکیت کی آزمائشی نوعیت کا تقاضا ہے کہ افراد کو اس میں اپنی پسند و اختیار کے مطابق تصرّف کے حقوق حاصل رہنے چاہئیں۔ فرد کو ایسے قوانین و ضوابط کے شکنجہ میں کس دینا صحیح نہیں کہ کسی اختیار اور تصرّف کی گنجائش ہی نہ باقی رہے اور حقوقِ ملکیت کی آزمائشی نوعیت عملاً معطل ہو کر رہ جائے لیکن یہ حقیقت اپنا دوسرا پہلو بھی رکھتی ہے۔ زندگی کا اجتماعی مزاج اور نوعِ انسانی کی آزمائش کا اجتماعی پہلو یہ چاہتا ہے کہ کسی فرد کو ملکیت کے باب میں اتنی آزادی نہ میسر ہو کہ اس سے دوسرے افراد کی آزادی مجروح ہو یا وہ اس کے غلط استعمال سے سماج میں فساد پیدا کرتے اور اس طرح اسے زوال و ہلاکت کے گھاٹ اتارنے کا باعث بن جائے۔ فرد کے پسند و اختیار کو ان حدود کے اندر ہی رہنا ہوگا جو اجتماعی خیر و صلاح کے پیشِ نظر اس پر عائد کیے جائیں۔ اوپر ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ انفرادی آزمائش میں پورا اترنے کی محفوظ راہ یہی ہے

---

[1] : مشکوٰۃ باب الشفقۃ و الرحمۃ علی الخلق۔

[2] : طبرانی کبیر عن ابن مسعودؓ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ اجتماعی طور پر اس کا اہتمام کیا جائے۔ لہٰذا ملکیت کے باب میں ایسے اجتماعی تحفظات ضروری ہیں جو پورے معاشرہ کے اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے اور ہر فرد کے لیے کامیابی کی راہ ہموار کرنے کا ذریعہ بن سکیں۔

(ب) نظریۂ اجتماع

کائنات میں انسان کے مقام اور اس کے مالکانہ حقوق کی صحیح نوعیت پر اُوپر گفتگو کی جا چکی ہے۔ لیکن انسانی زندگی میں اس مسئلہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے کہ فرد و اجتماع کے درمیان حقوقِ ملکیت کی تقسیم کس طرح عمل میں لائی جائے۔ مالکانہ حقوق کس حد تک افراد کو حاصل ہونے چاہئیں اور کس حد تک پورے معاشرہ یا اس کے نمائندہ اداروں کو۔ خاص طور پر ریاست کے حقِ ملکیت اور افراد کی املاک کے سلسلہ میں ریاست کے اختیارات کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ انفرادیت پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام نے اس مسئلہ کا جو حل پیش کیا تھا اس کا غیر موزوں ہونا گذشتہ دو صدیوں کے تجربہ سے بخوبی واضح ہو چکا ہے۔ اس کے ردِ عمل کے طور پر ایک دوسرا حل اشتراکیت اور اشتمالیت نے پیش کیا، مگر یہ ایک دوسری انتہا تھی جس سے خیر کے بجائے شر ہی برآمد ہو سکتا تھا۔ اگر اسلام انسان کو اس سلسلہ میں کسی معتدل اور متوازن روش کی طرف لے جا سکتا ہے تو یہ اس کی بہت بڑی کامیابی قرار پائے گی۔ آئندہ صفحات میں ہم اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کریں گے لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ فرد و اجتماع کے اضافی مقامات کا اسلامی تصور کیا ہے، اور اسلام ریاست کو اجتماع اور افراد کی نسبت سے کیا حیثیت عطا کرتا ہے۔

فرد:

اسلامی نظریۂ حیات پر گفتگو کرتے وقت ہم فرد کی اہمیت پر کافی زور دے چکے ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہر فرد ایک ذمہ دار ہستی ہے۔ اسے دنیا کے امتحان سے گذرنا اور آخرت میں خدا کے حضور جوابدہ ہونا ہے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد کو کچھ حقوق و اختیارات حاصل ہوں جن سے کام لیتے ہوئے وہ اپنی دنیا اور عاقبت دونوں کو سنوار سکے۔ ہر فرد کو وہ وسائل حاصل ہونے چاہئیں جو زندگی کو قائم رکھنے، ترقی دینے اور اس کا تزکیہ کرنے میں اس کے مددگار بن سکیں۔ اسی طرح ہر فرد اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کی تشکیل، اجتماعی اداروں کے قیام اور ان کی صالح تعمیر جیسے اہم امور میں دخل دے اور ایک ایسی اجتماعیت برپا کرنے کی کوشش کرے جو اسے اس کے مقصدِ زندگی کے حصول میں مدد دے سکے۔ ان امور میں سارے افراد کی حیثیت مساوی ہے۔ مرد اور عورت سب ان ابتدائی سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق میں یکساں شریک ہیں۔ اجتماع اور اس کے نمائندہ اداروں کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہر فرد کو اس کا یہ مقام حاصل ہو۔

اجتماع:

انسانی زندگی اپنی عین فطرت کے اعتبار سے اجتماعیت پسند ہے۔ افراد کے جملہ مادّی اور رُوحانی مفادات اجتماعی اہتمام کے طالب ہیں۔ یہ اجتماعیت صرف مفادات کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ افراد کے جملہ مقاصد کی تکمیل کی خاطر وجود میں آتی ہے۔ مادّی حالات کی بہتری ہو یا معاشرتی فضا کی درستی، سیاسی نظم و استحکام ہو یا رُوحانی تربیت و تزکیہ، بغیر اجتماعی کوششوں کے ان مقاصد کو پوری طرح حاصل کرنا ممکن نہیں۔ زندگی کی صحیح تعمیر و ترقی کے لیے ضروری ہے کہ افراد میں اس کی لگن پائی جائے اور اجتماع ان تعمیری کوششوں کی ذمہ داری لے، کیونکہ اگر سماج غلط رُخ پر جا رہا ہو تو اس کے انجام سے ہر فرد کو دوچار ہونا پڑے گا، خواہ اس کا ذاتی رجحان کچھ بھی رہا ہو۔ زندگی کی اس اجتماعی نوعیت کو نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک تمثیل کے ذریعہ اچھی طرح واضح کر دیا ہے:

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: مثل القائم علیٰ حدود اللہ والواقع فیہا کمثل قومٍ استھموا علیٰ سفینۃٍ فاصاب بعضھم اعلاھا وبعضھم اسفلھا فکان الذی فی اسفلھا اذا استقوا من الماء مرّوا علیٰ من فوقھم فقالوا لو انا خرقنا فی نصیبنا خرقًا ولم نوذِ مَن فوقنا، فان یترکوھم وما ارادوا ھلکوا جمیعًا وان اخذوا علیٰ ایدیھم نجوا ونجوا جمیعًا[۵]

روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزّ وجل کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کرنے والوں اور ان سے تجاوز کرنے والوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کچھ لوگ ایک کشتی کے اوپر اور نیچے کے حصّوں پر قرعہ ڈالیں۔ ایک گروہ کو اوپر کا حصّہ ملے اور دوسرے گروہ کو نیچے کا حصّہ۔ نیچے والوں کو جب پانی کی ضرورت پیش آتی ہو تو اُوپر جانا پڑتا ہو۔ یہ دیکھ کر وہ یہ اسکیم بنائیں کہ اگر ہم اپنے حصّہ میں کشتی کے پیندے میں ایک سوراخ کرلیں تو اوپر والوں کو زحمت دینے سے بچ جائیں گے۔ نیچے والوں کی اسکیم پر اگر اوپر والے خاموش رہ جائیں اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں ان کو کر گذرنے دیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سب ایک ہی ساتھ ہلاک ہوں گے۔ اور اگر اوپر والے نیچے والوں کو روک دیں گے تو خود بھی محفوظ رہیں گے اور سب کو تباہی سے بچالیں گے۔

گویا زندگی کی یہ کشتی چند افراد کی حماقت سے بھی ڈوب سکتی ہے، اور جب کشتی ڈوبے گی تو پوری قوم ڈوبے گی۔ لہٰذا اجتماع کا فرض ہے کہ اپنے افراد پر نگاہ رکھے۔ ایسا کرنے میں خود اس کی بھلائی مضمر ہے اور ان غلط کار افراد کی بھی۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا رہے کہ آزمائش کی انفرادی نوعیت کا مطلب یہ ہے کہ افراد کو سماج دشمن

---

[۵] بخاری: کتاب الشرکۃ - باب ھل یقرع فی القسمۃ والاستھام فیہ -

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرگرمیوں کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔ اسلام اس سادہ لوحی سے بری ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ اجتماعی مفاد کی خاطر غلط کار افراد کو ایسی حرکتوں سے باز رکھا جائے خواہ اس کے لیے سیاسی طاقت اور جبر سے کام لینا پڑے۔ اگر اجتماع اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کرے گا تو اس کا وبال پورے اجتماع کو بھگتنا پڑے گا۔ اس حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بار عوام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

(انا سمعنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الناس اذا رأوا الظالم فلم یأخذوا علی یدیه اوشك ان یعمهم الله بعقاب[1]۔

اور ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو (ظلم کرتے) دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑ لیں تو قریب ہے کہ اللہ ان سب کو اپنے عذاب میں گھیر لے۔

ایک دوسرے راوی (ہشیم) کی روایت ہے کہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ:

(انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من قوم یعمل فیهم بالمعاصی ثم یقدرون علی ان یغیروا ثم لا یغیروا الا یوشك ان یعمهم الله منه بعقاب[2]۔

اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس قوم میں برے کام کیے جا رہے ہوں اور اس قوم کے لوگ اس پر قادر ہوں کہ صورتِ حال کی اصلاح کریں، لیکن وہ ایسا نہ کریں، اس کو جلد ہی اللہ ایسی سزا دے گا جس کا اثر (بلا استثناء) سب پر پڑے گا۔

یہی بات ذیل کی حدیث میں بھی بیان کی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1]: ابوداؤد: کتاب الملاحم باب الامر والنہی۔ صفحہ ۲۷۵، جلد ۳، نیز ترمذی و نسائی۔

[2]: ابوداؤد: کتاب الملاحم، باب الامر والنہی۔ صفحہ ۲۷۵، جلد ۳، نیز ترمذی و نسائی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرمایا کہ:

ان اللہ تعالیٰ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظہرانیہم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروا فاذا فعلوا ذالک عذب اللہ العامۃ والخاصۃ۔[1]

اللہ پورے اجتماع کو چند مخصوص افراد کے طرزِ عمل پر اس وقت تک سزا نہیں دیتا جب تک ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے درمیان برائی دیکھیں اور اس کے مٹانے پر قادر ہونے کے باوجود اسے مٹانے کی کوشش نہ کریں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تو اللہ ان مخصوص (مجرم) افراد اور عوام سب کو عذاب کے دائرہ میں لے لیتا ہے۔

اگر سماج میں بُرے عناصر کی کثرت ہو اور برائی چھائی ہُوئی ہو۔ تو کچھ اچھے عناصر ہونے کے باوجود وہ ہلاکت سے نہ بچ سکے گا۔

عن مالک انہ بلغہ ان ام سلمۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت: یا رسول اللہ أنہلک وفینا الصالحون۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: نعم، اذا کثر الخبث۔[2]

امام مالک سے مروی ہے کہ انہیں یہ معلوم ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا" اے اللہ کے رسول کیا ہمارے درمیان صالح لوگ ہوں تو بھی ہم ہلاک ہو سکتے ہیں ؟" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" ہاں، جب بُرائی بہت زیادہ ہو جائے۔"

صالح افراد اپنی انفرادی صالحیت کے باوجود اپنے معاشرہ کے بُرے انجام سے نہیں بچ سکتے۔ دنیا میں ہلاکت اور بربادی سے بچنے کے لیے انفرادی صالحیت کافی نہیں، یہ بھی ضروری ہے کہ پورے معاشرہ کو صالح بنا کر رکھا جائے۔ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اچھے لوگ بُرے لوگوں کو بُرائی سے روکیں، خواہ ایسا کرنے میں انہیں

---

[1] : رواہ احمد۔ مشکوٰۃ کتاب الآداب۔ باب الامر بالمعروف۔ الفصل الثانی۔

[2] : مؤطا امام مالک۔ کتاب الرفاق باب عذاب العامۃ بعمل الخاصۃ اذا قصروا فی النھی عن المنکر۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قوت بھی استعمال کرنی پڑے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو اچھا بنانے کی کوشش کی جائے اور اچھائی کی مدد کی جائے۔

اسلام ایک ایسی اجتماعیت چاہتا ہے جس میں ہر فرد دوسرے فرد کا مددگار و بہی خواہ ہو، اور ہر فرد پورے اجتماع کی فلاح و بہبود کا خواہاں ہو۔

اَلْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ۔ (توبہ : ۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہوتے ہیں۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (المائدہ : ۲)

بھلائی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور ظلم و زیادتی اور گناہ میں تعاون نہ کرو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

کونوا عباد اللہ اخوانا[۱]

اللہ کے بندے اور ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہو۔

اور یہ کہ :

ان کل مسلم اخ للمسلم وان المسلمین اخوۃ[۲]

ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

سچی اور صالح اجتماعیت اسی وقت وجود میں آتی ہے جب ہر فرد دوسرے افراد کا، پورے اجتماع کا اور اس طرزِ زندگی کا وفادار و بہی خواہ بن کر زندگی گذارے جس میں فرد و اجتماع دونوں کی فلاح مضمر ہے۔

---

۱ : مسلم : کتاب البر والصلۃ والآداب۔ باب النھی عن التحاسد والتباغض والتدابر۔ متفق علیہ

۲ : ابو محمد عبدالملک بن ہشام۔ سیرۃ، جلد ۳ صفحہ ۷۶ (خطبہ حجۃ الوداع) طبع بولاق ۱۲۹۵ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عن تمیم الداری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ان الدین النصیحۃ، ان الدین النصیحۃ، ان الدین النصیحۃ" قالوا لمن یا رسول اللہ، قال "للہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المؤمنین وعامتہم"۔[۱]

تمیم داری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دین خیر خواہی کا نام ہے، دین خیر خواہی کا نام ہے۔ دین خیر خواہی کا نام ہے"۔ لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ کس کی خیر خواہی؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، اور مومنین کے ائمہ (یعنی اصحابِ امر) کی اور عام مومنین کی۔

تمیم داری سے مروی ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ "اللہ کی، اس کے رسول کی، اس کی کتاب کی، اصحاب امر کی، اور جماعت المسلمین کی"۔[۲]

اس اجتماعیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اجتماعی امور باہمی مشورہ کے ذریعہ طے پایا کریں۔

وامرھم شوریٰ بینھم۔

(شوریٰ: ۳۸)

اور مسلمانوں کے امور باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔

ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ وہ اس اجتماعیت کے ساتھ پوری طرح وابستہ رہے۔ کسی کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ معاشرہ سے کٹ کر خود کو کسی گوشہ میں محصور کرے اور اپنی انفرادیت سنبھالے ہوئے، بزعم خود، روحانی ترقی کے مدارج طے کرتا

---

[۱]: ابوداؤد: کتاب الادب، باب النصیحۃ، نیز مسلم اور ترمذی۔ باختلاف الفاظ

[۲]: ابوعبید القاسم بن سلام: کتاب الاموال۔ صفحہ ۳۔ طبع قاہرہ۔ ۱۳۵۳ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے، یا اجتماعی فلاح و بہبود سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے مادی مفادات کی ترویج و ترقی چاہے۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال من خرج من الطاعۃ وفارق الجماعۃ فمات مات میتۃ جاھلیۃ۔[1]

ابو ہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جس نے اطاعت ترک کر دی اور جماعت سے کٹ گیا اور (ایسی حالت میں) مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

فانہ من فارق الجماعۃ شبرًا فمات فمیتۃ جاھلیۃ۔[2]

کیونکہ جس نے جماعت سے بالشت بھر بھی علیحدگی اختیار کی اور مر گیا تو یہ جاہلیت کی موت ہوئی۔

اجتماعیت انسانی زندگی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ لیکن اسلام کے نزدیک اجتماعیت اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اس کے ذریعہ ایک بلند تر مقصد کا حصول چاہتا ہے۔ یہ مقصد اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کا قیام ہے جو انسان کے منصب خلافت کا براہ راست تقاضا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اجتماعی جدّوجہد ضروری ہے، افراد علیحدہ علیحدہ رہ کر اسے حاصل نہیں کر سکتے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ط (شوریٰ : ۱۳)

تمہارے لیے بھی دین میں وہی بات لازمی قرار دی گئی ہے جس کی وصیت نوح

---

[1] - مسلم - کتاب الامارۃ - باب الامر بلزوم الجماعۃ عند ظہور الفتن۔

[2] " " " " " " "

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو کی گئی تھی، جس کی وحی تم کو کی جا چکی ہے، اور جو ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بتائی گئی تھی۔ یعنی یہ کہ دین قائم کرو۔ اور اس معاملہ میں الگ الگ راہیں نہ اختیار کرو۔

قرآن مسلمانوں کو ایک ایسی جماعت دیکھنا چاہتا ہے جو دنیا میں خیر و صلاح کی طرف دعوت دینے، صالح نظام قائم کرنے اور انسانی زندگی سے شر اور فساد کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔

(البقرہ : ۱۴۳)

اور اس طور پر ہم نے تم کو بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن کر رہو۔

كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ۔ (المائدہ : ۸)

اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے اور عدل و راستی پر گواہ بن کر رہو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران : ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے برپا کیا گیا ہے، بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

فرد و اجتماع :

اسلام کے نزدیک اجتماع ایک بامقصد ہیئت ہے۔ اس کے مقاصد اور مزاج کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ فرد و اجتماع کے مابین کسی ٹکراؤ کی گنجائش نہیں۔ اسلامی اجتماعیت افراد ہی کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ یہ اجتماعیت انسانی افراد کے فطری رجحانات و دواعی کے تحت ابھرتی ہے۔ اجتماع افراد کے جذبۂ اخوت و تعاون کا عملی مظہر ہے، افراد اس کے ذریعہ اپنے مشترک مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اجتماع فرد کے لیے ایک رحمت ہے، کہ یہ ہر فرد کے تمام مادی اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رُوحانی مفادات کا نگران و محافظ اور ان کی ترقی و تزکیہ کا ذریعہ ہے۔ اسی کے بطن سے ریاست اور دوسرے اجتماعی ادارے جنم لیتے ہیں جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تعمیر و تزکیہ کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

اسی طرح افراد ہی اجتماع کا اصل سرمایہ ہیں۔ انہی کے سدھار پر اجتماع کی صالحیت کا انحصار ہے۔ انہی کی ترقی اجتماع کی ترقی ہے اور انہی کی کامیابی اجتماع کا مقصود ہے۔ اجتماع کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہر فرد کی دست گیری کرے، اور ان کے درمیان فیصلوں میں عدل و قسط پر قائم رہے، ان کے باہمی تعلقات کو ہدایتِ الٰہی کی روشنی میں منظم کرے اور انھیں اسلامی طرزِ زندگی پر کاربند ہونے اور ہر طرح کی کج روی سے دُور رہنے میں مدد دے۔ ان تمام امور میں نوعِ انسانی کے تمام افراد کی حیثیت یکساں ہے۔ کسی کا حسب نسب یا سیاسی مقام یا اس کی مالی حالت اس کی بنیادی انسانی حیثیت کو ذرا بھی متاثر نہیں کرتی۔ کیونکہ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

ان اللہ لیس بینہ و بین احد نسب الا بطاعۃ فالناس شریفھم و ضیعھم فی دین اللہ سواء اللہ ربھم و ھم عبادہ[1]

اللہ کا کسی سے بھی کوئی رشتہ نہیں، اس سے تعلق صرف اطاعت کر کے قائم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا سارے انسان، معزز بھی اور ادنیٰ بھی، اللہ کے دین میں باہم مساوی ہیں۔ اللہ ان سب کا رب ہے اور وہ سب اس کے بندے ہیں۔

اجتماعی ادارے:

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، اجتماع کا یہ عمل مختلف اجتماعی اداروں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ افراد کا جذبۂ تعاون اور اجتماع کا احساسِ ذمّہ داری مختلف اداروں کا قیام عمل میں لاتا ہے جو کسی نہ کسی نوع سے انسانی زندگی کی تعمیر و تزکیہ میں حصّہ لیتے ہیں۔ یہاں ان تمام حیاتیاتی، نفسیاتی، اخلاقی اور روحانی عوامل سے بحث نہیں جو ان اداروں

[1] : ابن کثیر: البدایہ والنہایہ۔ جلد ۷، صفحہ ۳۵۔ مطبع السعادۃ۔ قاہرہ، ۱۹۳۹ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں۔ ان اداروں کی کوئی جامع فہرست بھی نہیں تیار کی جا سکتی جو معاشرت، معیشت، سیاست اور اخلاق کے میدان میں سرگرم عمل رہتے ہیں خاندان، گاؤں، قصبہ اور شہر، ملک، قوم، کاروباری انجمنیں، سیاسی جماعتیں اور مذہبی اور تمدنی ادارے اجتماع کی ہمہ جہتی عمل کے مختلف مظاہر ہیں۔ ہر ادارہ انسان کے فطری رجحانات و دواعی کے تحت جنم لیتا ہے اور کسی نہ کسی مفید مقصد کے حصول میں نمایاں حصہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ افراد کا ارادہ، اور اجتماعی ضرورت کا احساس مختلف اداروں کو مختلف درجوں میں وہ اخلاقی یا قانونی قوت عطا کرتا ہے جو ان کے عمل کے لیے ضروری ہیں۔ دینِ فطرت ان اداروں کا ایک مقام تسلیم کرتا ہے۔ ہر وہ ادارہ جو فطری اصولوں پر، اللہ کی مقررہ کردہ حدود کے اندر، انسانی زندگی کے حقیقی مفادات کے تحفظ اور اس کے اصل مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہو اسلام کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ اسی لیے اس نے خاندان کے ادارہ کو شرعی حیثیت دی ہے، انسانی بستیوں کے حقوق و فرائض متعین کیے ہیں۔ کاروباری تعاون کو سراہا ہے، اور صالح سیاسی اغراض کے تحت تنظیم پر ابھارا ہے۔

ریاست:

لیکن اجتماع اپنے بہت سے اعمال اس وقت تک نہیں انجام دے سکتا جب تک وہ با اختیار، منظم اور صاحب قوت و اقتدار نہ ہو۔ اجتماع کے وظائف و اعمال اس سے آمر و ناہی بننے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ افراد کے درمیان عدل قائم رکھنے اور زندگی کے بنیادی مفادات کے تحفظ کا عمل اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب اجتماع کو وسیع اختیارات حاصل ہوں۔ اپنے اوامر و نواہی کو نافذ کرنے کے لیے اجتماع، طاقت رکھنے، اور بوقتِ ضرورت اس طاقت کو استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ اس طور پر ایک ایسے اجتماعی ادارے کی ضرورت سامنے آتی ہے جس کی قوت سب پر بالا ہو اور جو وہ تمام وسائل و ذرائع رکھتا ہو جو ناگزیر اجتماعی ذمہ داریوں مثلاً دفاع، قیام عدل

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امن و امان قائم رکھنے اور افراد و معاشرہ کی فلاح و بہبود کے اہتمام کے سبب ضروری ہیں۔ اسی انسانی ضرورت نے ریاست کے ادارہ کو جنم دیا ہے۔ یہ ادارہ نظم، اقتدار، قوّت اور مرکزیت کی امتیازی صفات کا حامل ہے جو کسی دوسرے اجتماعی ادارہ کو اس درجہ میسّر نہیں۔

اسلامی شعور اور زندگی کا اسلامی مزاج ریاست کی ضرورت اور اہمیت کو اور زیادہ مستحکم کر دیتا ہے۔ اسلامی ریاست مسلمانوں کے مشترکہ مقاصد کی ضامن اور ان کے جذبۂ اخوّت و تعاون کی اعلیٰ ترین مظہر بن کر اُبھرتی ہے۔ اسلام نے اجتماع کو قیامِ دین، دعوت الی الخیر، شہادت علی الناس اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جو ذمّہ داریاں سونپی ہیں، ریاست ان کی اوّلین ذمّہ دار قرار پاتی ہے۔ افراد کا اسلامی شعور اس مرکزی ادارہ سے اپنے مقصدِ زندگی کے حصول میں ہر ممکن مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ ریاست دوسرے اجتماعی اداروں کی نگرانی کرتی ہے۔ فرد کی جان و مال، عزّت و آبرو، عقل، فہم، اور دین و اخلاق کی محافظ بن کر رہتی ہے۔ افراد کے تزکیہ اور زندگی کی مادّی تعمیر کی خاطر مختلف خدمات انجام دے کر ریاست افراد کو ان کے مقصدِ زندگی کے حصول میں مدد دیتی ہے۔

اسلامی ریاست کی اس فطری حیثیت کے پہلو بہ پہلو ایک اور زاویۂ نگاہ سے بھی اس کی حیثیت پر غور کیجیے۔ انسانی زندگی اپنی فلاح کے لیے ہدایتِ الٰہی کی محتاج ہے۔ کائنات میں انسانی زندگی کا مقام، اور دُنیوی زندگی کے مزرعِ آخرت ہونے کی حیثیت انسان سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وُہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق یعنی اسکی ہدایات کے تحت بسر کرے۔ ہر انسان اللہ کی عبادت کا مکلّف ہے۔ اور اس کی فطرت فرامینِ الٰہی کی بجا آوری پر مامور ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا تاکہ اس کے پیغام بر انسانوں کو اس کی ہدایات سے آگاہ کریں۔ پھر ان رسولوں کا فرض قرار پایا کہ انسانوں کو ان ہدایات کی تعمیل پر آمادہ کریں۔ سلسلہ رسالت کی آخری کڑی کے طور پر محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن کریم لے کر تشریف لائے۔ آپ نے اپنے قول و عمل سے کتابِ الٰہی کی شرح کرتے ہوئے اللہ کی ہدایات کو انسانوں تک بتمام و کمال پہنچا دیا۔ آپ کا ہدایتِ الٰہی کے ساتھ تشریف لانا انسانوں کو اس بات کا پیغام تھا کہ وہ آپ کی اطاعت کریں اور اس ہدایت کے مطابق آپ کے تحت ایک منظّم اجتماعی زندگی بسر کریں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء: ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

هُوَ الَّذِيْٓ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ (فتح: ۲۸)

وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق لے کر بھیجا تاکہ اس دین کو زندگی کے دوسرے طریقوں پر غالب کر دے۔

چنانچہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد نے اپنے فرض کو پہچانا اور اللہ کی اس زمین کے ایک مخصوص خطّہ کے بسنے والے برضا و رغبت آپ کے تحت منظّم ہو کر اسلامی زندگی بسر کرنے لگے۔ اسلامی اجتماع کا یہ منظّم ادارہ صحیح معنیٰ میں اسلامی ریاست قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ادارہ اللہ کے حکم سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کا دستور قرآن تھا۔ اس کا صدر اللہ کا رسول تھا۔ اس کے تفصیلی امور مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے طے پاتے تھے اور صاحبِ امر کے ذریعہ نافذ ہوتے تھے۔ یہ اللہ کی زمین پر اللہ کی خلافت کا وہ عملی قیام تھا جس کی انسان کو ہدایت فرمائی گئی تھی۔

نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم کے بعد امّت نے آپ کی ہدایات کی روشنی میں، قرآن کا منشا پورا کرنے کے لیے، آپ کا نائب یا خلیفہ منتخب کیا اور اسلامی ریاست کی تنظیم باقی رہی۔ اسلامی ریاست جہاں بھی اور جب بھی قائم ہو اس کی حیثیت اسی روشنی میں سمجھنی چاہیے اور اسی اعتبار سے افراد کو اس سے اپنا تعلق استوار کرنا چاہیے۔ اسلامی ریاست کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا براہِ راست تقاضا بلکہ اس کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم معنی ہے۔ کیونکہ اللہ کے رسول نے فرمایا ہے :

من اطاعنی فقد اطاع اللہ، ومن اطاع الامام فقد اطاعنی،

ومن عصانی فقد عصی اللہ، ومن عصی الامام فقد عصانی[1]۔

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے امام کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اور جس نے امام کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

جو دراصل تشریح ہے اس ارشادِ خداوندی کی کہ :

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ (النساء: ۵۹)

اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے درمیان صاحبِ امر لوگوں کی۔

اس طرح کی ایک ریاست کا قیام عمل میں لانا جس کا دستور قرآن ہو اور جو اسلامی نظامِ زندگی کو عملاً قائم رکھنے کی ذمہ دار ہو، مسلمانوں کا فرض ہے۔ یہی اسلامی زندگی کی صحیح شکل ہے، اور بلا اسلامی ریاست کے اسلامی اجتماع کا تصور دشوار ہے۔ اس حقیقت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت حسن وخوبی کے ساتھ واضح کیا ہے، فرمایا :

انہ لا اسلام الا بجماعۃٍ، ولا جماعۃ الا بامارۃٍ، ولا امارۃ الا بطاعۃٍ[2]......

اسلام بغیر جماعت نہیں، جماعت بغیر نظمِ امارت نہیں، اور امارت بے معنی ہے اگر اس کی اطاعت نہ کی جائے۔

اس ادارہ سے وفادارانہ وابستگی ہر فرد کا فرض ہے، اور اس سے کٹنا ہلاکت کے مترادف۔

---

[1] : بخاری : کتاب الاحکام۔

[2] : مسند دارمی : بابٌ فی ذہاب العلم۔ عن تمیم الداری۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عن ابن عباسٍ عن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال :
من کرہ من امیرہ شیئًا فلیصبر علیہ۔ فانّہ لیس من الناس
احدٌ خرج من السّلطان شبرًا فمات علیہ الّا مات میتۃً جاھلیّۃً [1]

حضرت ابنِ عباس راوی ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : جسے اپنے صاحبِ امر کی کوئی بات بُری لگے اسے اس پر صبر کرنا چاہیے کیونکہ جو آدمی اقتدار سے بالشت بھر بھی خروج کرتا ہے اور اسی حالت میں مرجاتا ہے وہ جاہلیّت کی موت مرتا ہے۔

اسلامی زندگی کے لیے اسلامی اجتماعیت کے، اور اسلامی اجتماعیت کے لیے اسلامی ریاست کے ناگزیر ہونے پر اُمّت کا اجماع ہے۔

یہاں اسلامی ریاست کے جملہ مقاصد کا کوئی تفصیلی جائزہ ضروری نہیں لیکن حقوقِ ملکیت کے سلسلہ میں ریاست کے مقام پر اور ملکیت کے باب میں فرد، اجتماع اور ریاست کے باہمی تعلقات پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان مقاصد پر اجمالی نظر ڈال لیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے مختصرًا یہ ذمّہ داری قیامِ دین کی ذمّہ داری ہے۔ اسلامی ریاست کا مقصد اسلامی طرزِ زندگی کا قیام و نفاذ ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ (الحج : ۴۱)

وہ لوگ جنہیں ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کریں۔ معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں۔

نظامِ خلافت کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں اللہ کے مخلص بندے انسانوں کے خوف سے آزاد ہوکر، شرک کے ہر شائبہ سے پاک صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اسی

---

[1] : بخاری : کتاب الاحکام، مسلم : کتاب الامارہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا حکم مانتے ہیں اور پوری زندگی خدا کے پسندیدہ طریقہ کے مطابق گذارتے ہیں۔ مثالی اسلامی ریاست وہ ہے جو اس وصف سے بدرجۂ کمال متصف ہو۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا - (النور: ۵۵)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اور ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔

افراد کو ان کے انفرادی فرائض کی ادائیگی پر آمادہ کرنے اور اس سلسلہ میں سہولت بہم پہنچانے کے علاوہ ریاست کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ ان فرائض کی بجاآوری کا اہتمام کرے جو اسلامی معاشرہ پر اجتماعی طور پر عائد ہوتے ہیں شریعت نے ان اہم امور کو فرضِ کفایہ قرار دیا ہے۔ ان فرائض کی شرعی حیثیت پر آئندہ قدرے تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ ان فرائض کی بقدرِ کفایت بجاآوری کی ذمہ داری بالآخر ریاست کے سر ہے۔ ان فرائض میں جہاد فی سبیل اللہ، دعوت و تبلیغ، تعلیم و تربیت، عدل و قسط اور امن و امان کا قیام، اور اسلامی سماج کے جملہ مادی اور روحانی مفادات کا تحفظ اور ان کی ترقی شامل ہے۔ اپنے ان فرائض کی انجام دہی کے لیے ریاست کو ضروری وسائل کی فراہمی اور اپنی قوتِ نافذہ کے استعمال کا پورا حق حاصل ہے۔ افراد کا فرض ہے کہ وہ اس گرانبار ذمہ داری کی ادائیگی میں ریاست کے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں۔ اسلامی مزاج فرد اور ریاست کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درمیان کسی کشمکش یا ایک دوسرے کی بدخواہی کا تصور بھی نہیں کرسکتا، جیسا کہ اُوپر کی احادیث سے بخوبی واضح ہے۔ فرد ریاست کا باہمی تعلق اسی تعلق کا ایک پہلو ہے جو بندہ نے اپنے رب کی فرمانبرداری اور اس کے رسول کی اطاعت کا عہد کرکے قائم کیا ہے۔ اسلامی ریاست اللہ کی زمین پر اللہ کی خلافت کی تنظیمی شکل ہے۔ اس رشتہ کے پہلو بہ پہلو فرد و ریاست کا باہمی تعلق اس رشتہ کی ایک شاخ ہے جو ایک فرد اور دوسرے فرد، اور ہر فرد اور پورے اجتماع کے درمیان فطری طور پر پایا جاتا ہے۔

فرد و ریاست:

فرد و ریاست کا باہمی تعلق تعاون اور خیرخواہی پر مبنی ایک فعال، ایجابی اور منفعدی تعلق ہے۔ ریاست افراد ہی کی بہتری کے لیے کوشاں ہے، اور فرد نے اپنے اختیار و ارادہ ہی سے اس کی اطاعت کا فیصلہ کیا ہے تاکہ خلافتِ الٰہی کا فرض انجام پاسکے۔

ریاست کی یہ حیثیت، کہ وہ فرد کے ہی مقاصد کی تکمیل چاہتی ہے، کسی ایک فرد یا چند افراد کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہر فرد سے ہے۔ اسلامی ریاست کسی ایک فرد یا طبقہ کے لیے نہیں بلکہ تمام افراد کی فلاح و بہبود کے لیے وجود میں آتی ہے۔ اس کی نظر میں سب کی حیثیت یکساں ہے۔ وہ خود بھی سب کے لیے ایک ہی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ہر فرد کی نمائندہ اور بہی خواہ ہے۔

ساتھ ہی اسلامی ریاست زمین پر خلافتِ الٰہی کی حامل اور اللہ کے رسول کی نیابت میں قرآن و سنت کو نافذ کرنے کی ذمہ دار بھی ہے۔ اس کو افراد سے ان کی وہ ذمہ داریاں پوری کرانی ہیں جو قرآن و سنت نے ان پر عائد کی ہیں اور اسے افراد کی وہ تمام خدمات بھی بجا لانی ہیں جو شریعت نے اس کے سپرد کی ہیں۔

فرد پر ریاست کے اختیارات، اور ریاست کے بالمقابل فرد کے حقوق فرد و ریاست کی انہی اضافی حیثیتوں کی روشنی میں متعین ہوتے ہیں۔ اگر ریاست آمر و ناہی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بن کر فرد سے حدودِ الٰہی کی پابندی کراتی ہے تو افراد اپنے اختیار و انتخاب سے اس کے کار فرماؤں کا تقرر عمل میں لاتے ہیں، اور انہی کے مشوروں سے ریاست کے اہم امور طے پاتے ہیں۔ اگر یہ ریاست افراد کی مادی اور روحانی فلاح کے لیے ہر طرح کا اہتمام کرتی ہے تو افراد اپنی خیرخواہی، اخلاص اور جفاکشی سے اس کے مختلف کاموں کے خوش اسلوبی سے انجام پانے کی ضمانت دیتے ہیں۔

اوپر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات گذر چکے ہیں جن کی رُو سے ہر فرد کے لیے اسلامی ریاست کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہ اطاعت غیر مشروط نہیں اس کے لیے شرط یہ ہے کہ خود ریاست دستورِ الٰہی کی پابند ہو اور ایسے احکام نہ دے جو احکامِ الٰہی کے خلاف ہوں۔ ریاست کے اپنے الٰہی دستور سے انحراف کی شکل میں فرد کو احکامِ الٰہی سے ٹکرانے والے احکام کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول بہت صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ فرمایا:

لا طاعة فی معصیة اللہ[1]

جب خدا کی نافرمانی لازم آتی ہو تو (کسی کی) اطاعت نہیں کی جائے گی۔

عن انس ابن مالک قال قال رسول اللہ علیہ وسلم اسمعوا و اطیعوا و ان استعمل علیکم عبدٌ حبشیٌ کان راسہ زبیبة[2]۔

انس بن مالک سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارے اوپر ایک چھوٹے سر والے حبشی غلام کو امیر مقرر کر دیا جائے۔

عن یحیٰی ابن الحصین عن جدتہ ام الحصین قالت: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اُمّر علیکم عبدٌ حبشیٌ مجدّع فاسمعوا لہ و اطیعوا ما قادکم

---

[1] مسلم: کتاب الامارہ، باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة اللہ۔

[2] بخاری: کتاب الاحکام۔ باب السمع والطاعة للامام مالم تکن معصیة

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بکتاب اللہ۔[1]

یحییٰ ابنِ حصین اپنی دادی حصین کی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ اگر ایک چپٹی ناک والے حبشی غلام کو بھی تمہارا امیر مقرر کر دیا جائے تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو، جب تک کہ وہ اللہ کی کتاب کے مطابق تمہاری رہنمائی کرے۔

عن عبد اللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال السمع والطاعۃ علی المرء المسلم فیما احب وکرہ ما لم یؤمر بمعصیۃ، فاذا امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ۔[2]

عبداللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: مسلمان کے اوپر امیر کے لیے سمع و طاعت پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر بات میں ضروری ہے اِلّا یہ کہ اسے کسی ایسی بات کا حکم دیا جائے جس میں خدا کی نافرمانی ہو۔ اگر ایسی بات کا حکم دیا جائے جس میں خدا کی نافرمانی ہو تو اس کے ذمہ نہ سُننا ہے نہ ماننا۔

جب اللہ کی کتاب اور حکومت، دونوں دو مختلف راہوں پر نظر آئیں، فرد کو وہ راہ اختیار کرنی چاہیے جس کی طرف اللہ کی کتاب رہنمائی کر رہی ہو۔

عن معاذ ابن جبل عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال خذوا العطاء مادام عطاء، فاذا صار رشوۃ علی الدین فلا تأخذوھا، . . .

. . . . الا ان رحا الاسلام دائرۃ فدوروا مع الکتاب حیث دار۔ الا ان الکتاب والسلطان لیفترقان فلا تفارقوا الکتاب۔ الا انہ سیکون امراء یقضون لکم فان اطعتموھم اضلوکم، وان عصیتموھم قتلوکم۔ قال یا رسول اللہ فکیف نصنع۔ قال کما صنع اصحاب

---

[1] : ابن ماجہ: ابواب الجہاد۔ باب طاعۃ الامام۔

[2] : بخاری: کتاب الاحکام، مسلم: کتاب الامارہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عیسٰی ابن مریم نشروا بالمنا شیر و حملوا علی الخشب۔ موت فی طاعۃ اللہ خیرٌ من حیاتٍ فی معصیۃ اللہ عزّ وجلّ[1]۔

معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سرکاری وظیفے جب تک صرف وظیفے ہیں تب تک انہیں قبول کرتے رہو جب ان کی حیثیت نہیں دین کی خلاف ورزی کے لیے دی جانے والی رشوت کی ہو جائے تو نہ قبول کرنا . . . . آگاہ! اسلام پر مختلف دَور گذریں گے، ہر دور میں تم کتاب اللہ کے ساتھ اس کا تقاضا پورا کرنا۔ آگاہ! ایک وقت ایسا آئے گا جب اللہ کی کتاب اور حکومت ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے، ایسی حالت میں تم کتاب اللہ سے نہ جُدا ہونا۔ آگاہ! عنقریب تمہارے امور کا فیصلہ کرنے والے اصحابِ امر ایسے ہوں گے کہ اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو تمہیں گمراہ کر دیں گے، اور اگر نافرمانی کرو گے تو تمہیں قتل کر دیں گے۔

(راوی نے) پوچھا: اے اللہ کے رسول پھر ہم کیا طرزِ عمل اختیار کریں؟ آپ نے فرمایا: وہی جو عیسٰی ابنِ مریم کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ ان کو آروں سے چیرا گیا اور تختۂ دار پر چڑھایا گیا۔ اللہ کی فرمانبرداری میں موت آجائے یہ اس کی نافرمانی کر کے زندہ رہنے سے اچھا ہے۔

قرآن کریم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر بہت زور دیا گیا ہے جیسا کہ اُوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں اس فریضہ کی انجام دہی کی تاکید کی ہے۔ اس مفہوم کی بعض احادیث اُوپر نقل بھی کی جا چکی ہیں۔ آپ[2] نے فرمایا ہے:

من رأی منکم منکرًا فاستطاع ان یغیّرہ بیدہٖ فلیغیّرہ بیدہٖ

---

[1] : طبرانی: المعجم الصغیر صفحہ ۱۵۴-۱۵۵۔ مطبع انصار دہلی۔ (سنِ طبع درج نہیں)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فان لم یستطع فبلسانہ ، فان لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان [۱]۔

تم میں سے جو بھی کوئی برائی دیکھے اور اسے اپنی قوتِ بازو سے مٹا سکتا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے اپنے ہاتھوں سے مٹا دے۔ اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے دلسے مٹانے کی کوشش کرے، اگر اس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے (اس کے مٹانے کا خواہاں ہو) اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

ظاہر ہے کہ انفرادی منکرات سے کہیں زیادہ ضروری ان خرابیوں کا ازالہ ہے جو حکومت جیسے ہمہ گیر ادارہ میں نظر آئیں کیونکہ ان کا اثر زیادہ دُور رس ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب امر کے ساتھ نصح وخیر خواہی کی جو تاکید فرمائی ہے اس کا ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ ان کو ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر متنبہ کیا جائے اور تنقید و احتساب کے ذریعہ ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ایسا کرنا خود فرد کی اپنی فلاح و نجات کے لیے ضروری ہے:

عن ام سلمہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: یستعمل علیکم امراء فتعرفون و تنکرون فمن کرہ بریٔ و من انکر سلم و لکن من رضی و تابع [۲] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی اُم سلمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تمہارے اوپر ایسے حاکم مقرر کیے جائیں گے کہ ان کی بعض باتوں

---

[۱]: ابو داؤد: کتاب الصلوٰۃ۔ باب الخطبہ یوم العید۔ عن ابی سعید الخدری۔ اس حدیث کو مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

[۲]: مسلم: کتاب الامارہ، باب وجوب الانکار علی الامراء فیما یخالف الشرع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔؛

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو) تم اچھا سمجھو گے اور (بعض باتوں کو) برا سمجھو گے۔ پس جس نے ناپسند کیا وہ (اپنی ذمہ داری سے) بری ہوا اور جس نے تنقید کی وہ (عذابِ آخرت سے) محفوظ ہو گیا، لیکن جو (برائی پر) راضی رہا اور پیروی کرتا رہا (اس کا انجام برا ہو گا) . . . . . .

جب حاکم شریعت کے خلاف کام کرے اور حکومت کی پالیسی اسلامی ہدایات سے منحرف ہو تو حق بات کہنی چاہیے، اور اس سلسلہ میں کسی بات کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔

عن عبادة بن الصامت قال بایعنا رسول الله صلی الله علیه وسلم علی السمع والطاعة فی المنشط والمکره وان لا ننازع الامر اهله وان نقوم او نقول[1] بالحق حیث کنا لا نخاف فی الله لومة لائم[2]

عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ ہم پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر صورت حال میں سنیں گے اور اطاعت کریں گے اور صاحبِ امر سے اقتدار چھیننے کی کوشش نہ کریں گے اور جہاں بھی ہوں حق پر قائم رہیں گے ــــ یا حق بات کہیں گے[1] ــــ ہم اللہ کی راہ میں (تنقید کرتے ہوئے) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

حکومت پر تنقید اس وقت سخت دشوار ہو جاتی ہے جب ملامت سے آگے بڑھ کر اس تنقید کی وجہ سے حکام کے ظلم و جور کا نشانہ بننے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت

---

[1]: راوی کو شک ہے کہ قائم رہیں گے کہا تھا یا حق بات کہیں گے

[2]: بخاری: کتاب الاحکام۔ باب کیف یبایع الامام الناس۔ نیز مسلم: کتاب الامارہ باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة۔ مسلم کی روایت میں ان نقول بالحق کے الفاظ ہیں۔ نیز نسائی: کتاب البیعة اور ابنِ ماجہ: ابواب الجهاد۔ نسائی میں نقوم کا لفظ آیا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بھی عوام کو تنقید کی تاکید کی گئی ہے اور ایسا کرنے کو سب سے بڑا جہاد قرار دیا گیا ہے۔

عن طارق بن شهاب ان رجلاً سال النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقد وضع رجله فی الغرز: ای الجهاد افضل، قال کلمة حق عند سلطان جائر۔[۵۱]

طارق بن شہاب سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، جب کہ آپ اپنے پاؤں رکاب میں ڈال چکے تھے، دریافت کیا کہ کونسا جہاد افضل ہے ؟ آپ نے فرمایا: "ظالم حکمرانوں کے سامنے حق بات کہنا"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صالح خلفاء صدر ریاست کی حیثیت سے اپنی رعایا کو اس کا یہ فریضہ خود یاد دلاتے تھے اور اس کے بجالانے پر تاکید کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ہونے کے بعد اپنی پہلی ہی تقریر میں یہ فرمایا کہ:

ایها الناس! فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی فان اسأت فقوّمونی۔ الصدق امانة والکذب خیانة ...... اطیعونی ما اطعت اللہ ورسوله، فاذا عصیت اللہ ورسوله فلا طاعة لی علیکم۔[۵۲]

لوگو! میں تم پر حکمران بنا دیا گیا ہوں حالانکہ میں تم میں سب سے اچھا فرد نہیں ہوں لہٰذا اگر میں اچھے کام کروں تو میرے ساتھ تعاون کرو اور اگر بُرے کام کروں تو میری اصلاح کرو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے...... جب تک میں خود اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تم بھی میری اطاعت کرو اور جب میں خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت کی ذمہ داری نہیں۔

۵۱: سنن نسائی: کتاب البیعة باب فضل من تکلم بالحق عند امام جائر۔

۵۲: ابن ہشام۔ سیرۃ جلد ۳، صفحہ ۱۰۲، طبع بولاق۔ مصر ۱۲۹۵ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان فرما دیا تھا کہ:

احبّ الناس الیّ من رفع الیّ عیوبی۔[۵۱]

لوگوں میں سے میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وُہ آدمی ہے جو مجھے میرے عیوب بتلائے۔

خلیفہ ہونے کے بعد اپنے پہلے ہی خطبہ میں آپ نے عوام سے یہ درخواست کی تھی کہ:

. . . . . واعینونی علی نفسی بالامر بالمعروف والنھی عن المنکر واحضاری النصیحۃ فیما ولّانی اللہ من امرکم . . .[۵۲]

. . . . . میرے نفس کے مقابلہ میں میری مدد کرو (مجھے) معروف کا حکم دے کر اور منکر سے روک کر، اور اللہ نے مجھے تمہارے امر کا جو نگران بنا دیا ہے اس کے سلسلہ میں میرے ساتھ نصح و خیر خواہی برت کر۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام علاقوں کے مسلمانوں میں یہ تحریر برگشت کرا دی تھی کہ:

ند سلطت الامۃ منذ ولیت علی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر فلا یرفع علی شیئٌ ولا علی احدٍ من عمّالی الّا اعطیتہ . . . . .[۵۳]

جب سے مجھے حکمران بنایا گیا ہے میں نے امّت پر بھلائی کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے کا اصول نافذ کیا ہے۔ پس میرے یا میرے مقرر کردہ عمّال کی جس ذمہ داری سے بھی مجھے باخبر کیا جائے گا میں اس کو پُورا کروں گا۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنی رعایا کے درمیان یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو کوئی بھی آپ کے پاس کسی اجتماعی معاملہ میں یا کسی فرد سے متعلق کوئی اچھی تجویز لے کر آئے گا اس کو اس کے صلہ میں ایک معتد بہ رقم دی جائے گی۔[۵۴]

---

۵۱ : محمد بن سعد: طبقات الکبریٰ۔ جلد ۳ صفحہ ۲۹۲۔ طبع بیروت ۱۹۵۷ء

۵۲ : علی المتقی بن حسام الدین، کنز العمال جلد ۳، نمبر ۲۳۰۲۔ طبع حیدرآباد ۱۳۱۲ھ

۵۳ : ابوجعفر محمد ابن جریر طبری، تاریخ، صفحہ ۲۹۴۰ (حوادث ۳۴ھ) مطبع بریل۔ لیدن ۱۸۹۳ء

۵۴ : جمال الدین ابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی۔ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، صفحہ ۳، مطبع موید مصر ۱۳۳۱ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان آثار سے یہ واضح ہے کہ حکومت پر اسلامی ہدایات کی روشنی میں تنقید اور شریعت کے مطابق اس کا احتساب اسلامی ریاست کے شہریوں کا نہ صرف ایک بنیادی حق ہے بلکہ یہ ان کی ایک شرعی ذمہ داری ہے۔ اس حق کے اثبات اور اس ذمہ داری کی عملاً ادائیگی پر تاریخ اسلامی گواہ ہے۔ یہ اسلامی معاشرہ میں فرد و ریاست کے باہمی تعلق کا ایک اہم پہلو ہے کہ افراد اپنی تنقید و احتساب کے ذریعہ حکومت کو اسلامی ہدایات کا پابند اور اجتماعی مصالح کا خادم بنائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی ریاست کے اعمال و وظائف کی تفصیلات مرتب کرنا اسلامی اجتماع کا کام ہے، اور اسی کی رائے عامہ عملاً ریاست کے حدود و اختیار اور اس کے ہاتھ میں سونپی جانے والی قوتِ قاہرہ کے سلسلہ میں بھی آخری حکم ہے۔ وہی اسلامی ریاست کے کارفرما افراد کا عزل و نصب عمل میں لاتا ہے لیکن خود ریاست کے ادارہ کا وجود ہر حال میں ضروری ہے۔ اسلامی معاشرہ کے تمام افراد مل کر بھی اس کا اختیار نہیں رکھتے کہ وہ ریاست کے ادارہ کو ختم کر دیں۔ جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ اسلامی معاشرہ کے لیے اسلامی ریاست لازمی ہے۔ اسلام کے لیے ریاست کی اہمیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں بڑی خوبی کے ساتھ واضح کی گئی ہے:

الاسلام والسلطان اخوان توأمان۔ لا یصلح احدٌ منهما الا بصاحبها۔ فالاسلام اُسٌّ والسلطان حارسٌ۔ وما لا اُسّ له یهدم، وما لا حارس له ضائع[۵]

اسلام اور اقتدار دو توأم بھائی کی طرح ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا حال درست نہیں رہ سکتا۔ اسلام بنیاد ہے اور اقتدار محافظ۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ منہدم ہو جائے گی، اور جس کا کوئی محافظ نہ ہو وہ برباد ہو کر رہے گی۔

---

۵ : علی المتقی بن حسام الدین برہان پوری: کنز العمال۔ جلد ۳۔ حدیث ۲۰۰۳۔ بحوالہ مسند دیلمی عن جابرؓ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی نظریۂ اجتماع اور مسئلہ ملکیّت :

فرد، اجتماع اور ریاست کے اضافی مقامات کے اس اجمالی مطالعہ سے بھی حقوقِ ملکیّت کے بارے میں بعض بنیادی اصول اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ قرآن و سنت کے متعدّد نصوص ان اصولوں کی تائید کرتے ہیں جن کو ہم اگلے ابواب میں پیش کریں گے۔ یہاں ان نکات کو مختصراً درج کر دینا مناسب رہے گا۔

۱ - پہلی بات یہ ہے کہ فرد، ریاست اور اجتماع تینوں کے اعمال و وظائف اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں مالکانہ حقوق حاصل ہوں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی حقوقِ ملکیّت سے یکسر محروم کر دیا گیا تو وہ ان ذرائع اور وسائل سے محروم رہ جائے گا جو اپنی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسے درکار ہیں۔ لہٰذا فرد، ریاست اور اجتماع تینوں مال و املاک رکھنے اور مالکانہ تصرّفات کرنے کے مجاز ہیں۔

۲ - ان میں سے کسی کے مالکانہ تصرّفات کو دوسرے کے مالکانہ تصرّفات سے اس طرح نہ ٹکرانا چاہیے کہ وہ حقوقِ ملکیّت سے عملاً محروم ہو کر ناکارہ ہو جائے۔ فرد کو اپنی ملکیّت میں ایسے تصرّفات کی اجازت نہیں ہونی چاہیے جو دوسرے افراد یا پورے اجتماع کے لیے مضرّت رساں اور ریاست کے جائز کاموں میں خلل انداز ہو۔ اسی طرح اجتماع یا ریاست کو افراد کے حقوقِ ملکیّت یکسر سلب کر لینے یا بغیر کسی اہم تر مصلحت کے انہیں محدود یا مجروح کرنے کا حق نہیں۔

۳ - افراد کو اپنی املاک میں ریاست کی ایسی مداخلت کو بخوشی گوارا کرنا چاہیے جن کا مقصد زندگی کے اسلامی مقاصد کا حصول ہو اور جو ظلم و عدوان کی تعریف میں نہ آتے ہوں۔

۴ - اسلامی ریاست کو زمین پر اللہ کے نائب اور بندگانِ خدا کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے تمام افراد کی املاک پر کچھ خصوصی اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان اختیارات کا منشاء یہ ہوگا کہ انفرادی املاک مفید اغراض کے لیے استعمال کی جائیں اور ان سے وہی کام لیا جائے جو انسان کے حقیقی مفادات سے ہم آہنگ ہو۔ انفرادی حقوقِ ملکیت میں ریاست کی مداخلت کا مقصد افراد کو اسلامی حدود کا پابند رکھنا اور ان کی اسلامی مقاصدِ ملکیت کی طرف رہنمائی کرنا ہوگا۔

۵ - ریاست اپنی تحویل میں جو مال و املاک رکھے گی، یا اجتماعی مفاد کی خاطر وہ افراد کے حقوقِ ملکیت میں جس درجہ مداخلت کی پالیسی اختیار کرے گی اس کا فیصلہ قرآن و سنّت کی روشنی میں افراد ہی کے مشورہ سے ہونا چاہیے۔ اور افراد کو ریاست کی ان سرگرمیوں کے احتساب کا پورا پورا حق ملنا چاہیے۔

(ج) مزاجِ شریعت

مقاصدِ شریعت:

شریعتِ اسلامی ان ہدایات و ضوابط کا مجموعہ ہے جو اسلام کے کلّی فکر اور اس کے مجموعی مزاج سے اُبھرے ہیں۔ ان کی تفصیلات مرتب کرنے میں اسلام کی فکری بنیادوں، انسانی فطرت، اور اس دنیا میں انسانی زندگی کے عملی حالات کو دخل رہا ہے۔

شریعت کے تمام ہدایات و ضوابط مقصدی واقع ہوئے ہیں۔ شارع جل سبحانہٗ کو ان کے ذریعہ خود اپنے اغراض کی تکمیل یا مفادات کا تحفظ نہیں مقصود بلکہ انسانوں کے مفادات و مصالح مقصود ہیں۔ ان مفادات و مصالح کا تعلق دنیا و آخرت دونوں سے ہے۔ دنیا کا حقیقی مفاد آخرت کے مفاد سے ہم آہنگ ہے۔ شریعت کے مقصود کو جامع طور پر انسان کے تزکیہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شریعت کی وضع و ترتیب کا شرعی مقصود یہ ہے کہ مکلّف کو اپنی خواہشات کی بندگی سے نکالا جائے تاکہ جس طرح وہ اضطراری طور پر اللہ کا بندہ ہے اسی طرح اختیاری طور بھی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کا بندہ بن جائے۔"[۵۱] شریعت کا آخری مقصد انسانوں کا تزکیہ ہے کیونکہ یہی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد رہا ہے۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا سے ظاہر ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔ (البقرہ : ۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار ان کے درمیان انہی میں سے ایک پیغامبر مبعوث فرما جو ان کو تیری آیات سنائے۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

تزکیہ کے پہلو بہ پہلو شریعت کا مقصد یہ بھی ہے کہ انسانی زندگی قائم رہے، خوش اسلوبی اور سہولت کے ساتھ گذاری جا سکے، اور دنیا میں اسے ایسی فلاح نصیب ہو جو فلاحِ آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ مفکرین اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ شریعت کا مقصد انسانی مفادات کا تحفظ اور اس کے مصالح کا حصول ہے۔ احکام شریعت کی بنا حکمتوں اور مصالح پر رکھی گئی ہے۔

"شریعت کی بنا حکمتوں پر رکھی گئی ہے۔ اس میں اصل توجہ معاش اور معاد میں انسانی مصالح کی طرف ہے۔ شریعت سراسر عدل، مجسّم رحمت اور سرتاپا حکمت و مصلحت ہے۔ . . . . . دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح و سعادت اس سے وابستہ ہے۔"[۵۲]

اس شریعت کا گہرا مطالعہ کرنے والوں نے "شریعت کے جملہ احکام کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ بندگانِ خدا کے مصالح کی خاطر وضع کی گئی ہے۔"[۵۳] یہ مفکرین اس بارے میں بھی متفق ہیں کہ وہ بنیادی انسانی مصالح کیا ہیں جن کا تحفظ انسان کی اوّلین

---

۵۱ : ابو اسحٰق شاطبیؒ (م ۷۹۰ھ) الموافقات فی اصول الشریعہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۸، طبع مکتبہ تجاریہ مصر طبع اوّل

۵۲ : محمد ابن قیم الجوزیہ (۶۹۱ھ - ۷۵۱) اعلام الموقعین عن رب العٰلمین۔ جلد ۳ صفحہ ۱۔ المطبعۃ المنیریہ مصر

۵۳ : شاطبی: الموافقات، جلد ۲ صفحہ ۲ (سنِ طبع درج نہیں ہے)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضرورت ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک "امتِ محمدیؐ، بلکہ ساری مذہبی اقوام اس پر متفق ہیں کہ شریعتِ الٰہی پانچ بنیادی ضروریات کے تحفظ کے لیے وضع کی گئی ہے۔ یہ ضروریات دین، جان، نسل، مال اور عقل ہیں[۱]۔"

اس طرح شریعت کے مقاصد دو مختلف پہلو رکھتے ہیں جو ایک دوسرے سے ہم آہنگ بلکہ ایک دوسرے میں پیوستہ ہیں۔ ایک طرف تو شریعت زندگی بسر کرنے کے پاکیزہ طریقے متعین کرکے انسان کا تزکیہ کرتی ہے اور دوسری طرف انسان کے بنیادی مفادات کا تحفظ عمل میں لاتی ہے۔

اپنے اس کام کو شریعت ناقابلِ عمل یا دشوار احکام اور کٹھن پابندیوں کے ذریعہ نہیں بلکہ سہل اور قابلِ عمل ہدایات کے ذریعہ انجام دیتی ہے۔ انسانوں کو احکامِ شریعت کا پابند بنانے سے اللہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ ان سے بلا وجہ مشقت کرائے۔ ان احکام میں انسان کی قوتِ برداشت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ۔ (الحج : ۷۸)

اللہ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی کرنا نہیں روا رکھا ہے۔

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ (البقرہ : ۱۸۵)

---

[۱] : شاطبی: الموافقات: جلد ۱ صفحہ ۳۸۔ نیز سیف الدین ابو الحسن بن ابی علی بن محمد الآمدی (۵۵۱–۶۳۱ھ) الاحکام فی اصول الاحکام، مطبعۃ معارف، مصر ۱۹۱۴ء۔ جلد ۳، صفحہ ۳۹۴۔ محمد بن محمد ابو حامد الغزالی (۴۵۱–۵۰۵ھ) نے بھی مصلحت کی یہی تعریف کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"مصلحت سے ہماری مراد یہ ہے کہ مقصدِ شریعت کی محافظت کی جائے اور خلقِ خدا کے سلسلہ میں شریعت کے مقاصد پانچ ہیں۔ وہ یہ کہ ان کے دین، جان، عقل، نسل اور مال کا تحفظ عمل میں لایا جائے۔ جو چیزیں بھی ان پانچ بنیادی امور کا تحفظ کرنے والی ہوں وہ مصلحت قرار پائیں گی اور جو چیزیں بھی ان بنیادی امور کو ضائع کرنے والی ہوں، وہ مفسدہ ہیں۔ اور ان کا دور کرنا مصلحت ہے" المستصفیٰ من علم الاصول۔ طبع بولاق مصر۔ ۱۳۲۲ھ۔ جلد اوّل صفحہ ۲۸۶ – ۲۸۷۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ تمہارے لیے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے، تمہیں دشواریوں میں نہیں مبتلا کرنا چاہتا۔

عن ابی هريرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان الدین یسر۔[1]

بروایت ابوہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: دین آسان ہے۔

قوانینِ شریعت:

شریعتِ اسلامی کے اوّلین مآخذ قرآن کریم اور سنّت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں تیسرے مرتبہ پر ان قوانین کا ماخذ کسی زمانہ میں اُمّت کے فقہاء اور مجتہدین کا اجماع ہے۔ چوتھا مرتبہ باضابطہ اجتہاد کے ذریعہ استنباط احکام کا ہے جسے اصطلاحی طور پر قیاس کہا جاتا ہے۔

ان چار مآخذ کے علاوہ احکامِ شریعت کی دریافت کے کچھ اور طریقے بھی ہیں۔ جس مسئلہ میں منطقی استدلال اور براہِ راست استنباط کے ذریعہ شریعت کا حکم معلوم کرنا ممکن نہ ہو یا جہاں قیاس کے ذریعہ اخذ کردہ حکم مصالح کے منافی یا تقاضائے ضرورت کے خلاف نظر آئے وہاں اسلامی قانون وہ ہوگا جو قرآن و سنّت کے دیے ہوئے مزاج کے مطابق ہو اور انہی مقاصد کے تحت وضع کیا جائے جو شریعت میں معتبر ہیں۔ قانون سازی کے اس تحری طریقہ کو بعض فقہا نے استحسان اور بعض نے استصلاح سے تعبیر کیا ہے۔[2] اس طور پر

---

[1] : بخاری: کتاب الایمان۔ باب الدین یسر۔

[2] : اصطلاحی طور پر استحسان اور استصلاح کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں اور ان دونوں کے درمیان فرق بھی کیا گیا ہے۔ استحسان کی کئی قسمیں ہیں اور ان میں سے بعض اپنی نوعیت کے اعتبار سے استصلاح سے مختلف واقع ہوئی ہیں۔ ہم ان فنی مباحث کو نظر انداز کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور دینا چاہتے ہیں کہ استنباطِ احکام کے یہ دونوں (باقی حاشیہ بر صفحہ ۶۸)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شریعت کے دائرہ میں وہ احکام بھی داخل ہیں جو کسی زمانہ میں حالات و ضروریات کی مناسبت سے اس زمانہ کی اسلامی ریاست مرتب کرتی ہے۔ چونکہ دونوں طرح کے قوانین کا مقصد شریعت کے مقاصد کا حصول ہے لہٰذا ان کے درمیان عملاً کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔

اسلام میں عادلانہ سیاست پر مبنی قانون سازی بھی شریعت ہی کا ایک باب ہے۔

"کیونکہ انبیاء کی بعثت اور کتابیں نازل کرنے سے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ لوگ قسط پر قائم رہیں، کہ یہی وہ عدل ہے جس کے سہارے زمین و آسمان قائم ہیں۔ پس جب حق کے نشان نمایاں ہو جائیں، عقلی دلائل سامنے آ جائیں اور کسی طریقہ سے بھی حق واضح ہو جائے تو وہی شریعتِ الٰہی اور دینِ الٰہی ہے۔ وہی اللہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۷) طریقے اپنے مزاج اور نتیجہ کے اعتبار سے یکساں واقع ہوئے ہیں۔ ان کی اصل توجہ شریعت کی روح، اس کے مقاصد، اور خلقِ خدا کی ضروریات و مصالح کی طرف ہوتی ہے۔ استصلاح انہی عمومی مصالح پر مبنی قانون سازی کا نام ہے۔ استحسان کسی مسئلہ کو اس کے حکم کے باب میں اس کے نظائر سے کاٹ دینے کا نام ہے۔ یہ طریقہ زیادہ تر حنفی فقہا نے اختیار کیا ہے۔ ان کے استحسان کی مثالوں کا تجزیہ بتاتا ہے کہ زیرِ غور مسئلہ میں اُسی جیسے دوسرے مسائل میں اختیار کردہ حکم سے گریز کی وجہ بالعموم یہ ہوتی ہے کہ مصالح اور ضروریات کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے۔ ضرورت و مصلحت کا لحاظ فقیہ کو قوی تر قیاس کے بجائے قیاسِ خفی، یا قیاس کے بجائے کسی اثر پر اعتماد، یا کسی مصلحی دلیل کا سہارا لینے پر آمادہ کرتی ہے۔ استصلاح اور استحسان کی اس مزاجی یکسانیت کے سلسلہ میں تفصیلی دلائل کے لیے مندرجہ ذیل مآخذ کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے:

۱ : الآمدی: الاحکام فی اصول الاحکام۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۳

۲: الشاطبی: الاعتصام مطبعۃ المنار۔ مصر ۱۹۱۴ء۔ جلد ۲ صفحہ ۱۱۶

۳ : ابوبکر محمد بن ابی سہل السرخسی (م ۴۹۰ھ): المبسوط جلد ۱۰ صفحہ ۱۴۵ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۳۱ھ

۴ : محمد ابوزہرہ: الامام ابوحنیفہ۔ قاہرہ۔ طبع اول، صفحہ ۳۴۵۔

۵ : مصطفیٰ احمد الزرقا: اسلامی فقہ کے مآخذ۔ مقالہ چراغِ راہ اسلامی قانون نمبر ۱۹۵۸ء۔ کراچی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا فرمان ہے اور اسی میں اس کی رضا مضمر ہے۔ عدل تک پہنچنے کے طریقوں یا اس کے دلائل اور علامات کو اللہ نے کسی ایک قسم کے احکام میں محصور کر کے دوسرے قوی تر، زیادہ واضح، اور مدلل طریقوں کو باطل نہیں قرار دے دیا ہے بلکہ اس نے جو طریقے بھی مشروع فرمائے ہیں ان کے ذریعہ یہ واضح کر دیا ہے کہ اصل مقصد حق اور عدل کا قیام اور انسانی زندگی کی متوازن اور منصفانہ تنظیم ہے۔ پس حق تک جس طریقہ سے بھی پہنچا جا سکے، اور عدل کو جس طرح بھی پہچانا جا سکے، اس کے مطابق قانون سازی ضروری ہے۔ اسباب و وسائل اور طریقے مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ اصل مقصود وہ مقاصد ہیں جن کی خاطر انہیں وضع کیا گیا ہو۔ البتہ مشروع طریقوں کو سامنے لا کر اللہ تعالیٰ نے مناسب مثالوں اور معقول اسباب کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ حق کے ثابت شدہ طریقوں میں سے ہر طریقہ آپ کو انہی مقاصد کی طرف لے جانے والا ملے گا۔ شریعتِ کاملہ سے اس کے سوا اور کسی چیز کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہمارے نزدیک سیاست عادلہ شریعتِ کاملہ کی مخالف نہیں بلکہ اسی کا ایک حصہ اور اس کے مختلف ابواب میں سے ایک باب ہے۔ اس کو سیاست کہنا محض ایک اصطلاحی امر ہے ورنہ اگر وہ عدل پر مبنی ہو تو شریعت میں داخل ہے[۵]۔"

جدید اسلامی قانون سازی کی اصولی حیثیت کو سمجھنے کے لیے اس نکتہ کا فہم بہت ضروری ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست، قانون سازی کے اسلامی شرائط کی پابندی کرتے ہوئے جو قوانین مرتب کرے گی وہ شرعی اور دینی حیثیت کے حامل ہوں گے۔ البتہ ان اجتہادی قوانین کو وہ حیثیت نہیں حاصل ہو گی جو قرآن و سنت کے منصوص احکام کو حاصل ہے۔ اجتہادی قوانین اختلافی ہوتے ہیں۔ تفصیلی امور میں اسلامی مفکرین کی ان رایوں کو کوئی آخری اور قطعی بات نہیں سمجھنا چاہیے جو کسی نص صریح پر نہ مبنی ہوں۔ مسئلہ ملکیت کے سلسلہ میں بھی ہمیں ان حدود کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ ایک مصنف

۵: شمس الدین محمد بن قیم الجوزیہ: اعلام الموقعین۔ جلد ۲۔ صفحہ ۳۰۹-۳۱۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ بہت سے اختلافی امور میں اپنی فہم کے مطابق قرآن و سنّت سے استدلال کرتا ہوا، یا انسانی مصالح اور شریعت کے عام مزاج کی روشنی میں بعض رائیں ظاہر کرے۔ لیکن ایسی ہر رائے کا صحیح ہونا یا آخری اور قطعی ہونا چنداں ضروری نہیں۔ قاری کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے مسائل پر خود غور کرے اور جو مختلف رائیں اس کے سامنے پیش کی جائیں ان کو شریعت کے اوّلین معیاروں پر پرکھنے کی کوشش کرے۔ اس طرح کی کسی رائے کو محدود معنی میں بھی شرعی حیثیت اس وقت حاصل ہو سکے گی جب اسلامی ریاست کے زیرِ اہتمام وقت کے اربابِ حل و عقد اس کے حق میں کوئی باقاعدہ فیصلہ کریں اور اسے قانونی شکل دے دی جائے۔ ایسی شکل میں ریاست کے تمام شہریوں کے لیے یہ اجتہادی حکم بھی شرعًا واجب التعمیل قرار پا جائے گا۔

انفرادی حقوق :

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، شریعت کی اصل توجہ انسان کو ان فرائض کی تعلیم دینے کی طرف ہے جن کا مکلّف وہ اپنے مقامِ عبدیت اور منصبِ خلافت کی وجہ سے بنایا گیا ہے۔ شریعت کا اوّلین کام یہ ہے کہ لوگوں کو وہ طور طریقے اختیار کرنے پر آمادہ کرے جو ان کے تزکیہ کا باعث بن سکیں۔ لیکن ان ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور زندگی گزارنے کے یہ پاکیزہ طریقے اختیار کرنے کے لیے انسان کو ذرائع و وسائل، بعض مخصوص حالات، اور یک گونہ اختیار و آزادی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کی فراہمی کے بغیر انسان سے ان فرائض کی بجا آوری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ شریعت کا ایک اہم کام ان ذرائع و وسائل کی فراہمی، مطلوبہ حالات پیدا کرنے کا اہتمام، اور انسانوں کو اپنی فطری قوتوں اور صلاحیتوں سے کام لینے کی وہ آزادی و اختیار عطا فرمانا ہے جو اس مقصد کے لیے ضروری ہو۔ یہی اصول شریعتِ اسلامی میں 'حقوق' کا منبع ہے۔ حقوق فرائض کی خاطر دیے گئے ہیں اور انہی پر مبنی ہیں۔ حقوق کی نوعیت اور ان کے حدود متعلقہ فرائض کی نوعیت اور ان کے حدود سے متعین ہوتے ہیں۔ اصل زور فرض پر دیا گیا ہے، حق کی اہمیت اس کے تحت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آتی ہے۔ دنیا میں انسان کی اصل حیثیت ایک "مکلّف" یا "ذمّہ دار" ہستی کی ہے نہ کہ "حقدار" کی۔

معاصر مغربی تہذیب نے حقوق و فرائض کی یہ ترتیب بالکل اُلٹ دی ہے اور ایک ایسا مزاج بنا دیا ہے جو سماجی فکر کا آغاز فرد کے حقوق سے کرتا ہے نہ کہ اس کی ذمّہ داریوں سے[۱]۔ انفرادیت پرستانہ سرمایہ داری کے تحت یہ کج روی انتہا تک

[۱]: اس اجمال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

R. H. Tawney : The Acquisitive Society, Longman's Green and Co., Madras, 1943)

Ch. II (Rights & Functions) & Ch. III (Acquisitive Society

ذیل کے منتشر اقتباسات سے مصنّف کا موقف واضح ہو جاتا ہے۔ مصنّف سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں نئے سماج کے ظہور کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کی روشنی میں:

"یہ بات چنداں قابلِ تعجب نہیں کہ پرانے سماج کے کھنڈروں پر جس نئے صنعتی سماج کی تعمیر ہوئی اس میں غالب توجہ انفرادی حقوق پر اصرار کی طرف دی گئی، بلا لحاظ اس سماجی مقصد کے جس کے یہ حقوق خادم ہوں" (صفحہ ۱۰)

یہ انفرادی حقوق "ماضی میں کسی عام انسانی مقصد سے وابستہ خیال کیے جاتے تھے، خواہ وہ مقصد مذہبی ہو یا قومی ہو۔ اب ان کو مطلق، مستقل بالذّات اور ناقابلِ منسوخی سمجھا جانے لگا....."

"ریاست ان حقوق میں مداخلت نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ انہی کے تحفظ کے لیے وجود میں آئی تھی"۔ (صفحہ ۱۴)

"اس (نئے نظریہ) کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سماج کی بنیاد اعمال و وظائف (Functions) پر نہیں بلکہ حقوق پر ہے۔ حقوق کا استنباط فرائض کی بجا آوری سے نہیں ہوتا، مثلاً یہ کہ دولت کے اکتساب اور ملکیت سے انتفاع کو کچھ خدمات کی انجام دہی پر منحصر سمجھا جائے، بلکہ فرد دنیا میں یہ حق لے کر آتا ہے کہ وہ اپنی ملکیت میں آزادانہ تصرّف کر سکے اور اپنے ذاتی معاشی اغراض کے لیے جدّ و جہد کر سکے۔ یہ حقوق ان خدمات سے آزاد اور بے نیاز ہیں جو فرد ادا کرتا ہے"۔ (صفحہ ۲۳)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جا پہنچی۔ عملی سیاست اور نظری علوم دونوں پر اس فساد مزاج کا گہرا اثر پڑا۔ خاص طور پر ملکیت کے سلسلہ میں عام آدمی کے سوچنے کا انداز، ماہرینِ معاشیات کا طرزِ استدلال اور حکومتوں کی قانون سازی اسی سانچہ میں ڈھل گئی۔ اس رجحان کا آغاز یورپ میں سولھویں اور سترھویں صدی میں ہوا تھا۔ اس وقت سیاست، معیشت اور معاشرت، ہر میدان میں جبر و استبداد اور فرد و برتری کا تسلّط تھا۔ اس کے ردّ عمل میں لبرل سیاست دانوں اور آزادیٔ کاروبار کے قائل ماہرینِ معاشیات نے انفرادی حقوق اور انفرادی آزادی پر زور دیا۔ ابتدا اس تحریک نے رائج طور طریقوں کو اعتدال پر لانے کا مفید عمل انجام دیا مگر جلد ہی انتہا پسندانہ انفرادیت کے بُرے اثرات ظاہر ہونے لگے بیسویں صدی میں دھارے کا رُخ بدلنے تک ساری متمدن دُنیا پر یہی مزاج چھایا رہا۔

چونکہ ملکیّت کے بارے میں مغربی فکر اور قانون سازی پر اس مزاج کا گہرا اثر پڑا ہے لہٰذا اس موضوع پر اسلام اور مغربی فکر کے بنیادی اختلافات کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ اسلام انفرادی حقوق کی کسی مطلق اور مقدّس فہرست کا قائل نہیں۔ حقوق کسی کے بھی ہوں، فرد کے یا ریاست کے کبھی غیر مشروط، مطلق اور مقدّس نہیں ہوتے۔ ان کی نوعیّت اور وسعت کا انحصار تمام تر ان ذمّہ داریوں پر ہوتا ہے جن کی انجام دہی کے لیے وہ دیے گئے ہوں۔ ریاست کے اختیارات اس کی ذمّہ داریوں کی روشنی میں اور فرد کے حقوق اس کی ذمّہ داریوں کی روشنی میں متعیّن ہوتے ہیں۔ متعلّقہ ذمّہ داریوں کی انجام دہی میں کوتاہی صاحبِ حق کے استحقاق کو کمزور کر دیتی ہے اور مسلسل غلط کاری اور فرض ناشناسی پر ان حقوق کو سلب بھی کر لیا جاتا ہے۔ اس اصول سے نہ ریاست مستثنیٰ ہے نہ فرد۔ اس اصول کا اطلاق مال و املاک رکھنے اور ان میں تصرّف کرنے کے حق، آزادیٔ کاروبار اور سیاسی آزادی کے حق، اور زندہ رہنے کے بنیادی حق، سب پر یکساں ہوتا ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا ....

.... فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ۔ (النساء: ۶)

تم اپنے ان اموال کو جنہیں اللہ نے تمہارے لیے قیامِ حیات کا ذریعہ بنایا ہے نادانوں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ہاتھ میں مت دو...... پھر اگر تم کو ان میں سمجھ بوجھ نظر آئے تو ان کے مال ان کے حوالہ کر دو۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ۔ (المائدہ: ۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوں اور زمین میں فساد مچانے پھریں ان کا بدلہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں، یا انہیں سولی پر چڑھا دیا جائے، یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف پہلوؤں سے کاٹ لیے جائیں، یا ان کو ملک بدر کر دیا جائے۔

عن عبد الله ابن مسعود قال قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم ...... والله لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنکر ولتأخذن علی یدی الظالم ولتاطرنه علی الحق اطرا او لتقصرنه علی الحق قصرا۔[1]

عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "...... خدا کی قسم تم ضرور معروف کا حکم دو گے اور منکر سے روکو گے، اور تم پر لازم ہے کہ ظالم کے ہاتھ پکڑ لو اور اسے صحیح طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کر دو۔ یا اسے حق کے متعین حدود کا پابند بنا دو۔"

آئندہ ابواب میں فرد اور ریاست کے مالکانہ حقوق، ان حقوق کے حدود اور ان سے وابستہ ذمہ داریوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ اصول سامنے رکھنا چاہیئے:

قانون و اخلاق:

شریعتِ اسلامی کے تمام احکام و ہدایات انسانی مصالح کے محافظ ہیں اور سب

---

[1] : ابوداؤد: کتاب الملاحم۔ باب الامر والنہی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کی سند حاصل ہے۔ اس اعتبار سے ان تمام احکام و ہدایات کی تعمیل مطلوب اور پسندیدہ ہے۔ لیکن ہر حکم یا ہدایت کو لازمی اور واجب التعمیل نہیں قرار دیا گیا ہے۔ فرائض اور اختیاری اعمال کی یہ تقسیم اس بنیادی حکمت سے ہم آہنگ ہے جو نوعِ انسانی کے سلسلہ میں خالقِ کائنات کے پیشِ نظر رہی ہے، یعنی امتحان و آزمائش، کھرے اور کھوٹے اور عالی ہمت اور کم ظرف کے درمیان تمیز۔ بہت سے اعمالِ خیر کو اختیاری قرار دے کر، اور ان کے سلسلہ میں صرف ترغیب و تلقین پر اکتفا کر کے، اسلام نے اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ فرد اپنے تزکیہ اور ارتقاء میں جتنے مدارج بھی طے کر سکتا ہو کرے اور جو فرد خود کو جتنا اونچا لے جا سکتا ہو لے جائے۔ یہ تقسیم عبادات میں بھی پائی جاتی ہے اور سیاست و معیشت اور دوسرے معاملاتِ زندگی میں بھی۔ ملکیت کے سلسلہ میں بھی اسلامی ہدایات دونوں ہی اقسام پر مشتمل ہیں۔ ملکیت کے سلسلہ میں اسلام کے ترغیبی احکامات پر جو فرد جتنا زیادہ عمل کرے گا اتنا ہی زیادہ 'مسلم' اور اتنا ہی اچھا 'بندہ' سمجھا جائے گا۔ ان رضاکارانہ اعمالِ خیر سے اسے دنیا میں بھی سکون و راحت میسّر ہو گی اور اس کا اُخروی انجام بھی بہتر ہو گا۔

پھر شریعت کے لازمی احکام (فرائض) میں ایک اور تقسیم بھی ملتی ہے۔ بعض لازمی احکام قانون کے ذریعہ قابلِ نفاذ ہیں اور بعض نہیں ہیں۔ دوسری قسم کے قوانین زیادہ تر عبادات یا ایسے امور سے متعلق ہیں جن کا تعلق انسان کے داخل سے ہے جس پر ریاست کا مطلع ہونا مشکل ہے۔

ملکیت اور اجتماعی نظام کے دوسرے شعبوں کے سلسلہ میں یہ سوال بہت اہم ہے کہ شریعت نے اپنی ہدایات میں قانونی اور اختیاری (اخلاقی) کی تقسیم کیوں روا رکھی ہے یہ تقسیم کس حد تک واضح اور متعین ہے؟ کیا یہ تقسیم اپنی جملہ تفصیلات کے ساتھ دائمی ہے یا چند دائمی اصولوں کی روشنی میں احکام کے قانونی اور اختیاری حلقوں کی سرحدیں زمانہ، حالات اور سماج کے اخلاقی معیار کے ساتھ ساتھ تبدیل بھی کی جا سکتی ہیں؟

ہدایات کے ایک حلقہ کو قانوناً نافذ کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ ایسا کرنا زندگی کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بقاء و تسلسل، اور انسانیت اور خیر کے اس کم سے کم معیار کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے جس کے بغیر نہ فرد کو ارتقاء کا موقع مل سکتا ہے نہ اجتماع کو فلاح نصیب ہو سکتی ہے۔ ہدایات کے ایک حصہ کے قانونی نفاذ کے ذریعہ اس بات کو یقینی کر لیا گیا کہ سماج جب تک اطاعتِ الٰہی کے بنیادی فیصلہ پر قائم ہے اور شریعتِ اسلامی نافذ ہے، اس سماج کی سمتِ سفر نہ بدلنے پائے منزل کی طرف اس کا اقدام جاری رہے اور شر پسند عناصر کو پورے سماج کی فضا خراب کر دینے کا موقع نہ ملے۔ قانون کے ذریعہ نافذ کی جانے والی ہدایتیں انسان کے بنیادی مصالح کا ایک ناگزیر حد تک تحفظ عمل میں لاتی ہیں۔ شریعت کے قوانین کا منشاء مقاصدِ شریعت کا اس حد تک حصول ہے کہ انسانی زندگی بحیثیت مجموعی حکمتِ تخلیق سے ہم آہنگ رہے۔ یعنی انسان جبر و قہر، خوف و ہراس، فقر و فاقہ اور جہل و گمراہی سے پاک فضا میں، ہدایتِ الٰہی کی روشنی میں آزادی کے ساتھ اپنا وہ کردار متعین کر سکے جس پر اس کے اخروی انجام اور بڑی حد تک اس دنیا میں اس کی حالت کا انحصار ہے۔ انسانوں کی آزمائش اور ان میں سے خیر پسندوں کا انتخاب اسی طور پر ممکن ہے۔

قانونی اور اخلاقی ہدایات کی یہ تقسیم انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ انسانی زندگی کو پوری طرح قانون کے شکنجہ میں کس دینا نہ تو مناسب اور مفید ہے نہ ممکن العمل۔ اسی طرح ہر ہدایت کو اختیاری اور اخلاقی ذمّہ داری کا درجہ دے دینا انسان کو ہلاکت کے غار میں دھکیل دینے کے مترادف ہے۔ ناسمجھ افراد اور کمزور قوتِ ارادی رکھنے والے افراد کو ہلاکت کے منہ میں جانے اور لے جانے کا اختیار دینا، پورے سماج کو شر پسندوں کے مقابلہ میں بے بس کر دینا کسی طرح معقول نہیں ہو سکتا۔

شریعت کی بعض ہدایات ایسی ہیں جن کو عام حالات میں اخلاقی ذمّہ داری کا درجہ دیا گیا ہے اور ترغیب و تلقین کے ذریعہ افراد کو ان کی تعمیل پر آمادہ کرنا کافی سمجھا گیا ہے لیکن حالات بدلتے رہتے ہیں، اور ان تبدیلیوں کے ساتھ ان احکام کی تعمیل کی اہمیّت بھی کم یا زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے بعض ہدایات کو مخصوص حالات رُونما ہونے پر قانون کے ذریعہ بھی نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اسراف و تبذیر سے پرہیز، اپنے زائد از ضرورت مال سے اہلِ حاجت کی مدد کرنا، یا سامانِ تجارت کو منصفانہ قیمتوں پر فروخت کرنا عام حالات میں افراد کی اخلاقی ذمّہ داری ہے۔ لیکن اگر ملک کی معیشت کو تنگ حالی کا سامنا ہو، اصحابِ دولت عیش پرستی کی طرف مائل ہو رہے ہوں۔ زکوٰۃ و صدقات اور رضاکارانہ امداد سے اہلِ حاجت کی ضروریات

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ پوری ہو رہی ہوں، اور اشیاء ضرورت کی قلت کے بغیر صرف نفع اندوزی کی خاطر عوام سے زیادہ قیمتیں وصول کی جا رہی ہوں تو بنیادی انسانی مصالح کے تحفظ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ قانون اور قوتِ نافذہ کو حرکت میں لایا جائے اور ان ہدایات کی حکماً تعمیل کرائی جائے۔[۵۱] شریعتِ اسلامی میں بہت سی ہدایات ایسی ہیں جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ اخلاقی ذمہ داری کے بجائے قانونی حکم کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسا ہونا فطرتِ انسانی کے عین مطابق اور زندگی کے حالات کی تغیر پذیری کے پیشِ نظر ناگزیر ہے۔

جن اخلاقی احکام کا تعلق اہم اجتماعی امور سے ہے ان کا معاملہ ان ہدایات سے یکسر مختلف ہے جن کا تعلق انفرادی تزکیہ اور فلاح و بہبود سے ہے۔ اہم اجتماعی امور بہرحال انجام پانے چاہییں کیونکہ ان کی تکمیل سے پورے معاشرہ کے ناگزیر مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ عام حالات میں ان کو ہر فرد کے لیے لازمی نہیں قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ ہر فرد میں ان کی بجا آوری کی استعداد و قوت پائی جائے۔ اس کی بھی توقع کی جاتی ہے کہ عام حالات میں اخلاقی اپیل اور ترغیبی ہدایات سماج کے کچھ افراد کو ان امور کے تحفظ پر آمادہ کریں گی اور متعلقہ سماجی مفاد محفوظ رہے گا۔ لیکن اگر تمام افراد ان ہدایات کو ترک کر دیں تو شریعت کے اہم مقاصد مجروح ہوں گے۔ اس لیے عام غفلت کی صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ ان ہدایات کو قانون کے ذریعہ نافذ کیا جائے۔ ترغیب و تلقین کے ذریعہ کاموں کا انجام پا جانا ایک بڑی اچھی بات ہے لیکن انسانی فطرت کی اس کمزوری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ غفلت اور کوتاہ بینی کا شکار ہو کر بسا اوقات اہم اجتماعی مصالح کے تحفظ سے قاصر رہ جاتی ہے۔ شریعتِ اسلامی کے حافظین اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو کام ترغیب و تلقین کے ذریعہ نہیں پورے ہوتے وہ قوت اور اقتدار کے ذریعہ بآسانی انجام پا جاتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان اللہ لیزع بالسلطان ما لا یزع بالقرآن[۵۲]

اللہ اقتدار کے ذریعہ ان امور کی نگرانی کر لیتا ہے جن کی نگرانی قرآن کے ذریعہ نہیں کرتا۔

۵۱: اس اجمال کی تفصیل، اور اس طرح کی دوسری مثالیں پانچویں اور بارھویں باب میں ملیں گی۔

۵۲: ابوبکر محمد بن محمد ابن الولید الفہری الطرطوشی المالکی: سراج الملوک صفحہ ۴۹ مطبع خیریہ، مصر ۱۳۰۶ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان اللہ لیزع بالسلطان اکثر مما یزع بالقرآن[۱]

اللہ اقتدار کے ذریعہ اس سے زیادہ (امور کو) ٹھیک رکھتا ہے جن کو قرآن کے ذریعہ درست کرتا ہے۔

ایک روایت میں اسی مفہوم کا ایک قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور دوسری روایت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف۔

عن عمر قال: واللہ ما یزع اللہ بسلطان اعظم مما یزع بالقرآن[۲]۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا کی قسم اللہ جو کچھ اقتدار کے ذریعہ درست فرما دیتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو وہ قرآن کے ذریعہ درست فرماتا ہے۔

روی ابن القاسم قال حدثنا مالک ان عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کان یقول: ما یزع الامام اکثر مما یزع القرآن[۳]۔

ابن قاسم راوی ہیں کہ ہم سے امام مالک نے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ امام جو کچھ ٹھیک رکھتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جسے قرآن ٹھیک رکھتا ہے۔

فرض کفایہ:

اسی لیے بعض ہدایات کے سلسلہ میں اسلام نے صراحتًہ یہ پالیسی اختیار کی ہے کہ اگرچہ افراد کے لیے ان کی حیثیت اخلاقی ہدایات کی ہے لیکن پورے اجتماع کے لیے وہ فرض کی

---

۱ : ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب البصری الماوردی: ادب الدین والدنیا صفحہ ۸۱، دار الکتب العربیہ مصر۔

۲ : کنز العمال جلد ۳، حدیث نمبر ۲۴۸۳۔

۳ : ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی: الجامع الاحکام القرآن۔ جلد ۲، صفحہ ۳۲۵۔ دار الکتب المصریہ۔ قاہرہ - ۱۹۵۲ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حیثیت رکھتی ہیں۔ جو افراد ان بابات کی تکمیل کے لیے ضروری وسائل اور استعداد رکھتے ہوں ان کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر ان کو بجا لائیں تاکہ متعلقہ اجتماعی مصلحت کا تحفظ ہو سکے۔ اصطلاحی الفاظ میں یہ حکم "فرض کفایہ" کہلاتے ہیں۔ ان کے تحت عموماً ایسے احکام آتے ہیں جن کا تعلق پورے اجتماع کے مفاد و مصالح سے ہے۔ ان مفادات و مصالح کا تحفظ ضروری ہے۔ لہٰذا ان احکام کی تعمیل اور متعلقہ امور کا انجام پانا لازمی ہے۔

فرض کفایہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے :

مسئلۃ الواجب علی الکفایۃ ۔ وھو مھمٌ متحتّمٌ مقصودٌ حصولُہ من غیر نظرٍ بالذات الی فاعلہ فتناول ماھو دینیٌ کصلوٰۃ الجنازۃ و دنیویٌ کالصنائع المحتاج الیھا۔[۵۱]

واجب علی الکفایہ کا مسئلہ۔ یہ وہ کام ہے جس کا پورا ہونا (شارع کو) قطعی طور پر مقصود ہے۔ بلا لحاظ اس کے اسے کون انجام دیتا ہے۔ اس میں نماز جنازہ جیسے دینی امور بھی شامل ہیں اور ضروری صنعتوں جیسے دنیوی اُمور بھی۔

طلب الکفایۃ یقول العلماء بالاصول انہ متوجّہٌ علی الجمیع ۔ لکن اذا قام بہ بعضھم سقط عن الباقین ۔ وما قالوہ صحیح من جھۃ کلی الطلب واما من جھۃ جزئیۃ ففیہ تفصیل[۵۲]

علماء اصولِ فقہ کا کہنا ہے کہ کفائی حکم کا مخاطب اجتماع ہے، لیکن جب بعض افراد

---

[۵۱] : ابن امیر الحاج (م ۸۷۹) : التقریر و التحبیر فی شرح کتاب التحریر، للامام الکمال بن الھمام (م ۸۶۱) مطبعۃ امیریہ۔ بولاق۔ مصر ۱۳۱۶ھ۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۳۵۔

فرض کفایہ کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل ماخذ کی طرف رجوع مفید ہو گا :

الآمدی : الاحکام فی اصول الاحکام۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۴۱۔

الشاطبی : الموافقات فی اصول الشریعۃ جلد ۱ صفحہ ۱۶۰/۱۶۱ اور صفحہ ۱۷۶/۱۷۷ یا جلد ۲ صفحہ ۱۷۷

محمد الخضری : اصول الفقہ، صفحہ ۴۸۔۵۰۔ طبع مطبع حمایہ۔ مصر۔ ۱۳۲۹ھ

[۵۲] : الشاطبی : الموافقات فی اصول الشریعۃ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۷۶

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے بجا لاتے ہیں تو باقی افراد سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ کہنا اس حکم کی مجموعی حیثیت کے اعتبار سے درست ہے۔ مگر جہاں تک اس کے جزئیات کا تعلق ہے یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔

عام حالات میں، معاشرہ کے کسی ایک فرد کے لیے، فرض کفایہ کی حیثیت ایک ایسی اخلاقی ذمہ داری کی ہے جسے پورا کرنا بہتر ہے۔ لیکن اس کے نہ کرنے پر اسے قابلِ ملامت یا مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔

وفروض الکفایات مندوبات علی الاعیان[1]

فرائض کفایہ افراد کے لیے اخلاقی ہدایات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

امام شاطبی نے شریعت کے مقاصدِ اصلیہ کو ضروری انفرادی مقاصد اور ضروری اجتماعی مقاصد پر منقسم قرار دے کر فرائض کفایہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

واما کونہا کفائیۃ فمن حیث کانت منوطۃ بالغیر ان یقوم بہا علی العموم فی جمیع المکلفین، لتستقیم الاحوال العامۃ التی لا تقوم الخاصۃ الا بہا۔ الا ان ھذا القسم مکمّل للاول۔ فھو لاحق بہ فی کونہ ضروریا، اذ لا یقوم العینی الا بالکفائی وذالک ان الکفائی قیام بمصالح عامۃ لجمیع الخلق، فالمامور بہ من تلک الجھۃ مامور بما لا یعود علیہ من جھۃ تخصیص، لانہ لم یؤمر اذ ذاک بخاصۃ نفسہ فقط، والا صار عینیا۔ بل بإقامۃ الوجود۔ وحقیقتہ انہ خلیفۃ اللہ فی عبادہ، علی حسب قدرتہ وما ھیّئ لہ من ذالک، فان الواحد لا یقدر علی اصلاح نفسہ والقیام بجمیع اھلہ، فضلاً عن ان یقوم بقبیلتہ، فضلاً عن ان یقوم بمصالح اھل الارض۔ فجعل اللہ

---

[1] : الشاطبی: الموافقات فی اصول الشریعۃ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۶۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الخلق خلائف فی اقامة الضروریات العامّة۔ حتّٰی قام الملک فی الارض [1]۔

ان کے "کفائی" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے حاصل کرنے کی ذمہ داری کسی مخصوص فرد پر نہیں بلکہ علی العموم سارے مکلّفین پر ہے تاکہ وہ عام احوال درست رہیں جن کے بغیر انفرادی حالات درست نہیں رہ سکتے (مقاصد کی) یہ قسم پہلی قسم (یعنی ضرری انفرادی مقاصد) کی تکمیل کرتی ہے اور اسی کی طرح ضروری ہے۔ کیونکہ عینی (یعنی انفرادی) مقاصد بغیر کفائی مقاصد کی تکمیل کے حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ کفائی مقاصد کا تعلق تمام بندگانِ خدا کے مشترکہ مصالح کے تحفّظ سے ہے۔ اس اعتبار سے کفائی احکام کا مخاطب ایک ایسے امر کا مخاطب ہے جو مخصوص طور پر اسی پر نہیں عائد ہوتا کیونکہ ان کاموں کا حکم اُسے اس لیے نہیں دیا گیا ہے کہ ان کا تعلق صرف اس کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے ایسا ہوتا تو یہ حکم بھی عینی حکم ہو جاتا۔ ان کا مکلّف بنانے کا منشاء یہ ہے کہ انسانی زندگی قائم رہے۔ فرد کی اصل حیثیت بندگانِ خدا کے درمیان، اپنی قدرت و استعداد کے مطابق، خدا کے خلیفہ کی ہے۔ مگر ایک فرد اتنی استعداد بھی نہیں رکھتا کہ وہ اپنے ذاتی حالات درست رکھے اور اپنے سارے اہل و عیال کے مصالح کی نگرانی کرتا رہے، کجا یہ کہ پورے قبیلہ یا ساری انسانیت کے مصالح کا تحفظ عمل میں لا سکے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مشترکہ انسانی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری تمام لوگوں پر ڈال دی ہے اور اسی بنا پر زمین پر ریاست کا قیام عمل میں آیا ہے۔

شاطبی کی اس تشریح سے فرض کفایہ کی وہ نوعیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے جس پر ہم یہاں زور دینا چاہتے ہیں۔ ان فرائض کا تعلق ان اہم اجتماعی مصالح سے ہوتا ہے جن کا تحفّظ ضروری ہے۔ لہٰذا ان فرائض کی تکمیل ضروری ہے۔ یہ ایسے مصالح ہیں جن کے تحفّظ پر

---

[1] الشاطبی: الموافقات فی اصول الشریعة۔ جلد ۲، صفحہ ۱۷۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

بڑی حد تک انفرادی مصالح کا تحفظ بھی منحصر ہے۔ علماء اصولِ فقہ کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ معاشرہ میں جو لوگ جن کفائی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی دوسرے افراد کی بہ نسبت زیادہ صلاحیت رکھتے ہوں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کو پورا کریں۔ باقی لوگوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں کہ ایسے صاحبِ استعداد و صلاحیت افراد ان ذمہ داریوں کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوں۔ جیسا کہ شاطبی کی مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہے کفائی امور کی انجام دہی کی نگران ریاست ہے اور انہی امور کا تحفظ بڑی حد تک ریاست کو وجود میں لانے کا سبب بھی بنا ہے۔ افراد اگر اپنا اخلاقی فرض پہچانتے ہوں اور ان کے رضاکارانہ عمل سے یہ امور کماحقہٗ انجام پا جائیں تو ریاست کو قانونی ذرائع اختیار کرنے کی چنداں ضرورت نہ پڑے گی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اسے مناسب اقدامات کے ذریعہ اس بات کا اہتمام کرنا ہوگا کہ یہ کام انجام پائیں۔ وہ معاشرہ کی نمائندگی کرتے ہوئے ان امور کی بجا آوری کا اہتمام براہِ راست خود بھی کر سکتی ہے اور اصحابِ استعداد کو ان کی بجا آوری پر مجبور بھی کر سکتی ہے۔ پہلی شکل میں اُسے اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ وہ اصحابِ استطاعت سے ان کاموں کے لیے مطلوبہ ذرائع و وسائل کی فراہمی کا مطالبہ کرے۔ اور دوسری شکل میں وہ صاحبِ استعداد افراد کو ان امور کی انجام دہی پر مجبور کرنے کے لیے مناسب قوانین وضع کرے گی۔

تھوڑے سے غور و فکر سے یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ یہاں بھی قانونی اور اخلاقی ہدایات کے باہمی تعلق کا وہی اصول کام کر رہا ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ابتداءً ایک فرضِ کفایہ معاشرہ کے ایک عام فرد کے لیے ایک اخلاقی ذمہ داری کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر جب اس کی رضاکارانہ انجام دہی نہ عمل میں آ رہی ہو اور متعلقہ ضروری مصالح مجروح ہونے کا اندیشہ ہو تو صاحبِ استعداد افراد کے لیے یہی اخلاقی ذمہ داری ایک فرضِ عین (انفرادی شرعی ذمہ داری) کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر افراد اس شرعی فرض کی تعمیل سے گریز کریں یا چند افراد کی کوششوں کے باوجود یہ فرض اس حد تک نہ ادا ہو سکے کہ متعلقہ اجتماعی مصالح محفوظ ہو جائیں تو قانونِ ریاست کی مشین حرکت میں آ جائے گی

---

۵۱ : ملاحظہ ہو خضری: اصولِ فقہ۔ صفحہ ۵۰

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور وہ ضروری مقاصد کے حصول کے لیے مناسب اقدام کرے گی۔

اُوپر کی بحث اسلامی نظریۂ ملکیت کے سلسلہ میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اس اہمیت کا کچھ اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ فرائض کفایہ میں بہت سے ایسے امور بھی شامل ہیں جن کی انجام دہی کے لیے مال و املاک کا استعمال ناگزیر ہے۔ فرض کفایہ کی فہرست میں اگر ایک طرف دفاع، جہاد فی سبیل اللہ، دعوت الی الحق، اور تعلیم و تربیت شامل ہے تو دوسری طرف ضروریاتِ زندگی کی پیداوار عمل میں لانا، تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت جیسے معاشی اعمال بھی شامل ہیں۔ اس بات پر تمام فقہا متفق ہیں۔ ان کی رائے کا اندازہ ذیل کے چند متفرق اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔ امام ابن تیمیہ اپنے مشہور رسالہ "الحسبہ فی الاسلام" میں لکھتے ہیں:

"اسی طرح ہو سکتا ہے کہ عوام الناس کے لیے ضروری ہو کہ کچھ لوگ صنعتی کاموں میں مشغول رہیں۔ مثلاً عوام کاشت کاری، کپڑا بُننے کی صنعت، اور صنعت تعمیر کے محتاج ہیں۔ کیونکہ ان کو کھانے کے لیے غلہ، پہننے کے لیے کپڑا اور رہنے کے لیے مکان ملنا بہر حال ضروری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی لیے متعدد فقہاء اسلام مثلاً شافعی اور احمد ابن حنبل کے ساتھیوں اور دوسرے مفکرین مثلاً ابو حامد الغزالی اور ابو الفرج ابن الجوزی وغیرہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ ساری صنعتیں فرض کفایہ ہیں کیونکہ ان کے بغیر مصالح عامہ کا تحفظ ممکن نہیں۔"[1]

اس کے بعد امام موصوف نے یہ لکھا ہے کہ یہ فرائض کفایہ ایسے ہی ہیں جیسے عام حالات میں جہاد، حصولِ علم، میت کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ وغیرہ فرض کفایہ ہیں۔ پھر یہ اصولی بات لکھی ہے کہ:

"اسی طرح معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا بھی فرض کفایہ ہے اور سارے امورِ مملکت فرض کفایہ ہیں۔"[2]

---

[1] : تقی الدین ابو العباس احمد بن تیمیہ (م ۷۲۸ھ): الحسبہ فی الاسلام، صفحہ ۷، المطبعۃ المؤید، مصر ۱۳۱۸ھ

[2] : 〃 〃 〃 〃 (〃) : 〃 صفحہ ۱۸ 〃 〃

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شافعی فقیہ، امام نووی نے "صنعت وحرفت اور وہ تمام امور جو معاشی زندگی کے لیے ضروری ہیں" فرائض کفایہ میں شمار کیے ہیں[۵۱]۔ ابنِ عابدین شامی (حنفی) نے بھی بنیادی صنعتوں، کاشت کاری، کپڑا بُننے کی صنعت وغیرہ کو فرائض کفایہ میں شمار کیا ہے[۵۲]۔

فرائض کفایہ کی اس وسعت، اور اسلامی ریاست کے اعمال و وظائف سے ان ذمہ داریوں کے خصوصی تعلق کا اثر اسلامی ریاست کے مالکانہ حقوق اور انفرادی حقوقِ ملکیت میں ریاست کی مداخلت کے حدود پر پڑتا ہے، جیسا کہ ہم آئندہ تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

مزاجِ شریعت اور نظریۂ ملکیّت:

شریعتِ اسلامی کے بعض خصوصی پہلوؤں کے اس اجمالی مطالعہ سے مسئلہ ملکیت کے سلسلہ میں بعض بنیادی باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ ملکیّت کے سلسلہ میں بھی اسلام کے تمام احکام و ہدایات کی اوّلین حیثیت ان کی دینی حیثیّت ہے۔ ایک مسلمان کے مقامِ عبدیّت کا تقاضا ہے کہ وہ ان حدود کا احترام کرے۔ ان احکام کی مخلصانہ تعمیل اس کے تزکیۂ نفس کا ذریعہ اور اسے رضائے الٰہی تک پہنچانے کا وسیلہ ہے۔

۲۔ ملکیّت کے بارے میں اسلامی قوانین و ضوابط پر اس زاویۂ نگاہ سے غور کرنا موزوں نہیں کہ افراد کو کیا حقوق دیے گئے ہیں اور انفرادی ملکیّت کو کس طرح استحکام بخشا گیا ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ فرد پر جو ذمّہ داریاں اس کے مقامِ بندگی اور منصبِ خلافت کی وجہ سے عائد ہوتی ہیں ان کی ادائیگی کے لیے اسے کن چیزوں پر، کس طرح، اور کس حد تک تصرّف کا حق دیا گیا ہے۔

۳۔ ملکیّت کے سلسلہ میں اسلامی شریعت قانونی اور اخلاقی دونوں طرح کی ہدایات پر مشتمل ہے

۵۱: ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی (م ۶۷۶ھ): منہاج الطالبین وعمدۃ المفتین صفحہ ۱۲۵ - دار احیاء الکتب العربی۔ مصر۔ ۱۳۴۳ھ

۵۲: ابن عابدین: ردّ المختار علی الدرّ المختار۔ جلد ۱۔ صفحہ ۳۰۔ مطبع میمنیہ۔ مصر ۱۳۱۸ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دونوں پر عمل یکساں پسندیدہ ہے۔ انسانیت کی اصل معراج اس میں ہے کہ ان ہدایات پر بھی پوری طرح عمل کیا جائے جو اختیاری ہیں جن کے سلسلہ میں شریعت نے صرف ترغیب سے کام لیا ہے۔

۴ - حقوقِ ملکیت کے ضروری انفرادی و اجتماعی مقاصد کا حصول شریعت کو بہرحال مطلوب ہے۔ اگر افراد اخلاقی ہدایات کو اس حد تک نظر انداز کرنے لگیں کہ اہم شرعی مقاصد کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہو تو اسلامی ریاست اخلاقی اپیل اور ترغیب کے بعد قانونی اقدامات کے ذریعہ ضروری مصالح کے تحفظ کا اہتمام کرے گی۔ افراد کے لیے اسلامی ریاست کے ان احکام کی خوش دلی کے ساتھ اطاعت ایک دینی فریضہ ہے دوسری طرف ریاست کو اس حقیقت پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ روحانی اور اخلاقی انحطاط کا اصل علاج قانون سازی اور ضابطہ بندی میں نہیں بلکہ تعلیم و تربیت میں مضمر ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دُوسرا باب

فرد و اجتماع کے مابین حقوقِ ملکیّت کی تقسیم

گذشتہ مباحث کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہو چکی ہے کہ انسان کو مالکانہ حقوق عطا ہونے کی نوعیت کیا ہے۔ یہ حقوق نہ تو کلیتہً فرد کو دیے گئے ہیں نہ تمام تر اجتماع کو عطا ہوئے ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی ایک حیثیت انسان کی پوری نمائندگی کرنے سے قاصر ہے۔ انفرادی اور اجتماعی حیثیتیں انسانی زندگی کے دو مختلف پہلو ہیں جو باہم مربوط ہیں۔ زندگی میں توازن کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کے درمیان توازن برقرار رہے۔ حقوقِ ملکیت کو کلیتہً ان میں سے کسی ایک حیثیت سے ہی وابستہ کر دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی دوسری حیثیت کے مصالح بُری طرح مجرُوح ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اسلامی طرزِ زندگی میں ملکیت کے حقوق انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے وابستہ رکھے گئے ہیں۔ فرد و اجتماع دونوں کو مالکانہ حقوق عطا ہوئے ہیں تاکہ یہ دونوں اپنے فرائض انجام دے سکیں۔

فرد و اجتماع کے مابین حقوقِ ملکیت کی یہ تقسیم دو طرح پر عمل میں آئی ہے۔ بعض اشیاء پر مالکانہ تصرفات کا اختیار فرد کو دیا گیا ہے اور بعض اشیاء کا مالک و مختار اجتماع کو قرار

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی انفرادی حقوقِ ملکیت کے استعمال پر اجتماع کو، اور اجتماعی مالکانہ تصرفات پر افراد کو نگران و محاسب مقرر کیا گیا ہے۔ ہر ایک کو دوسرے کے تصرفات پر احتساب کرنے، اور ان تصرفات کو شرعی حدود کے اندر رکھنے کے لیے مناسب اقدامات کرنے کا مجاز تسلیم کیا گیا ہے۔

اسلام میں فرد و اجتماع کے باہمی تعلق پر اوپر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان دونوں کے درمیان اسلامی مقاصدِ زندگی کے حصول کے لیے فعال تعاونِ اسلام کا ایک اہم تقاضا ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ مقاصد بتمام و کمال حاصل ہوں جو اسلام کو مطلوب ہیں۔ انہی مقاصد کے لیے فرد کو اپنے دائرۂ کار میں اپنے ذرائع و وسائل سے کام لیتے ہوئے پوری جدوجہد کرنی ہے اور بعینہٖ یہی مقاصد ہیں جن کے لیے اجتماع کو بھی اپنے ذرائع و وسائل سے کام لیتے ہوئے اپنے دائرۂ عمل میں کوشش کرنی ہے۔ اسلامی طرزِ زندگی میں ان دونوں کے درمیان مفادات کے ٹکراؤ کی اصولی طور پر کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عملی زندگی میں مفادات کا ٹکراؤ اور اس بناء پر فرد و اجتماع کے مابین کشمکش و نزاع کی شکل اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب دونوں میں سے کوئی ایک زندگی کے اسلامی مقاصد سے غافل ہو جائے۔ سچی اسلامی زندگی میں انفرادی حقوقِ ملکیت کا استعمال اجتماعی مصالح کے تحفظ کا ذریعہ بنے گا اور اسی طرح اجتماعی ملکیت افراد کے مفادات و مصالح کے تحفظ اور تکمیل کا ذریعہ بنے گی۔ جو کچھ اجتماع کی تحویل میں دیا گیا ہے اس کا آخری مقصود افراد کی خدمت اور انہی کی فلاح و بہبود ہے۔

سہولت کی خاطر ہم انفرادی اور اجتماعی ملکیت کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کریں گے۔ ساتھ ہی ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اسلام نے کس طرح اجتماع کو انفرادی ملکیت کا اور افراد کو اجتماعی ملکیت کا محاسب بنایا ہے، اور اس باہمی احتساب سے انسانی مفادات کا تحفظ کس حد تک متوقع ہے۔

انفرادی ملکیت کا حق:

گذشتہ باب میں قرآن کریم کی ایسی بہت سی آیات سامنے آ چکی ہیں جو افراد کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ملکیت کا حق تسلیم کرتی ہیں۔ مزید صراحت ذیل کی آیات میں ملے گی جو واضح الفاظ میں افراد کو ملکیت حاصل کرنے اور اس پر تصرف کرنے کا حق عطا کرتی ہیں:۔

اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ۔

اپنی پاکیزہ کمائی میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں۔ (البقرہ: ۲۶۷)

وَاٰتُوا الۡيَتٰمٰٓى اَمۡوَالَهُمۡ۔ (النساء: ۲)

اور یتیموں کو ان کے مال دے دو۔

وَّاٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اٰتٰٮكُمۡ۔ (النور: ۳۳)

اور ان کو اللہ کے اس مال میں سے کچھ دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ مِمَّا قَلَّ مِنۡهُ اَوۡ كَثُرَ‌ نَصِيۡبًا مَّفۡرُوۡضًا۔ (النساء: ۷)

مردوں کے لیے حصہ ہے اس ترکہ میں سے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں اور اسی طرح عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے اس ترکہ میں سے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

وَلَا تَاۡكُلُوۡٓا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَتُدۡلُوۡا بِهَآ اِلَى الۡحُـکَّامِ لِتَاۡکُلُوۡا فَرِيۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ۔ (البقرہ: ۱۸۸)

اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقہ سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض سے پیش کرو کہ تمہیں دوسرے کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔

وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَـكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ۔ (البقرہ: ۲۷۹)

اور اگر تم (سود خواری سے) توبہ کر لو تو تم اپنے اصل سرمایہ کے حق دار ہو۔

لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُهٰجِرِيۡنَ الَّذِيۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَاَمۡوَالِهِمۡ۔ (الحشر: ۸)

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان نادار مہاجرین کے لیے جو اپنے گھروں اور دوسرے مال و املاک سے بے دخل کر کے نکال دیے گئے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (النور : ۲۷)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو۔

وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا۔ (احزاب : ۲۷)

اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا۔

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا۔ (کہف : ۳۲)

ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو۔ دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑ لگائی اور ان کے بیچ کاشت کی زمین رکھی۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ (یٰس : ۷۱)

کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے مویشی پیدا کئے اور اب یہ ان کے مالک ہیں

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ۔ (کہف $\frac{۷۹}{۸۲}$)

اس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں، کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا . . . . اور وہ اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ان لڑکوں کے لیے ایک خزانہ مدفون ہے اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس لیے تمہارے ربّ نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیات اور دوسری بہت سی آیات واضح الفاظ میں افراد کے لیے املاک رکھنے اور ان پر تصرّف کرنے کا حق تسلیم کرتی ہیں۔ ان آیات میں زمین، کھیت، باغ، گھر، زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار، سواری اور بار برداری کے جانور، سمندر میں چلنے والے جہاز، نقد سرمایہ، اور دوسری اشیاء کی ملکیّت افراد کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے عہد مبارک میں افراد ہر قسم کی املاک رکھتے اور ان پر تمام جائز تصرّفات کرتے تھے۔ نقد سرمایہ کے محفوظ رکھنے، اسے کاروبار میں لگانے، قرض دینے، یا نفع میں شرکت کے اصول پر کسی کاروباری کو دینے کا عام رواج تھا۔ ذاتی استعمال کے لیے سواری کے جانور رکھنے اور ان جانوروں کو کرایہ پر چلانے کا رواج بھی عام تھا۔ افراد اپنے رہائشی مکانات کے مالک ہوتے تھے۔ زمین پر کاشت کرتے، باغ لگاتے، اور اپنے کھیتوں اور باغات کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ ان املاک کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور مالک کے مرنے کے بعد یہ اُن کے ورثاء کے درمیان تقسیم کی جاتی تھیں۔ خود نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور اکابر صحابہ، رضوان اللہ علیہم اجمعین ہر طرح کی املاک رکھتے، ان کو ذاتی استعمال میں لاتے، یا کاروباری اغراض کے لیے استعمال کرتے تھے۔ سنّت قرآن کی شرح ہے، اور سنّت کی روشنی میں ان آیات کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ افراد کو اشیاءِ صرف اور مروّجہ ذرائع پیدائش دونوں طرح کی املاک رکھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

قرآن کریم نے تجارت کو ایک جائز عمل قرار دیا ہے، وراثت کے تفصیلی ضابطے مقرر کیے ہیں، اور دوسرے کے مملوکہ مال کو چرانے کو جرم قرار دیا ہے۔ یہ سارے اُمور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انفرادی ملکیّت کو مسلّم ماننے پر دلالت کرتے ہیں ۔

اشیاء استعمال اور ذرائع پیدائش کی انفرادی ملکیّت کا رواج رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے بھی عام تھا ۔ اگر قرآن وسنّت میں انفرادی ملکیّت کو تسلیم کرنے کا مثبت اعلان نہ بھی ملتا تو عام اصولِ شریعت کے مطابق یہی سمجھا جاتا کہ اسلام اس رواج پر خاموشی اختیار کر کے اسے سندِ جواز عطا کر رہا ہے ۔ مگر جیسا کہ ہم نے اوپر مطالعہ کیا ہے، قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ اس حق کو تسلیم کیا ہے اور نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم نے اپنے متعدّد ارشادات کے ذریعہ اس حقیقت کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے ۔ فرمایا :

کلّ المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ [۱]

ایک مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لیے قابلِ احترام (اور اس پر دست درازی ممنوع) ہے ۔ اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو ۔

مالک کو اپنے مال کی حفاظت کرنے کا حق ہے، وہ اس کے لیے اپنی جان کو بھی خطرہ میں ڈال سکتا ہے :

عن عبد اللہ بن عمرو قال سمعت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یقول : من قتل دون مالہ فھو شھید [۲]۔

عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا : میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے ۔"

عن ابی ھریرۃ قال جاء رجلٌ الی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فقال یا رسول اللہ ارأیت ان جاء رجلٌ یرید اخذ مالی قال فلا تعطہ مالک ۔ قال ارأیت ان قاتلنی ۔ قال قاتلہ ۔ قال ارأیت ان قتلنی قال فانت شھیدٌ ۔ قال ارأیت ان قتلتہ ۔

---

[۱] مسلم : کتاب البرّ والصّلۃ ، ابوداؤد : کتاب الادب ۔ باب الغیبت ۔

[۲] بخاری : ابواب المظالم والقصاص ۔ باب من قتل دون مالہ ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قال ھو فی النار[1]

ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول آپ کی کیا رائے ہے اگر میرے پاس کوئی آدمی میرا مال چھیننے کے ارادہ سے آئے؟ آپ نے فرمایا: تو تم اس کو اپنا مال نہ دو۔ اس نے کہا کہ اگر وہ مجھ سے لڑائی کرے تو آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے فرمایا تم بھی اس سے لڑائی کرو۔ اس نے کہا کہ اگر وہ مجھے قتل کر دے تو؟ آپ نے فرمایا تو تم شہید ہو گے۔ اس نے کہا کہ اگر میں اس کو قتل کر دوں تو آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گا۔

کسی فرد کی مملوکہ زمین پر زبردستی قبضہ کر لینے کو بدترین جرم قرار دے کر یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ پیدائش دولت کے بنیادی ذرائع بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

عن سالم عن ابیہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اخذ من الارض شیئاً بغیر حقہ خسف یوم القیامۃ الی سبع ارضین[2]

سالم اپنے والد کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بغیر حق کے تھوڑی سی زمین پر بھی قبضہ کر لیا اسے قیامت کے دن ساتوں زمینوں تک دھنسا دیا جائے گا۔

من ظلم من الارض شیئاً طوقہ من سبع ارضین[3]

جس نے تھوڑی سی زمین پر بھی ظلماً قبضہ کر لیا اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔

---

[1] : مسلم: کتاب الایمان - باب الدلیل علی ان من قصد اخذ مال غیرہ بغیر حق کان القاصد مھدر الدم فی حقہ ..... الخ

[2] : بخاری: کتاب المظالم والقصاص۔

[3] : " " " " -

06264

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن مجید میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ متعدد دوسرے انبیا کی دعوت اور ان کی اصلاحی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے مگر کہیں کہیں یہ نہیں نظر آتا کہ کسی نبی نے زمین یا دوسرے ذرائع پیدائش کی ذاتی ملکیت کی اصولی طور پر نفی کی ہو۔

قرنِ اوّل کے بعد جب قرآن وسنّت کی روشنی میں اسلامی قوانین کی تفصیلی ترتیب و تدوین عمل میں آئی تو اس میں بھی اشیاء استعمال اور ذرائع پیدائش دونوں پر انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کیا گیا۔ فقہ اسلامی کے مختلف مکاتب میں کوئی ایسا اختلاف نہیں پایا جاتا جو ملکیّت کے باب میں اشیاء استعمال اور ذرائع پیدائش کے درمیان اصولی تفریق کرتا ہو۔

خلاصہ یہ کہ چند اشیاء کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ افراد کو ہر طرح کی املاک رکھنے اور ان پر تصرّف کرنے کا مجاز گردانا گیا ہے۔ البتہ ملکیّت کا حصول اور اس پر تصرّف ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اور ان شرائط کی پابندی کرتے ہوئے ہونا چاہیے جو اسلام نے متعیّن کر دیے ہیں۔

جیسا کہ ہم آئندہ ابواب میں دیکھیں گے اجتماعی مصالح کے تحت اور اسلامی نظامِ زندگی کے مقاصد کی تکمیل کے لیے بعض حالات میں بعض املاک کو اجتماعی ملکیّت قرار دینے کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔ اس اصول کا اطلاق اشیاء صرف اور ذرائع پیدائش دونوں پر ہوتا ہے یہاں صرف اس حقیقت پر زور دینا مقصود ہے کہ اسلام ایک عام اصول کے طور پر انفرادی ملکیّت کی نفی نہیں کرتا۔ اس باب میں اسلام کی راہ اشتراکیّت سے بالکل جدا گانہ ہے۔ کیونکہ اشتراکیّت ایک عام اصول کے طور پر ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیّت کی نفی کرتی ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مشینی دور میں ذرائع پیداوار کی نوعیّت بالکل بدل گئی ہے اور اب ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیّت لازمًا استحصالِ بے جا پر منتج ہوتی ہے۔ آئندہ صفحات میں اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تھوڑے سے غور و فکر سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ نوعیّت کی اس تبدیلی کے باوجود نزولِ قرآن کے دور میں بھی "ذرائع پیداوار" موجود تھے اور "استحصالِ بے جا" بھی ممکن تھا۔ مزدوروں سے طے شدہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُجرت پر صنعتی یا زرعی خدمات لینے کا رواج عام تھا۔ اسی طرح مال خرید کر اسے منافع کے ساتھ فروخت کرنے یعنی تجارت کا طریقہ بھی رائج تھا۔ اگر اسلام کو یہ شکلیں اصولی طور پر ناپسند تھیں تو ان کی ممانعت لازم تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ استحصالِ بے جا کے سدِّباب کے لیے تجارت، کاروبار میں سرمایہ لگانے، مکان، زمین، جانور، کشتیوں وغیرہ کو کرایہ پر دینے، اور اُجرت پر کام کرانے کو متعدّد ضابطوں کا پابند بنایا۔ اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ ذرائع پیدائشِ دولت کی انفرادی ملکیّت سے استحصالِ بے جا کا امکان پیدا ہوتا ہے، مگر اس امکان کے سدِّباب کا اسلامی طریقہ ذاتی ملکیّت کی نفی نہیں بلکہ کاروبار اور کاروباری معاہدوں کو اخلاقی حدود کا پابند بنانا ہے۔

ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیّت قرار دینے کا مسئلہ دورِ جدید کا اہم ترین مسئلہ بن گیا ہے اگرچہ اس بارے میں اسلام کا موقف بالکل واضح ہے لیکن مسئلہ کی اہمیّت کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم بعض اُن اصولی دلائل کا جائزہ لے لیں جو تمام ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیّت قرار دینے کے حق میں پیش کیے گئے ہیں۔

ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیّت کے دلائل

(۱) انفرادی ملکیّت کا خلافِ فطرت ہونا:

اجتماعی ملکیت کے دلائل زیادہ تر مارکسی مفکرین نے پیش کیے ہیں۔ لیکن ان دلیلوں کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں مختصراً اس دلیل کا جائزہ لینا ہے کہ انفرادی ملکیت فطرت کے خلاف ہے اور لوٹ کھسوٹ کے نتیجہ میں وجود میں آئی ہے۔ یہ دلیل مارکس سے پہلے کے بعض سوشلسٹ مفکرین نے پیش کی ہے۔

اس دلیل کی حقیقت ایک دعوے سے زیادہ نہیں۔ اس کی بنیاد انسانی فطرت کے ان ... تصور پر رکھی گئی ہے جس کے حق میں اطمینان بخش دلائل نہیں پیش کیے جا سکتے

www.KitaboSunnat.com

فطرت کے بارے میں ہماری معلومات کے ذرائع وحی الٰہی کے علاوہ علم نفسیات، علم الانسان (Anthropology) اور تاریخ انسانی ہے۔ ان میں سے کسی ذریعہ سے بھی انسانی فطرت کے اس مخصوص نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔ نفسیاتی طور پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان میں اشیاء کو ذاتی تحویل میں رکھنے اور ان پر خود تصرف کرنے کی طلب پائی جاتی ہے۔ انسانی شخصیت کا اظہار بالعموم اس طرح کے اختیار کا طالب رہا ہے۔ اس عام اصول سے استثناء مل سکتا ہے مگر علم نفسیات خود اس اصول کی نفی نہیں کرتا۔ علم الانسان اور تاریخ سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض ادوار میں بعض املاک کو انسانوں نے مشترکہ ملکیت بنا کر رکھا ہے بعض قبیلے چراگاہوں، جانوروں کے گلوں اور زمین کو مشترکہ ملکیت کے طور پر برتتے تھے۔ لیکن اس بات سے ذاتی ملکیت کے انسانی فطرت کے منافی ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں میں انسانوں نے اپنے اجتماعی مصالح کے تحت بعض چیزوں کو مشترکہ طور پر برتنے کو انفرادی ملکیت پر ترجیح دی ہے۔ اس طرح کی مشترکہ ملکیت کا رواج اب بھی باقی ہے اور اسلام نے بھی بعض اشیاء کائنات کو انسانوں کی مشترکہ ملکیت قرار دیا ہے۔ تاریخ یہ ثابت کرنے سے قاصر ہے کہ انسانوں کے اندر ہر طرح کی چیزوں کو مشترکہ ملکیت بنا کر رکھنے کا کوئی عام رجحان پایا جاتا ہے[1]۔ اشیاء استعمال عام طور پر انفرادی ملکیت میں رہی ہیں اور جانوروں کی ذاتی ملکیت کا رواج بھی قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے۔ تاریخ کسی ایسے تمدن کا پتہ نہیں دیتی جس میں تمام اشیاء مشترکہ املاک سمجھی جاتی رہی ہوں۔

فرض کیجیے کہ کسی مخصوص قبیلہ میں، یا تاریخ کے کسی مخصوص دور میں بہت سے علاقوں میں، تمام اشیاء کو مشترکہ ملکیت بنا کر رکھنے کا ثبوت مل بھی جائے تو اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ یہ رواج

---

[1] : اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: (Robert H. Lowie, Ph : D. Primitive Society London : Routledge Kegan Paul Ltd. 1953, Ch. IX pp. 195 to 232)

کا نواں باب، صفحات ۱۹۵ تا ۲۳۲

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسانی فطرت کے تقاضے میں وجود میں آیا تھا۔ اس طرح کا استدلال درست ہو تو مختلف تاریخی حقائق کو سامنے رکھ کر انسانی فطرت کی طرف متضاد رجحانات منسوب کیے جا سکیں گے جو ایک غیر معقول بات ہوگی۔

پرودھان کا مشہور جملہ "ملکیت سرقہ ہے" محض ایک دعویٰ ہے۔ اس کا اشارہ اگر مشترکہ چراگاہوں (Commons) کو ذاتی ملکیت میں تبدیل کرنے کی اس مہم کی طرف ہو جو گزشتہ چند صدیوں میں انگلینڈ اور دوسرے یورپین ممالک میں چلی تھی تو بلاشبہ اس مخصوص معاملہ کی حد تک یہ الزام درست ہوگا۔ لیکن آبادی سے دور کی جو افتادہ زمینیں افراد یا حکومت کے قبضہ میں نہ ہوں، اور نہ انھیں مشترکہ ضروریات کے لیے استعمال کیا جا رہا ہو، ان کو اپنی ذاتی محنت سے کھیتوں اور باغات میں تبدیل کر کے اپنی ملکیت بنا لینے والے افراد پر کسی طرح سرقہ کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ خدا نے زمین اسی لیے بنائی ہے کہ انسان محنت صرف کر کے اس سے روزی حاصل کرے، اور مسلسل محنت کے لیے ضروری ہے کہ محنت کرنے والے کو زمین پر قبضہ و اختیار حاصل ہو۔ جب وافر طور پر غیر مملوکہ افتادہ زمینیں موجود ہوں، اور کوئی بھی فرد محنت کر کے زمین حاصل کر سکتا ہو تو کسی کے ایسا کرنے کو سرقہ کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس استدلال سے منطقی طور پر اشیائے صرف اور روزمرہ استعمال کی چیزوں کی ذاتی ملکیت بھی غلط قرار پاتی ہے، حالانکہ اجتماعیت کے تمام علمبردار اشیائے صرف کی انفرادی ملکیت پر متفق ہیں۔ خود پرودھان بھی اشیائے استعمال کی ذاتی ملکیت کے پہلو بہ پہلو ہر اس چیز کی ذاتی ملکیت کا قائل تھا جسے مالک کرایہ یا نفع وصول کر کے دوسروں کے استحصال کے لیے نہ استعمال کرے۔ وہ وراثت اور وصیت کے ذریعہ انتقالِ ملک کو بھی صحیح سمجھتا تھا۔ لیکن اجرتوں میں مساوات چاہتا تھا۔ دراصل وہ اس مطلق اور بے قید حقِ ملکیت کا مخالف تھا جو بجا اور بے جا ہر طرح کے تصرف پر حاوی ہو[1]

---

[1] (H. W. Laidler : Social Economic Movements, London : Routledge & Kegam Paul, 1948, p. 65)

(باقی بر صفحہ ۹۶)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درحقیقت انفرادی ملکیت کی جب بھی مخالفت کی گئی ہے زیادہ تر اسی بنا پر کی گئی ہے کہ اس طرح ایک فرد کو دوسرے فرد کے استحصال کا موقع ملتا ہے اور اس موقع سے لازماً فائدہ بھی اُٹھایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ دیکھیں گے یہ ایک شدید غلط فہمی ہے۔ ذاتی ملکیت اور استحصال میں لازم و ملزوم کا رشتہ نہیں پایا جاتا۔

(ب) انفرادی ملکیت کا پیداوار کے اجتماعی طریقہ سے متصادم ہونا:

ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت کی سب سے مدلّل وکالت کارل مارکس اور فریڈرک اینجلز کی جانب سے کی گئی ہے۔ اب ہم ان کے پیش کردہ دلائل کا جائزہ لیں گے۔

اینجلز کے الفاظ میں ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت بنا دینے کی ضرورت اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ پیداوار کا اجتماعی طریقہ اس بات سے ہم آہنگ نہیں ہے کہ حاصلِ پیداوار کو سرمایہ دار اپنی ملکیت بنا سکے۔ عملِ پیداوار میں بہت سے افراد حصّہ لیتے ہیں اور حاصلِ پیداوار کو صرف ایک فرد، سرمایہ دار، اپنی ملکیت بنا لیتا ہے۔ یہ ایک کھُلا ہوا تضاد ہے جس سے بہت سے مفاسد جنم لیتے ہیں۔ کارخانوں کے اندر اجتماعی طور پر پیدائشِ اشیاء عمل میں لانے کے طریقہ سے پہلے دولت کو انفرادی طور پر پیدا کرنے کا رواج تھا۔ محنت کار اپنے آلات سے کام لے کر خام مواد کو تیار شدہ سامانوں میں تبدیل کرتا تھا۔ یہ تیار شدہ سامان اس کی ملک ہوتا تھا۔ وہ انہیں خود صرف کر سکتا تھا یا بازار میں فروخت کر کے اپنے حاصلِ محنت کے بقدر نقد رقم حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن کارخانوں کے رواج اور بھاپ کی طاقت اور مشینوں کی

(بقیہ صفحہ ۹۵) یہ دونوں کے اپنے الفاظ میں اس کے خیالات کے مطالعہ کے لیے مندرجہ ذیل کتاب کے صفحات ۵۹۲ تا ۶۰۷ ملاحظہ ہوں۔

(Readings in the History of Economic Thought Ed. S. Howard Patterson, Mc Graw Hill Book Company Inc; 1932, pp. 592 to 607)

حاشیہ صفحہ ہذا سلہ:

(Fredrick Engles: Socialism; Utopion and Scientific in Karl Marx and Fredrick Engles: Selected works Vol. II page 129, Moscow—1949)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایجادنے صورتِ حال بالکل بدل دی:

"اس کے بعد ذرائع پیداوار اور پیداکنندگان کے بڑے بڑے کارخانوں میں مرکوز ہو جانے کا عمل شروع ہوا اور اس طرح وہ عملاً اجتماعی ذرائع پیداوار اور اجتماعی پیداکنندگان میں تبدیل ہو گئے۔ لیکن ان اجتماعی پیداکنندگان، اجتماعی ذرائع پیداوار کے ساتھ اس تبدیلی کے بعد بھی وہی سلوک ہوتا رہا جو پہلے ہوتا تھا —— یعنی وہ سلوک جو افراد کے ذرائع پیداوار اور ان کی پیداوار کے ساتھ ہوتا تھا۔ اب تک آلاتِ محنت کا مالک ہی پیداوار کا بھی مالک ہوتا تھا، کیونکہ ہر حال میں یہ اُسی کی پیداوار ہوتی تھی اور دوسروں کی مدد شاذونادر ہی لی جاتی تھی۔ اب بھی آلاتِ محنت کا مالک پیداوار کا مالک بن بیٹھا، اگرچہ یہ پیداوار اب اس کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ خالصتہً دوسروں کی محنت کی پیداوار ہوتی تھی۔ اس طور پر اجتماعی طریقہ سے پیدا کی ہوئی پیداوار کے مالک اب وہ لوگ نہیں رہے جو عملاً ذرائع پیداوار کو حرکت میں لاتے تھے اور جو عملاً ان اشیاء کو پیدا کرتے تھے۔ بلکہ اس کے مالک سرمایہ دار لوگ ہونے لگے۔ ذرائع پیداوار اور پیداوار اب اصلاً اجتماعی بن چکے تھے۔ مگر اب بھی وہ ایک ایسے ضابطۂ حصولِ ملکیت کے تحت رکھے گئے جو عملِ پیدائش کو انفرادی فرض کر کے چلتا ہے، جس کی رو سے ہر فرد اپنی پیداوار کا مالک ہوتا ہے اور اُسے خود بازار میں لاتا ہے۔ طریقۂ پیدائش کو حصولِ ملکیت کے اسی ضابطہ کے تحت باقی رکھا گیا اگرچہ نئے طریقہ پیدائش نے ان حالات ہی کو ختم کر دیا تھا جن پر مؤخر الذکر مبنی تھا۔"[1]

اس تضاد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار مزدوروں کا استحصال بے جا کرتے ہیں۔ سرمایہ دار خام مواد اور مشینیں بہم پہنچاتا ہے، مزدور اس کے کارخانہ میں آ کر اپنی محنت سے عملِ پیدائش کو ممکن بناتا ہے۔ پیداوار سرمایہ دار کی ملک ہوتی ہے جسے وہ بازار میں فروخت کرتا ہے۔ مزدور کو وہ اتنی ہی اُجرت دیتا ہے جتنی اس کے گذارہ کے لیے درکار

---

[1] : اینجلز، بحوالہ بالا۔ صفحہ ۱۲۸

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو۔ پیداوار کی قیمت فروخت اور لاگت کے درمیان جو رقم بچ رہتی ہے اسے وہ خود رکھ لیتا ہے۔ مارکس کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح سرمایہ دار مزدور کو اس کی محنت کے پھل کے ایک حصہ سے محروم کر دیتا ہے۔ اس دعویٰ کی بنیاد اس کا یہ نظریہ ہے کہ اشیاء کی قدر (VALVE) صرف محنت سے متعین ہوتی ہے۔ اسی نظریہ محنت سے اس نے قدرِ زائد کا نظریہ اخذ کیا ہے جو سرمایہ دارانہ استحصال کی وضاحت کرتا ہے۔ قدر کے نظریۂ محنت (Labour Theory of Value) کی رُو سے کسی شے کی قدر اس مقدارِ محنت سے متعین ہوتی ہے جو اس شے کی تیاری کے لیے سماجی طور پر ضروری ہو۔ نظریۂ قدر زائد (Theory of Surplus Value) کی رُو سے صرف محنت ہی میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ خود اپنی قدر سے زیادہ قدر پیدا کر سکے۔ دُوسرے عوامل پیدائش کی صلاحیت صرف اپنی قدر کو کسی دُوسری شے میں منتقل کر دینے تک محدود ہے۔ مارکس کے نظریۂ استحصال (Theory of Exploitation) کو سمجھنے کے لیے ان باتوں کو قدرے وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا ضروری ہے۔

محنت کی رسد کے لیے وہ ضروریاتِ زندگی درکار ہیں جن کے سہارے محنت کرنے والے، یعنی مزدور زندہ رہ سکیں، ان میں محنت مزدوری کرتے رہنے کی صلاحیت برقرار رہے اور مزید محنت کرنے والوں کی پیدائش اور نشوونما جاری رہے۔ جتنی محنت ان ضروریاتِ زندگی کی پیدائش کے لیے ضروری ہو وہ مزدور کی محنت کی اصل قدر ہے۔ مزدور چند گھنٹے کام کر کے اپنی ضرورت کے بقدر سامانِ زندگی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اس میں ان چند گھنٹوں سے زیادہ کام کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ سرمایہ دار اس کی اس صلاحیت سے بے جا فائدہ اُٹھاتا ہے۔ وہ ضروریاتِ زندگی کے بقدر اُجرت دینے کا معاملہ کرتا ہے مگر ضروری حد سے کہیں زیادہ محنت کراتا ہے۔ کارخانہ کے متعینہ اوقاتِ کار میں مزدور جتنی محنت کرتا ہے وہ اس ضروری مقدارِ محنت سے زیادہ ہوتی ہے جو مزدور کی ضروریاتِ زندگی کے بقدر سامان تیار کرنے کے لیے درکار تھی۔ مزدور کو اُجرت میں صرف اسی ضروری مقدارِ محنت کی پیداوار ملتی ہے۔ کیونکہ یہ اُجرت عملاً اس کی ضروریات سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بلکہ سرمایہ دا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے اس سے بھی کم کرنے کی طرف مائل رہتا ہے۔ بقیہ پیداوار یعنی فاضل محنت کا حاصل سرمایہ دار خود رکھ لیتا ہے۔ یہی قدر زائد ہے۔ اس کا اصل مستحق اور جائز مالک مزدور ہے مگر سرمایہ دارانہ طریقۂ پیدائش کا بنیادی تضاد اسے سرمایہ دار کے حوالے کر دیتا ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرنے والا مزدور پانچ گھنٹے روزانہ محنت کر کے جو کچھ پیدا کرتا ہے وہ اس کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے کافی ہوتا ہے۔ آٹھ گھنٹے کی محنت سے مزدور جو قدر پیدا کرتا ہے اس میں سے پانچ گھنٹے میں پیدا کردہ قدر اس کی اپنی محنت کی قدر سمجھی جائے گی۔ مزید تین گھنٹوں میں جو قدر پیدا ہوتی ہے وہ قدر زائد ہے۔ مزدور کو اُجرت میں صرف پانچ گھنٹوں میں پیدا کی ہوئی قدر ملتی ہے۔ بقیہ تین گھنٹوں میں پیدا کی ہوئی قدر بھی اسی کو ملنی چاہیے تھی مگر سرمایہ دارانہ طریقۂ پیدائش کے ساتھ جو تضاد وابستہ ہے اس کے سبب یہ قدر زائد سرمایہ دار کی ملک بن جاتی ہے۔ یہ کھلا ہوا استحصال ہے۔

جہاں تک دوسرے عواملِ پیدائش، زمین، سرمایہ اور کاروباری جدّوجہد (Enterpreneur ship) کا تعلق ہے، وہ قدر زائد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ یہ عوامل جب کسی پیداواری عمل میں حصّہ لیتے ہیں تو پیداوار میں صرف اتنی ہی قدر منتقل ہوتی ہے جتنی یہ عوامل رکھتے تھے۔ مارکس کے نزدیک کاروباری جدّوجہد اور تنظیم کاروبار کو کسی ممتاز عاملِ پیدائش کا مقام نہیں حاصل ہے۔ زمین اور سرمایہ کا زیادہ سے زیادہ حق یہ ہے کہ انھیں برقرار رکھا جائے۔ ان سے پیداوار کے اندر اتنی ہی قدر منتقل ہوتی ہے جتنی پیداواری عمل میں استعمال کے باعث ان کے اندر سے کم ہوئی ہو۔ زمین اور مشینوں اور دوسرے سامانِ سرمایہ پر اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر ایک سامان کی پیداوار پر زمین کے کرایہ، مشین کی ٹوٹ پھوٹ کے معاوضہ، خام مال کی قیمت اور مزدور کی اُجرت دینے میں ایک ہزار روپے صرف ہوئے ہیں، اور اس سامان کی قدر بارہ سو روپے ہے، تو لاگت پر دو سو روپے کی قدر کا جو اضافہ ہوا ہے وہ قدر زائد ہے جسے مزدور نے پیدا کیا ہے۔ قدر زائد کے پیدا کرنے میں مشین، زمین، اور کاروباری آدمی کا کوئی دخل نہیں۔ کیونکہ ان میں سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی کے اندر اپنی قدر پیداوار کے اندر منتقل کرنے کے ماسوا مزید قدر پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ اس قدر زائد کا اصل مستحق مزدور ہے۔ سرمایہ دار اگر اس فاضل آمدنی کو اپنا منافع قرار دے کر خود رکھ لیتا ہے تو یہ اس کی زیادتی ہے۔ یہی وہ استحصال بے جا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے۔

لیکن یہ استحصال بے جا سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کے لیے لازمی ہے۔ اگر سرمایہ دار صرف اپنا لگایا ہوا سرمایہ واپس لینے پر قناعت کرے اور مزدور کی پیدا کردہ ساری قدر زائد اس کے حوالہ کر دے تو اس کو خود کوئی آمدنی نہیں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس پر راضی نہیں ہو سکتا۔ اس کو کاروبار کرنے اور پیداواری عمل کو جاری رکھنے سے دلچسپی صرف اسی شکل میں ہو سکتی ہے جب ایسا کرنے سے اُسے بھی آمدنی ہو۔ چونکہ وہ خود کوئی قدر نہیں پیدا کرتا لہٰذا اس کی آمدنی کی واحد شکل یہی ہے کہ لاگت اور حاصل کے درمیانی فرق کو اپنا منافع قرار دے کر اپنے پاس رکھ لے۔ سرمایہ دار سرمایہ دارانہ نظامِ پیدائش کی منطق سے مجبور ہے کہ قدر زائد مزدور کے حوالے کر دینے کے بجائے خود اپنے پاس رکھ لے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی وہ آمدنی بند ہو جائے گی جس کی خاطر وہ اپنا سرمایہ لگاتا اور طرح طرح کے خطرے مول لیتا ہے۔ وہ کاروباری عمل اور پیداواری جدوجہد سے کنارہ کش ہو جائے گا، اور سرمایہ دارانہ نظامِ پیدائش قائم نہ رہ سکے گا۔

سرمایہ داروں کے درمیان مسابقت اشیا کی قیمت کو کم کرنے کا باعث بنتی ہے۔ قیمتوں میں کمی کا اثر حاصل اور لاگت کے درمیانی فصل یعنی سرمایہ دار کے منافع پر پڑتا ہے۔ اپنی آمدنی کم ہوتے دیکھ کر سرمایہ دار اپنی لاگت میں کمی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لاگت کم کرنے کا ایک آسان طریقہ مزدور کی اُجرت گھٹا دینا یا اس کے اوقاتِ کار میں اضافہ کر دینا ہے۔ سرمایہ دار دونوں طریقے اختیار کرتا ہے۔ مزدور اپنی زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے اجرت پر کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے، کیونکہ جدید آلاتِ پیدائش اسے اس بات کا موقع نہیں دیتے کہ ان آلات کو ذاتی طور پر حاصل کر کے آزادانہ پیدائشِ دولت کو اپنی معاش کا ذریعہ بنائے۔ وہ مجبوراً اجرت میں کمی یا اوقاتِ کار میں اضافہ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لاگت میں کمی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے سرمایہ دار مشینوں کا استعمال بڑھانے اور انسانی محنت کا کام گھٹانے کی طرف بھی مائل ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ایک طرف تو مزدوروں کو نسبتاً اوقاتِ کار میں پہلے سے زیادہ سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور دوسری طرف بے روزگاری وجود میں آتی ہے۔ بے روزگاری مزدور طبقہ کی مجبوری اور کمزوری میں اضافہ کر دیتی ہے۔ جب لاگت میں کمی کے یہ مختلف طریقے تمام سرمایہ دار اپنا لیتے ہیں تو مسابقت کے نتیجہ میں اشیا کی قیمتیں اور زیادہ کم ہو جاتی ہیں۔ اپنا منافع کم ہوتے دیکھ کر سرمایہ دار پھر انہی کوششوں میں لگ جاتا ہے اور پھر یہی نتائج رُونما ہوتے ہیں۔ یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں پیداوار کا وہ حصّہ جو اُجرت کی شکل میں مزدوروں کی طرف منتقل ہوتا ہے کم سے کمتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ مزدور طبقہ بے روزگاری، افلاس، قوتِ برداشت سے زیادہ محنت، اور دوسرے مظالم کا زیادہ سے زیادہ شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔

ظلم و استحصال کی یہ ساری شکلیں اس نظامِ پیداوار کے لازمی نتائج کے طور پر وجود میں آتی ہیں جس کی بنیاد ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیّت پر ہے۔ اس میں کسی منفرد سرمایہ دار کی نیّت یا کردار کو مطلق دخل نہیں۔ ہر سرمایہ دار اس طریقۂ پیداوار کی منطق سے مجبور ہے کہ ایسا طرزِ عمل اختیار کرے جس سے یہ نتائج رونما ہوتے ہیں۔ جو سرمایہ دار بھی اس طرزِ عمل سے گریز کرے گا اسے حالات کا دباؤ اپنا طرزِ عمل بدلنے یا کاروبار ترک کر کے نظامِ پیداوار سے کنارہ کش ہو جانے پر مجبور کر دے گا۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی ایک فرد یا سارے افراد کی بدنیتی، بدکرداری، یا اخلاقی خرابیوں کے نتیجہ میں نہیں ہوتا بلکہ اس بنیادی تضاد کے نتیجہ میں ہوتا ہے جو پیدائشِ دولت کی اجتماعی نوعیّت اور ملکیّتِ حاصل کی انفرادی نوعیّت کے مابین پایا جاتا ہے[۱۰]۔ لہٰذا اس صورتِ حال کا

۱۰: کارل مارکس نے لکھا ہے ایک ممکن غلط فہمی کے ازالے کے لیے چند الفاظ ضروری ہیں میں نے سرمایہ دار اور زمیندار کی کوئی بہت حسین تصویر نہیں پیش کی ہے۔ لیکن یہاں افراد سے صرف اسی حد تک بحث کی گئی ہے جس حد تک وہ کسی مخصوص اقتصادی کردار کے نمائندہ یعنی مخصوص طبقاتی تعلقات اور طبقاتی مفادات کے حامل ہیں۔ میرا موقف جس کی رو سے سماج کی معاشی تشکیل کا ارتقاء تاریخ طبعی کا ایک عمل قرار دیا گیا ہے، فرد کو ان تعلقات کا ذمہ دار نہیں قرار دے سکتا۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۰۴)

www.KitaboSunnat.com

علاج نیّت کی درستی، کردار کی اصلاح یا اخلاقی تربیت کے ذریعہ نہیں بلکہ اس بنیادی تضاد کو دور کر کے ہی کیا جا سکتا ہے:

"یہ علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جدید پیداواری قوتوں کی اجتماعی نوعیت کو عملاً تسلیم کر لیا جائے اور طریقہ پیداوار، طریقہ ملکیتِ حاصل، اور مبادلہ کو ذرائع پیداوار کی اجتماعی نوعیت سے ہم آہنگ بنا دیا جائے۔ اس کا طریقہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اجتماع علانیۃً اور براہِ راست پیداآور قوتوں پر قبضہ کرے جو کہ اب پورے اجتماع کے کنٹرول کے سوا کسی دوسرے طریقہ سے قابو میں رکھے جانے کے قابل نہیں رہ گئی ہیں[۱]"

بات کو مکمل کرنے کے لیے ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ پورے اجتماع کے قبضہ و اختیار کی واحد عملی شکل ایک ایسی ریاست کا کنٹرول ہے جو سماج کی نمائندہ ہو اور جس کے تحت مختلف سماجی گروہ مختلف مراحل پر ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہوئے کام کریں۔ اس کے علاوہ اجتماعی کنٹرول کا کوئی عملی تصور ممکن نہیں۔ مارکس کے بعض اقوال سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انجام کار ریاست کے تحلیل ہو کر محو ہو جانے کا قائل تھا۔ مارکس کے مستند شارحین اس طرح کے اقوال کی ترجمانی میں مختلف الرائے ہیں۔ مگر اشتراکی نظام کے عملی تجربے نے یہ بتایا ہے کہ یہ اجتماعی کنٹرول ریاست ہی کے ذریعہ عمل میں آتا ہے جو عموماً کلیت پسندانہ ہوتی ہے۔

اس استدلال کا سارا زور اس دعوے پر منحصر ہے کہ حاصل اور لاگت کے درمیانی فصل کی پیدائش میں محنت کے علاوہ دوسرے عواملِ پیدائش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قدر زائد کا نظریہ، اور استحصال کے سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کی ایک لازمی صفت ہونے کا دعویٰ بھی اسی دعوے پر مبنی ہے۔ اگر حاصل اور لاگت کے درمیانی فصل کی پیداوار میں محنت کے علاوہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۳) ــــ نہ کوئی اور مؤقف ایسا کر سکتا ہے ــــ جن کا وہ سماجی طور پر خود مخلوق ہے اور رہتا ہے، خواہ وہ داخلی طور پر خود کو ان سے کتنا ہی بلند کیوں نہ کرے۔"

(Karl Marx : Capital Vol I, p. 10 Moscow—1954)

حاشیہ صفحہ ہذا: [۱] : فریڈرک انجلز۔ بحوالہ بالا۔ صفحہ ۲۷ - ۱۳۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے عوامل پیدائش، زمین، سرمایہ اور کاروباری جدّوجہد کا دخل بھی ثابت ہو جائے تو بات بالکل بدل جاتی ہے۔

پھر اصل مسئلہ یہ ہو گا کہ اس فاضل قدر میں سے دوسرے عوامل پیدائش کے ساتھ مزدور کو بھی مناسب حصّہ ملنا چاہیے۔ اس صورت میں استحصال کے معنی یہ ہوں گے کہ مزدور کو اس فاضل پیداوار میں سے کوئی حصّہ نہ ملے، یا وہ اپنا مناسب حصّہ نہ حاصل کر سکے۔ اگر سرمایہ دار کی کاروباری جدّوجہد اور تنظیمی کوششوں کو اس فاضل قدر کے پیدا کرنے میں کوئی دخل ہے تو اسے جائز طور پر اس میں سے ایک حصّہ مل سکتا ہے۔ مزدور کو اس فاضل قدر میں سے مناسب حصّہ دے دینے کے بعد بھی سرمایہ دار کے پاس کچھ بچ رہے گا، اور اس آمدنی پر اکتفا کر کے وہ مزدور کے استحصال سے باز رہ سکتا ہے۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ مسابقت کا دباؤ لازماً اسے استحصال پر مجبور کر دے گا۔ مسابقت کا دباؤ اسی حد تک مؤثر ہو سکتا ہے جس حد تک تمام سرمایہ دار اسے پیدا کریں گے اور مؤثر بنائیں گے۔ اگر تمام سرمایہ دار مزدور کو اس کی پیداوار میں سے مناسب حصّہ دینے پر آمادہ ہوں تو وہ لاگت میں کمی کے لیے دوسری صورتیں تلاش کریں گے۔ چند بُرے لوگ اگر اس شریفانہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے پر اُتر آئیں تو مزدور کی منظّم طاقت یا تمام عوام کی نمائندہ ریاست ان کو حدود کے اندر رہنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اس کے لیے قانون کی طاقت بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ مارکس کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ عملاً یہ دونوں صورتیں مزدوروں کی منظّم قوت اور حکومت کے قوانین — سرمایہ دارانہ مسابقت کے بُرے نتائج کو کم کرنے میں کافی مؤثر ثابت ہوئی ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں نظریۂ استحصال سے وہ جبریت دور ہو جاتی ہے جو مارکس کے یہاں ہمیں ملتی ہے۔ سرمایہ دار استحصال کے لیے مجبور نہیں نظر آتا۔ استحصال کا مسئلہ اوّلاً ایک اخلاقی مسئلہ بن کر سامنے آتا ہے۔ سرمایہ دار استحصال کرنے پر مجبور نہیں، وہ استحصال سے باز رہتے ہوئے بھی پیداواری عمل کو جاری رکھ سکتے اور ترقی دے سکتے ہیں۔ دوسرے مقام پر یہ مسئلہ اجتماعی نگرانی اور قانونِ حکومت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت ختم کیے بغیر بھی مزدوروں کے استحصال کا دروازہ بند کیا جا سکتا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشیاء کی قدر کے صرف محنت سے متعین ہونے اور اس پر مبنی قدر زائد کے نظریہ کی صداقت پر صرف وہی لوگ مطمئن ہو سکتے ہیں جو ان نظریات کو انقلابی اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ مارکس نے اس نظریہ کے حق میں کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے۔ اس کی ضخیم تصنیف "سرمایہ" میں اگر کوئی دلیل ملتی ہے تو صرف یہ کہ اگر دو مختلف چیزیں بازار میں برابر داموں پر فروخت ہوتی ہیں تو ان کے درمیان کوئی نہ کوئی چیز مشترک ہونی چاہیے جو دونوں کو برابر قرار دینے کی بنیاد بن سکے۔ چونکہ مختلف اشیاء کے فوائد استعمال جس کو مارکس قدر استعمال (Use Value) کہتا ہے، مختلف ہوتے ہیں لہٰذا مساوی قدر مبادلہ (Exchange Value) کی بنیاد صرف محنت ہو سکتی ہے جو دونوں چیزوں کے درمیان مشترک ہے، کیونکہ تمام چیزیں محنت کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہیں[1]۔ لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ جدید نظریۂ قدر کی روشنی میں مختلف اشیاء کے درمیان مشترک چیز صرف وہ تشفی (Satisfaction) ہے جو اشیاء صارفین کو عطا کرتی ہیں۔ صارفین کو جن اشیاء سے برابر تشفی حاصل ہوتی ہے ان اشیاء کے دام بازار میں برابر ہوتے ہیں۔ اشیا کے دام طے کرنے کے سلسلہ میں فیصلہ کن چیز ان کی طلب ہے اور طلب کے پیچھے کام کرنے والی قوت صارفین کی ترجیحات (Rreferences) ہیں۔ اس کے علاوہ قدر کے نظریۂ محنت میں زبردست منطقی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ عمل پیدائش میں کاروباری جدوجہد، سرمایہ اور زمین جو اہم حصہ لیتے ہیں ان کا وزن بھی اس نظریہ میں نہیں تسلیم کیا گیا ہے۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے کام لے کر ان عوامل کی پیدا آوری سے انکار کر نا ممکن نہیں۔ اور ان کی پیدا آوری تسلیم کر لینے کے بعد قدر زائد کا نظریہ بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔ مارکس کے اپنے بیانات بھی ان کی پیدا آوری کو تسلیم کرتے نظر آتے ہیں۔ مسز جون رابنسن نے ٹھیک کہا ہے کہ :

---

[1] ملاحظہ ہو : (Karl Marx : Vol. I, p. 137 Moscow—1954)

مارکس کے اس ثبوت کے تنقیدی جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو : (E. V. Bohm Bowerk
Capital and interest pp. 379 —90
Kelly & Millman, Inc ; Newyork, 1957

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"مارکس نے اپنے تجزیاتی آلات کو اس رائے پر زور دینے کے لیے استعمال کیا ہے کہ صرف محنت ہی پیدا آوروانفع ہوتی ہے۔ فی نفسہٖ یہ صرف ایک لفظی بحث ہے زمین اور سرمایہ کچھ بھی "قدر" نہیں پیدا کرتے کیونکہ قدر وقت کے حساب سے محنت (LABOURE TIME) کی پیداوار ہے۔ لیکن زرخیز زمین اور کارآمد مشینیں اصل پیداوار کے حساب سے محنت کی پیدا آوری بڑھانے کا باعث بنتی ہیں۔ اور بلاشبہ "سرمایہ میں محنت کی پیدا آوری بڑھانے کا میلان اور اس جانب ایک مستقل رجحان پایا جاتا ہے (سرمایہ (انگریزی) جلد اوّل۔ صفحہ ۳۴۷)۔۔۔

۔۔۔۔ خواہ ہم یہ کہنا پسند کریں کہ سرمایہ پیدا آوروانفع ہوا ہے یا یہ کہ سرمایہ محنت کو پیدا آور بنانے کے ضروری ہے بات وہی رہتی ہے۔"[۱]

ظاہر ہے کہ اگر قدر زائد کی تخلیق میں سرمایہ، یا سرمایہ کی مدد کو بھی دخل ہے تو اسے پورا کا پورا مزدور کا حق نہیں قرار دیا جا سکتا۔

قدر زائد کا تصور اس نظریہ پر مبنی ہے کہ خود محنت کی قدر بھی محنت کے پیمانہ سے ناپی جا سکتی ہے۔ لیکن:

"قدر کے نظریہ محنت کو اگر ہم دوسری اشیاء کے لیے درست تسلیم کر سکتے تو بھی اس کا اطلاق خود محنت نامی شے پر کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا ایسا کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ مزدور بھی مشینوں کی طرح لاگت کا ٹھیک ٹھیک حساب کر کے تیار کیے جا رہے ہیں۔ چونکہ ایسا نہیں ہو رہا ہے لہٰذا یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ قوتِ محنت (LABOURE POWER) کی قدر اُن انسانی گھنٹوں (Man hours) کے متناسب ہوگی۔

---

[۱]: (Mrs. Joan Robinson: An Essay on Marxian Economics p. 17-18 Macmullan & Co., London—1949)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو اس کی پیدائش میں لگتے ہیں"۔[۱]

پیداواری عمل میں مختلف عواملِ پیدائش کا اشتراک یکساں ضروری اور اہم واقع ہوا ہے کسی ایک عاملِ پیدائش کی غیر موجودگی سے پیداواری عمل معطل ہو سکتا ہے، اور کسی عامل کے مطلوبہ تناسب میں نہ حاصل ہو سکنے سے بھی پیداوار پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ ایک عامل کی مناسب مقدار میں موجودگی دوسرے عوامل کی کارکردگی پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ ان حقیقتوں کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر عامل پیداوار کے حصول میں ایک اہم حصہ لیتا ہے۔ البتہ یہ معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں کہ کس عامل کو تخلیقِ قدر میں کتنا دخل ہوتا ہے[۲]۔ ایک تو ایسا کرنے کا واحد طریقہ، یعنی مارجنل پیدا آوری کا نظریہ، بہت محدود اور مخصوص حالات ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے، اور دوسرے پیداوار کی قدر متعین کرنے میں بازار کے بدلتے ہوئے حالات کو اتنا دخل ہے کہ عواملِ پیدائش کی مارجنل قدری پیدا آوری (Marginal Value Productinity) کو پیداواری عمل میں ان کے واقعی حصہ کا پیمانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ہم پیدا شدہ قدر کے علیحدہ علیحدہ حصے کر کے ان کی تخلیق کو مختلف عواملِ پیدائش کی طرف الگ الگ نہیں منسوب کر سکتے۔

جس چیز کو قدرِ زائد یا فاضل قدر کہا گیا ہے وہ لاگت اور حاصل کے درمیان فرق کا نام ہے۔ اس کی مقدار کتنی ہے اس کا انحصار اس پر ہے کہ ہم مجموعی قدر میں سے لاگت کے طور پر کتنا گھٹاتے ہیں۔ چونکہ لاگت دراصل عواملِ پیدائش کے معاوضوں کا نام ہے اس لیے اس ضمن میں اسے کوئی معلوم اور متعین چیز فرض کرنا دشوار ہے۔ چونکہ یہی معاوضے زیرِ بحث ہیں لہٰذا یہ کہنا کہ لاگت اجرت، اخراجات فرسودگی (Depreciation)، زرِ کرایہ وغیرہ

[۱] (Joseph A. Schumpeter : Capitalism, Socialism and Democracy, p. 27, George Allen & Unwin, London— 1950)

[۲] (E. Ronald Walker : From Economic Theory to Policy, p. 114, University of Chicago Press —1942)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مجموعہ کا نام ہے۔ مزید تجزیہ میں کوئی معاونت نہیں کر سکتا[1]۔

یہی نہیں کہ قدرِ زائد کا نظریہ دلائل کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جا سکا بلکہ جن معنی میں مارکس یہ اصطلاح استعمال کرتا ہے اس کے پیشِ نظر اطمینان کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدرِ زائد کی پوری مقدار کبھی، کسی حال میں بھی، مزدور کے حوالہ نہیں کی جا سکتی۔ تعلقاتِ پیدائش (Relations of Production) کی جو شکل بھی تجویز کی جائے، مزدور کو قدرِ زائد کا ایک حصہ ہی مل سکتا ہے، پوری قدرِ زائد نہیں مل سکتی۔ اگر مزدور کو اس قدرِ زائد کے ایک حصہ سے محروم کرنے کا نام استحصال بے جا ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسانی زندگی کو اس طرح کے استحصال سے پاک کرنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ قدرِ زائد ہی وہ خزانہ ہے جس سے عملِ پیدائش میں حصہ لینے والی دوسری پیداآور خدمات کے بہم پہنچانے والوں کو کچھ معاوضہ مل سکتا ہے۔ یہی زائد ہے جس میں سے ایک حصہ بچا کر آئندہ عملِ پیدائش میں لگانے کے لیے محفوظ

---

[1]: مارکس کے نظریۂ قدرِ زائد کا تنقیدی جائزہ لینے میں ہم نے اس بات سے صرفِ نظر کر لیا ہے کہ قدر (Value) کا کوئی معروضی (Objective) تصور جیسا کہ نظریۂ محنت یا لاگتِ پیداوار کے نظریہ (Cost of Production Theory) میں مضمر ہے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ جن قارئین کو علمِ معاشیات کے مطالعہ کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی واقف ہوں گے کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے علمی دنیا نے قدر کے معروضی تصور کو ترک کر کے ایک موضوعی نظریۂ قدر (Subjective Theory of Value) اختیار کر لیا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے اشیاء کی قدر کی تعیین صارفین کی ترجیحات کرتی ہیں۔ عواملِ پیدائش، یعنی محنت اور دوسری پیداواری خدمات کی قدریں ان اشیاء کی موضوعی قدر سے ماخوذ ہوتی ہیں جن کی پیداوار میں وہ حصہ لیتی ہیں۔ محنت یا کسی بھی عاملِ پیدائش کے لیے "قدر" کی تخلیق کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نظریہ کی روشنی میں قدرِ زائد کا تصور ہی سرے سے مہمل ہے لیکن ہم نے مارکس پر تنقید کرنے میں یہ مناسب سمجھا ہے کہ علمی تصورات کے اس دائرے میں رہتے ہوئے بھی اس کی کمزوریاں واضح کر دیں جن کے اندر رہتے ہوئے یہ نظریہ مرتب کیا گیا تھا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ترقی رک جائے گی اور نظام پیدائش دولت جس میں وسیع پیمانہ پر اور طویل مدتوں کے لیے سرمایہ لگانا ضروری ہے، نہ چل سکے گا۔ ان حقائق کے پیشِ نظر ایک مثالی اشتراکی سماج میں بھی مزدور کو پوری قدر زائد نہیں مل سکتی۔ کاروبار کو چلانے والے منتظمین، غیر پیدا آور خدمات بجا لانے والے کارکنوں، اور زمین اور سرمایہ کے مالک، ریاست کے ملازمین اور کارکنوں کو تنخواہیں وہاں بھی اسی قدر زائد میں سے دی جا سکتی ہیں۔ وہاں بھی معاشی ترقی اور توسیع کے لیے وسیع پیمانہ پر سرمایہ کاری ضروری ہے اور اس کے لیے مزید سرمایہ اسی فاضل قدر ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مارکس نے خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، اگرچہ گول مول طریقہ پر، ضروری محنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مارکس لکھتا ہے:

> "اگر دن بھر کے اوقاتِ کار سکڑ کر اسی عرصہ[۵۱] تک محدود ہو جائیں تو قدر زائد ختم ہو جائے گی۔ مگر یہ ایک ایسی منزل ہے جس تک پہنچنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سرمایہ کا دور دورہ ہے۔ اوقاتِ محنت کو ضروری محنت کی حد تک محدود کرنے کا واحد طریقہ سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کا خاتمہ ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی مؤخر الذکر[۵۲] کے حدود میں وسعت پیدا ہو گی کیونکہ ایک طرف تو ضروریاتِ زندگی کا تصور کافی وسیع ہو جائے گا اور مزدور ایک بالکل دوسرے ہی معیارِ زندگی کے طالب ہوں گے اور دوسری طرف آج جو محنت زائد شمار ہوتی ہے اس کا ایک حصہ اس صورت میں ضروری محنت شمار کیا جانے لگے گا۔ میری مراد اس محنت سے ہے جو تا محفوظ رکھنے اور سرمایہ اکٹھا کرنے کیلئے فنڈ مہیا کرنے کی خاطر درکار ہو گی۔"[۵۳]

۵۱: یعنی اتنا وقت جتنا مزدور کے لیے ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے کے لیے درکار ہے۔ (صدیقی)

۵۲: یعنی ضروری محنت اور ضروری اوقاتِ کار۔ (صدیقی)

۵۳: کارل مارکس۔ بحوالہ بالا۔ صفحہ ۵۳۰۔ نیز غیر سرمایہ دارانہ معیشت میں قدر زائد کے وجود اور تصرف کے لیے ملاحظہ ہو، سرمایہ، جلد اوّل صفحہ ۵۱۱، اور جلد سوم (ماسکو ایڈیشن ۱۹۵۹) صفحات ۸۲۶ اور ۸۵۵۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آخری جملہ بہت معنی خیز ہے۔ جدید دور میں پیدائشِ دولت کے لیے ایک کثیر فنڈ کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ فنڈ عملِ پیدائش شروع ہونے سے پہلے ہی موجود ہونا چاہیے۔ یہ فنڈ کہاں سے آئے؟ اس کا ایک ہی طریقہ ممکن ہے، اور وہ یہ کہ پہلے کی پیدا کی ہوئی قدر میں سے کچھ بچا کر رکھ لیا جائے یہ کام کون کرے۔ اس کا بھی ایک ہی معقول اور ممکن جواب ہو سکتا ہے: وہ جسے پیدائشِ دولت کا عمل جاری رکھنے کی فکر ہو۔ آزاد معیشت میں اس کی فکر کاروباری افراد کو ہوتی ہے۔ اشتراکی نظام میں ریاست کو، ہر صورت میں یہ ضروری ہے کہ پیدا شدہ قدر کا ایک حصہ آئندہ عملِ پیدائش میں لگانے کے لیے بچا لیا جائے۔ اگر عملِ پیدائش کی توسیع و ترقی مطلوب ہو، جیسا کہ بڑھتی ہوئی آبادی اور معیارِ زندگی کو بلند تر کرنے کی خواہش کے پیشِ نظر ضروری ہے، تو اس فنڈ کو بھی روز افزوں ہونا چاہیے۔ اگر ساری قدر محنت کی پیدا کردہ ہوتی ہے تو مزدور کو بہر حال اپنی پیدا کی ہوئی قدر کے ایک حصہ سے محروم ہونا پڑے گا۔ خواہ پیداواری عمل کے نگران اور منتظم افراد ہوں یا حکومت۔ مارکس مزدوروں کو یہ تسلّی دے سکتا ہے کہ اشتراکی نظام مزدوروں کو ان کی پیداوار کے ایک حصہ سے محروم کرنے میں ان ہی کے اجتماعی مصالح اور مستقبل کی تعمیر کو سامنے رکھتا ہے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ باقی رہے گی مزدور کو پیداوار کے ایک حصہ پر ذاتی تصرف سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

مارکس کے مذکورہ بالا بیان سے اس کی فکر کے دو اہم تضاد سامنے آتے ہیں جن کی طرف اشارہ برمحل ہو گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ 'ضروری محنت' کو جو مزدوروں کے لیے ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے کی خاطر درکار ہے، ایک متعین چیز سمجھنے کی جگہ لچکدار اور پھیلنے والی چیز تسلیم کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ضروری محنت اور قوت جو محنت کی اصل قدر متعین کرتی ہے خود غیر متعین ہے تو قدر زائد بھی ایک غیر متعین چیز ہو جاتی ہے اور محنت پر مبنی نظریہ قدر عدمِ تعین کا شکار ہو جاتا ہے۔

دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قدر زائد کا ایک حصہ اگر سرمایہ دار روک لیتا ہے تو یہ مارکس کے نزدیک بدترین جرم ہے لیکن یہی حصہ اگر اشتراکی حکومت روک لے، تاکہ سرمایہ کاری کے لیے فنڈ فراہم ہو اور غیر پیدا آور کارکنانِ معیشت کو تنخواہیں دی جا سکیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو یہ نہ صرف درست بلکہ باعث برکت قرار پاتا ہے۔ اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصل اہمیت کی حامل یہ بات نہیں ہے کہ مزدور کو قدر زائد کے ایک حصّہ سے محروم کیا جاتا ہے یا نہیں، بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ جو حصّہ مزدور کو نہیں ملتا وہ کن مقاصد کے لیے صرف ہوتا ہے۔ اگر افراد کے ہاتھوں میں رہتے ہوئے بھی یہ منافع عام معیار زندگی کو بلند کرنے، پیدائش دولت کا عمل جاری رکھنے، کاروبار پیدائش کے لیے ضروری خدمات مہیا کرنے اور معاشی ترقی کے لیے مزید سرمایہ کاری میں استعمال ہو تو مارکسی مفکّرین کو اصولاً کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

مزید تفصیلات میں گئے بغیر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مارکس کا نظریۂ استحصال بہت زیادہ مبالغہ آمیز ہے۔ اس کے فکر سے اگر تضاد اور مبالغہ دور کر دیا جائے تو صرف اتنی بات باقی رہتی ہے کہ سرمایہ دارانہ طریقۂ پیدائش سرمایہ دار کو مزدور کے استحصال بے جا کا موقع فراہم کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ استحصال ایک امکان ہے جسے واقعہ کا جامہ پہنانے کے لیے سرمایہ دار کا اپنا ارادہ ضروری ہے۔ استحصال چند مخصوص تعلقات پیدائش کے طبعی اور لازمی نتیجہ کے طور پر نہیں ظاہر ہوتا، جیسا کہ مارکس کا خیال ہے، بلکہ اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار سرمایہ دار افراد کی نیّت اور کردار پر ہے۔ سرمایہ دارانہ اور ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیّت سرمایہ دار کو صرف اس بات کا موقع عطا کرتی ہے کہ وہ مزدور کو مناسب سے کم اجرت دے کر اس کا استحصال کر سکتا ہے، لازماً یہی نتیجہ سامنے نہیں لاتی۔ مسز جون رابنسن نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ:

"مارکس کے اپنے استدلال کی روشنی میں قدر کا نظریہ محنت قیمتوں کا کوئی نظریہ دینے سے قاصر ہے۔ بہرحال اس نے اس نظریہ کو سرمایہ دارانہ نظام کے مزاج کے بارے میں بعض خیالات کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے اور ان خیالات کی اہمیت کسی طرح بھی ان اصطلاحوں پر منحصر نہیں جن میں اس نے انہیں بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے مارکس یہ واضح کرتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا انحصار مزدوروں کے ایک ایسے طبقہ کے وجود پر مبنی ہے جو اپنی قوت محنت فروخت کرنے کے علاوہ اپنے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گذارے کے لیے کوئی اور ذریعہ نہیں رکھتے۔ سرمایہ دارانہ نظام پہلے کسانوں اور کاریگروں کو آلاتِ کار سے محروم کر دیتا ہے۔ پھر ان کی محنت کا استحصال کرتا ہے استحصال کا امکان مجموعی خالص پیداوار (TOTAL NET PRODUCT) اور مزدوروں کی کم سے کم ضروریاتِ زندگی کے درمیان ایک فصل موجود ہونے پر مبنی ہے[1]"

ظاہر ہے کہ ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت سے استحصال کا امکان پیدا ہونے میں اور اس سے ایک فطرتی نتیجہ کے طور پر استحصال کے لازماً واقع ہونے میں بڑا فرق ہے۔ اگر حقیقت کے مطابق پہلی بات ہے نہ کہ دوسری تو سرمایہ دارانہ نظام پر مارکس کی تنقید اس کے دعویٰ کے علی الرغم سرمایہ داروں کی اخلاقی حالت اور ان کے کردار پر تنقید بن جاتی ہے حقیقت یہی ہے، مگر مارکس کو ایک اخلاقی مصلح کا مقام اختیار کرنا پسند نہ تھا۔ اس نے ایک ماہر معاشیات کی حیثیت سے امر واقعہ کا تجزیہ کرنے والے کی حیثیت زیادہ پسند کی اور استحصال کو ایک مخصوص طریقۂ پیداوار کے قدرتی اور لازمی نتیجہ کے طور پر پیش کیا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جو لوگ سماج سے استحصال کی لعنت دور کرنا چاہتے ہوں، بالخصوص وہ طبقہ جو اس سرمایہ دارانہ استحصال کا شکار ہو، وہ یہ سمجھنے لگیں گے کہ صورتِ حال کا واحد علاج اس مخصوص طریقۂ پیدائش اور نظامِ ملکیت کو ختم کر دینے میں مضمر ہے نہ کہ معاشرہ کی اخلاقی اصلاح میں یا قانون کے ذریعہ غیر منصفانہ کاروباری طریقوں پر پابندیاں عائد کرنے میں۔ اگر عوام استحصال بے جا کو سرمایہ داروں کی اخلاقی پستی اور ان کے فسادِ نیت کا نتیجہ سمجھتے تو وہ یہ بھی سمجھ لیتے کہ صورتِ حال کا علاج ظاہری رشتوں اور ڈھانچہ کی تبدیلی نہیں بلکہ اخلاقی حالت اور نیت کی تبدیلی چاہتا ہے، کیونکہ اخلاقی مفاسد کا علاج صرف ظاہری رشتوں کی تبدیلی سے نہیں ہو سکتا۔

لیکن مارکس کا غائر مطالعہ کرنے والا ہر طالب علم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام پر اس کی اصل تنقید ایک اخلاقی تنقید ہے۔ رہا مارکس کا نظریۂ محنت

---

[1] مسز جون رابنسن۔ بحوالۂ بالا۔ صفحہ ۱۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس پر تعمیر کردہ استدلال کی پوری عمارت تو اس کے بارے میں خوب کہا گیا ہے کہ:

"مارکس کے استدلال کا کوئی بھی خاص نکتہ نظریۂ محنت پر مبنی نہیں ہے۔ وولٹیر (Voltaire) نے کہا تھا کہ بھیڑوں کے ایک گلہ کو چھومنتر کے ذریعہ ہلاک کر دینا بہت آسان ہے بشرطیکہ آپ اُسی وقت ان کو کافی مقدار میں سنکھیا بھی کھلا دیں۔ اس تمثیل میں بھیڑوں کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام کے بھولے بھالے حامیوں کو رکھ دیجیے، مارکس کی گہری بصیرت اور ظلم سے شدید نفرت سنکھیا کا کام کرتی ہے اور نظریۂ محنت چھومنتر کا۔"[۱]

پیداواری رشتوں کی ظاہری ہیئت جو بھی ہو استحصال کا "امکان" بہرصورت موجود رہتا ہے۔ یہ سوچنا کہ ذرائع پیداوار کی ملکیت افراد کے بجائے ریاست کی طرف منتقل کر دینے سے استحصال کا امکان ختم ہو جائے گا محض خام خیالی ہے۔ پیداواری رشتے جو بھی ہوں سماج میں چند افراد ہی ہوتے ہیں جو اہم پیداواری فیصلے کرتے ہیں، جن کے مطابق دولت پیدا کرنے اور تقسیم کرنے کا عمل انجام پاتا ہے۔ ان افراد کے ہاتھوں میں عام افراد کی بہ نسبت زیادہ معاشی طاقت ہوتی ہے۔ یہ افراد اگر پیداواری عمل میں شریک ہونے والے دوسرے گروہوں کا استحصال کرنے پر آمادہ ہوں تو ایسا کر سکتے ہیں۔ آزاد معیشت میں یہ طاقت زمینداروں، سرمایہ داروں، اور بڑے بڑے کاروباری اداروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بعض اوقات مزدوروں کی منظم انجمنیں بھی غیر معمولی معاشی طاقت حاصل کر لیتی ہیں جس کے ہاتھ میں بھی ایسی طاقت ہو وہ پیداواری عمل کے نسبتاً کمزور شرکا کو غیر منصفانہ شرائط پر کام کرنے پر مجبور کر کے ان کا استحصال کر سکتا ہے۔ اشتراکی سماج میں بھی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عام افراد اور مزدوروں کی بہ نسبت غیر معمولی معاشی طاقت کے مالک ہوتے ہیں۔ حکمران جماعت کے سربرآوردہ افراد اور عمّالِ حکومت اہم امور کے بارے میں فیصلہ کرنے اور ان فیصلوں کو نافذ کرنے کا کلیدی عمل انجام دیتے ہیں۔ معاشی طاقت کے پہلو بہ پہلو ان کے ہاتھوں میں غیر معمولی سیاسی طاقت بھی ہوتی ہے۔ اگر یہ گروہ ایسے فیصلے کرنا چاہے

---

[۱]: مسز جون رابنسن۔ بحوالۂ بالا۔ صفحہ ۲۲۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جن سے مزدوروں اور عوام کی طرف قومی پیداوار کے نسبتاً کم حصے منتقل ہوں تو انہیں ایسا کرنے کا پورا موقع حاصل ہوتا ہے۔ جہاں بھی ایک گروہ کے ہاتھوں میں دوسرے گروہوں سے زیادہ معاشی اور سیاسی طاقت موجود ہو تو وہاں استحصال کا امکان بھی موجود ہے۔ جہاں ان دونوں طاقتوں کا اجتماع جتنا زیادہ ہوگا یہ امکان بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں بڑے بڑے اجارہ داروں کو اور ان سے زیادہ اشتراکی نظام میں حکومت اور "پارٹی" کے سربرآوردہ افراد کو آج اس طرح کے مواقع حاصل ہیں۔ اجارہ داری ختم کردی جائے یا اشتراکی حکومت کو زیادہ سے زیادہ غیر مرکزی (Decentralised) بنا دیا جائے تو استحصال کے امکانات اتنے قوی نہیں رہ جائیں گے لیکن پھر بھی باقی رہیں گے مختصر یہ کہ سماج کا کوئی عملی نقشہ نہیں تجویز کیا جاسکتا جس میں کسی فرد کو دوسرے فرد کے استحصال کا موقع ہی نہ حاصل ہو۔ انسانی زندگی سے استحصال کا امکان کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس بات کی کوشش کی جاسکتی ہے کہ یہ امکان عمل کا جامہ نہ پہن سکے، اور لوگ استحصال کے مواقع حاصل ہوتے ہوئے بھی استحصال سے باز رہیں۔ یہی اصل مسئلہ ہے۔

مارکس کائنات اور حیات کے بارے میں جس مادی فلسفہ پر ایمان لاچکا تھا اس کی وجہ سے اسے مسئلہ پر اس زاویۂ نگاہ سے غور کرنے کی توفیق نہ ہوسکی۔ اس بارے میں اس کا فکر ایک زبردست تضاد کا شکار رہا۔ ایک طرف تو وہ یہ کہتا ہے کہ سرمایہ دار استحصال پر مجبور ہے اور داخل کی کوئی اصلاح سرمایہ دار سے استحصال کی لعنت دور نہیں کرسکتی۔ دوسری طرف وہ یہ سمجھتا ہے کہ ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت کے بعد استحصال لازماً ختم ہوجائے گا، حالانکہ یہ شکل معاشی اور سیاسی طاقت کو ایک ادارہ میں مرکوز کرکے استحصال کے امکانات میں اضافہ کردیتی ہے۔ آخر کس دلیل سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اشتراکی ریاست کے ارباب کار ان مواقع سے ہرگز فائدہ نہیں اٹھائیں گے؟

(ج) انفرادی ملکیت کا پیداواری عمل میں نراج پیدا کرنا:

تمام ذرائع پیدائش کو اجتماعی ملکیت میں رکھنے کے حق میں یہ دلیل بھی دی گئی ہے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ مشینی دور میں آلاتِ پیدائش کی انفرادی ملکیت پیداواری عمل میں تاراج (Anarchy of Production) پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے[۵]۔ جب آلاتِ پیدائش کی ملکیت اور پیداواری قوتوں پر قابو الگ الگ افراد کے ہاتھوں میں ہوتا ہے تو عمل پیدائش علیحدہ علیحدہ کاروباری اداروں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ اس شکل میں کوئی ایسا ادارہ نہیں ہوتا جو ان کاروباری اداروں کی مجموعی پیداوار کو سماج کی مجموعی ضرورت یا مجموعی طلب سے ہم آہنگ رکھے۔ نتیجہ میں کبھی ضرورت سے زیادہ مال پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی کم۔ دونوں صورتیں مضر اثرات کی حامل ہیں۔ پہلی صورت میں، جب ضرورت سے زیادہ سامان پیدا کیا گیا ہو سرمایہ داروں کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ رسد میں اضافہ کے سبب قیمتیں کم ہو جائیں اور ان کا نفع کم ہو جائے۔ چنانچہ وہ تیار شدہ مال کے ایک حصّہ کو تلف کرنے، یا دوسرے ممالک میں کم داموں پر کھپانے (Dumping) اور اس مقصد کے لیے دوسرے ممالک پر قبضہ جما کر ان کو اپنے مال کے لیے ایک نفع بخش منڈی میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح سرمایہ داروں کے بطن سے سامراجیت جنم لیتی ہے جس کے مفاسد ظاہر ہیں۔ دوسری صورت میں ضرورت سے کم مال پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سماج کی ضروریات نہ پوری ہوں اور رسد میں کمی کے سبب قیمتیں بڑھ جائیں اور سرمایہ دار کو بے جا نفع اندوزی کا موقع ملے۔

اس لانظمی سے قومی وسائل کا بے جا استعمال بھی ہوتا ہے جو کسی طرح مناسب نہیں سماج کا مفاد یہ چاہتا ہے کہ اس کے پیداواری وسائل کو کفایت شعاری کے ساتھ اس کی حقیقی ضروریات کی تکمیل پر صرف کیا جائے۔ آزاد معیشت حسبِ ضرورت اشیا پیدا کرنے اور ان کی مناسب تقسیم عمل میں لانے سے قاصر رہی ہے، اور ایسا ہونا لازمی ہے۔ بازار میں جو چیز مؤثر ہوتی ہے وہ خریداروں کی تعداد نہیں بلکہ قوتِ خرید ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں قوتِ خرید کی تقسیم بہت ناہموار ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زر کے اعتبار سے مجموعی طلب (Total Money Demand) سماج کی حقیقی ضروریات کی ترجمانی نہیں کرتی۔ مزید برآں سرمایہ دار کاروباری کو صرف اپنے ذاتی نفع کی فکر ہوتی ہے، قومی

---

[۵] : فریڈرک اینجلز : بحوالۂ بالا۔ صفحہ ۱۴۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معیشت کے مستقل، طویل المیعاد، اور بنیادی مفادات کے تحفظ کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ انہیں ملک کی معیشت کو تدریجاً ترقی دینے، اسے مستحکم اور پائیدار بنانے، اور عوام کے معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرتے رہنے سے براہِ راست کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

جدید پیداواری قوتوں کا تقاضا ہے کہ عملِ پیدائش کی تنظیم بڑے پیمانہ پر عمل میں لائی جائے۔ پیمانۂ کبیر پر پیداوار عمل میں لانے سے اخراجات میں کفایت ہوتی ہے اور لاگت کم آتی ہے۔ اس طرح کاروبار سے زیادہ نفع حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے سرمایہ داروں کا رجحان اجارہ داری کی طرف ہوتا ہے۔ باہمی معاہدوں یا حریفوں کو مسابقت میں شکست دے کر کاروبار چھوڑنے پر مجبور کر کے اجارہ دارانہ ادارے قائم کیے جاتے ہیں اور بالآخر ملک کا بیشتر پیداواری کاروبار چند بڑے بڑے اجارہ داروں کے ہاتھوں میں سمٹ آتا ہے۔ یہ خودغرض اجارہ دار ملکی معیشت کے سیاہ و سپید کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ ان کی غیر معمولی معاشی طاقت ان کو استحصال کے بیش از بیش مواقع دیتی ہے۔ یہی اجارہ داریاں سامراجیت کو تقویت بخشتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ مسابقت اجارہ داری میں اور اجارہ داری سامراجیت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں ایک قوم دوسری قوم کا استحصال کرتی ہے اور آئے دن جنگیں ہوتی رہتی ہیں۔

پیداواری عمل میں تاراج، ضروریات کی عدم تکمیل، قومی وسائل کے ضیاع اور اجارہ داری اور سامراجیت کی لعنتوں کو دور کرنے کی شکل جدید اشتراکی مفکرین کے نزدیک صرف یہ ہے کہ ذرائع پیداوار اجتماعی ملکیت قرار پائیں اور پیدائشِ دولت ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت عمل میں لائی جائے جسے سماج کی جملہ ضروریات و مصالح کا لحاظ رکھتے ہوئے مرکزی طور پر مرتب اور نافذ کیا جائے۔ دولت کی پیدائش، اس کی تقسیم اور اس کے صرف کو مناسب طریقہ پر عمل میں لانے کی واحد شکل یہی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ قومی معاشی ترقی تیز رفتاری کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔ آزادی کاروبار پر مبنی معیشت میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

جہاں تک منصوبہ بندی کی ضرورت کا سوال ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔ دورِ جدید میں پیداواری قوتوں کی نوعیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ معاشی ضروریات کی تکمیل اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مستقبل میں معاشی ترقی کا بندوبست ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت عمل میں لایا جائے۔ اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ آزاد معیشت میں دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے صرف قدرتی عوامل اور بازار کی قوتوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لیے بھی اجتماعی تدبیریں ضروری ہیں۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی حرص کاروبار کو اجارہ دار بناتی ہے۔ اور اجارہ داری ملکی اور بین الاقوامی معیشت پر برے اثرات مرتب کرتی ہے۔ ان تمام امور کی طرف توجہ کرنا اور فساد کا سدّباب کرنا ہر جدید معیشت کا اوّلین فرض ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لیے ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت ضروری ہے۔

جس طرح کی منصوبہ بندی اشتراکیت کے پیش نظر ہے وہ مرکزی، ہمہ گیر، اور پیداوار اور ذرائع پیداوار کی مادی شکلوں کی منصوبہ بندی (Centralised Total Physical Planning) ہے۔ اس طرح کی منصوبہ بندی کرنے اور اسے کامیابی کے ساتھ نافذ کرنے کے لیے ذرائع پیداوار کا حکومت کے قبضہ و اختیار میں ہونا ضروری ہے۔ لیکن پیدائش دولت کو معاشرہ کی ضروریات سے ہم آہنگ بنانے، وسائل قومی کے مناسب استعمال، دولت کی منصفانہ تقسیم اور معاشی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کی یہ انتہائی شکل اختیار کرنا چنداں ضروری نہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے منصوبہ بندی کی وہ درمیانی شکلیں بھی کافی ہیں جن کیلئے تمام ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت ضروری نہیں۔ موجودہ دور میں بہت سے ممالک کامیابی کے ساتھ ایسی منصوبہ بندی کا تجربہ کر رہے ہیں جو بیشتر ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت پر مبنی ہے۔ چند ناگزیر کلیدی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے کر، پورے نظام پیداوار کو مختلف درجوں میں اجتماعی رہنمائی اور کنٹرول کے تحت رکھتے ہوئے مذکورہ بالا مقاصد کو کما حقہٗ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی منصوبہ بندی کے ساتھ اگر عام کاروباریوں میں اجتماعی مفاد کا لحاظ پیدا ہو جائے اور وہ اپنی پالیسیاں وضع کرتے وقت اجتماعی ضروریات و مصالح اور مستقبل کے مفادات پر بھی نگاہ رکھیں تو کامیابی زیادہ یقینی ہو جاتی ہے۔ اگر عام افراد میں عموماً اور کاروباریوں اور اصحاب سرمایہ میں خصوصاً اجتماعی مقاصد کے حصول کے لیے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باہمی تعاون کا جذبہ پیدا کیا جا سکے اور لوگ منصوبہ کی تکمیل کے لیے حکومت کے ساتھ مخلصانہ تعاون کریں تو ایک ملی جلی معیشت [redacted] میں محدود قسم کی منصوبہ بندی بھی بہترین نتائج سامنے لا سکتی ہے۔ ایسا ہونا ناممکن نہیں کیونکہ کاروباری لوگ بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور ان کے نقطۂ نظر کی اصلاح ممکن ہے۔ قدرت نے نہ تو کاروباریوں کو زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی مشین بنا کر پیدا کیا ہے نہ عام انسانوں میں اجتماعی منصوبہ بندی اور قومی اہداف کی خاطر مشترکہ جدوجہد کے خلاف کوئی فطری رجحان ودیعت کیا ہے۔ اگر ایک طرف عوام اور کاروباری لوگوں میں اجتماعی شعور بیدار رہے اور دوسری طرف ایک جمہوری حکومت اجتماعی ضروریات و مصالح کا لحاظ رکھتے ہوئے قومی وسائل کا جائزہ لے کر معاشی ترقی کے لیے ایک ایسا منصوبہ مرتب کرے جس میں پیداوار کے ہدف مقرر کرنے، مختلف صنعتوں کے لیے وسائل سرمایہ کاری کی اہمیتوں کے اعتبار سے تقسیم عمل میں لانے اور تقسیم دولت کے بنیادی اصول طے کر دینے پر اکتفا کیا گیا ہو تو مطلوبہ مقاصد بخوبی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ محاصل کا ایک موزون نظام مرتب کیا جا سکتا ہے اور اجرتوں، کرایوں، منافع اور عام اشیاء کی قیمتوں کو چند اصولی حدود کا پابند بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح سماجی عدل کے تمام ضروری تقاضے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ اس منصوبہ کی حیثیت یہ نہیں ہوگی کہ کاروباری افراد چاہیں تو اس پر عمل کریں بلکہ اسے قانون کے ذریعہ نافذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک قسم کا اجتماعی کنٹرول ہوگا جو ہمہ گیر اور کلّی نہ ہونے کے باوجود معیشت کے بنیادی خدوخال متعین کر دے گا۔ ریاست اگر موزون معاشی اور اخلاقی محرکات فراہم کر دے اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ ایک اچھی اخلاقی فضا اور تعاون کا جذبہ پیدا کرنے کے ساتھ حسب ضرورت قانونی دباؤ سے کام لینے کے لیے تیار ہو تو یہ محدود منصوبہ بندی ان تمام فسادات کا سدّباب کر سکتی ہے جن کی وجہ سے اشتراکی مفکرین کلّی مادی منصوبہ بندی کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔

(د) دولت کی عادلانہ تقسیم کے لیے اجتماعی ملکیّت کی ضرورت:

بعض اوقات اس بات کو ایک علیحدہ دلیل کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ قومی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیداوار کی اجتماعی ملکیت دولت کی عادلانہ تقسیم کا باعث بنے گی کیونکہ اس شکل میں ریاست ضروریات اور خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے تمام افراد کو قومی دولت میں سے مناسب حصے دے سکے گی۔ آزاد معیشت میں دولت کی تقسیم معاشی طاقت پر مبنی اور اس وجہ سے از حد غیر منصفانہ ہوتی ہے۔ اشتراکی مفکرین ابتداً دولت کی مساوی تقسیم کے قائل تھے مگر بعد میں ضرورت اور خدمت کی بنیاد پر تقسیم کا نظریہ اختیار کر لیا گیا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ آزاد معیشت میں بازار کی قوتیں افراد معاشرہ کی ضرورت اور خدمت کو بنائے تقسیم نہیں بناتیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اجتماعی ملکیت کی صورت میں سماجی بہبود کے مختلف کاموں مثلاً حفظانِ صحت تعلیم صفائی وغیرہ کی طرف زیادہ توجہ دی جا سکے گی۔

لیکن اس دلیل سے ذرائع پیدائش اور قومی پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لے لینے کا وجوب نہیں ثابت ہوتا۔ جن مصالح اور مقاصد کا حوالہ دیا گیا ہے ان کو ریاست اس انتہائی اقدام کے بغیر بھی حاصل کر سکتی ہے۔ کاروبار کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے، اور اجرتوں، کرایوں وغیرہ کی منصفانہ شرحیں نافذ کرنے کے باوجود جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت بچ جائے ان سے ان کی فاضل دولت کا ایک حصہ لے کر ان لوگوں کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے جن کو ضرورت سے کم دولت ملی ہو یا جو کسی معذوری کے سبب بالکل محروم رہ گئے ہوں موجودہ دور میں مختلف ترقی یافتہ ممالک حفظانِ صحت تعلیم، ضعیف اور معذور افراد کی کفالت اور سماجی بہبود کے دوسرے کاموں پر قومی دولت کا ایک قابلِ لحاظ حصہ صرف کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ سارا کام اجتماعی ملکیت کا اصول اختیار کئے بغیر محاصل کے ذریعہ کیا جا رہا ہے۔

اسلام اور ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت

اجتماعی ملکیت کے حق میں دیے جانے والے بنیادی دلائل کا یہ جائزہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ دلائل نظری حیثیت سے بھی کمزور ہیں اور اپنے منشاء میں بھی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ دوسری طرف اسلامی نقطۂ نظر سے اجتماعی ملکیت کے خلاف چند اہم دلائل موجود ہیں۔ ان دلائل

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا صریح تقاضا یہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرہ میں تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دے دینے کا اصول نہ اختیار کیا جائے۔ اس کے علاوہ اسلامی زندگی کی داخلی قوتیں اس بات کی ضمانت دیتی ہیں کہ استحصال کے ازالہ، پیداواری نظام سے مزاج دُور کرنے اور دولت کی منصفانہ تقسیم عمل میں لانے کے مقاصد اجتماعی ملکیت کے بغیر بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

(د) آزادی اور جمہوریت کے لیے انفرادی ملکیت کی ضرورت :

تمام ذرائع پیدائش کو اجتماعی ملکیت بنا دینے کا اصول افراد سے وہ معاشی طاقت سلب کر لیتا ہے جو ان کو آزادانہ رائے رکھنے، اس کے اظہار اور اس کے حق میں منظم جدوجہد کرنے کے لیے درکار ہے۔ معاشی طاقت کا سلب کر لینا افراد کے ہاتھوں سے سیاسی طاقت بھی سلب کر لینے یا اسے بے انتہا کمزور اور غیر مؤثر بنا دینے کو مستلزم ہے۔ اس بات کی اہمیت دو وجوہ سے اسلامی معاشرہ کے لیے بہت بڑھ جاتی ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہر مسلمان فرد اللہ اور صرف اللہ کی مخلصانہ بندگی کا مکلف ہے۔ یہاں تک کہ خود "اسلامی ریاست" اگر الٰہی دستورِ زندگی سے صراحتًہ منحرف ہو کر کافرانہ روش اختیار کرے تو افراد کے لیے لازمی ہے کہ اللہ کی اطاعت کو جس کے تقاضے ان کا اپنا ضمیر قرآن و سنت کی روشنی میں متعین کرے گا، حکومتِ وقت کی اطاعت پر بالا رکھیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں اہم اجتماعی امور کا فیصلہ باہمی مشورہ کے ذریعہ کیا جانا چاہیے۔ سیاسی نظام کا یہ جمہوری مزاج اسلامی معاشرہ کے لیے ایک دینی ضرورت ہے۔ افراد کو ذرائع پیداوار اور آزادانہ روزگار سے محروم کر کے ان کے ہاتھوں سے معاشی اور سیاسی طاقت سلب کر لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آزادیٔ ضمیر سے محروم ہو جائیں اور ان کا حقِ مشورہ بے اثر ہو جائے۔ یہ بات اسلام کے منشاء کے خلاف ہے اور ایسی حالت میں اسلامی زندگی اپنے صحیح مزاج کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتی۔

شورٰی پر مبنی نظام کا تقاضا ہے کہ افراد کو آزادانہ رائے قائم کرنے کا موقع حاصل ہو۔ ہر فرد کو اس بات کا حق حاصل ہو کہ وہ قرآن و سنت کے علم اور اجتماعی مصالح کے فہم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی روشنی میں حکومت کی پالیسیوں سے اختلاف کر سکے یا کسی زیرِ غور مسئلہ میں حکمران افراد کی رائے سے ہٹ کر رائے قائم کر سکے۔ پھر اسے اپنی اختلافی رائے کے اظہار، اس کے دلائل کی وضاحت، اور مناسب ذرائع سے کام لیتے ہوئے اسے مؤثر بنانے کی کوشش کرنے کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے۔ اگر سماج کے اکثر افراد حکومت کی کسی پالیسی سے اختلاف رکھتے ہوں تو ان کو اس بات کے مواقع حاصل ہونے چاہئیں کہ وہ حکومت کے فیصلہ پر اثر انداز ہو سکیں اور اُسے رائے عامہ کے مطابق تبدیل کر سکیں۔ بدرجۂ آخر انھیں حکومت چلانے والے افراد کو بدل دینے کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے۔ افراد کو عمّالِ حکومت پر نگرانی رکھنے، ان کا احتساب کرنے، اور ضرورت پڑنے پر ان پر سخت سے سخت تنقید کرنے کا بھی حق حاصل ہے۔

جب تمام ذرائع پیداوار ریاست کی ملکیت ہوں گے، سماج کے تقریباً تمام افراد ریاست کے تنخواہ دار یا وظیفہ خوار کی حیثیت سے کام کریں گے اور ہر شخص کی روزی کا انحصار ایک ایسے خزانہ پر ہوگا جس کی کنجیاں ہمیشہ عمّالِ حکومت کے ہاتھوں میں رہیں تو جمہوریت کے یہ تقاضے پورے نہیں ہو سکیں گے۔ حکومت کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ کسی فرد میں اختلاف کی بُو سونگھتے ہی اسے ستانا شروع کر دے اور یہ بات بیشتر افراد کو اختلاف کرنے سے باز رکھے گی۔ حکومت کے لیے یہ بہت آسان ہوگا کہ وہ اختلافی رائے کے اظہار کے مواقع ختم کر دے۔ ایسا کرنے کے لیے وہ اختلاف کرنے والے افراد کو معاشی مشکلات میں بھی مبتلا کر سکتی ہے اور اظہارِ رائے اور اشاعتِ افکار کے ذرائع پر کنٹرول بھی کر سکتی ہے۔

جب تمام ذرائع پیداوار اجتماعی ملکیت میں ہوں تو دوسری صنعتوں کی طرح ذرائع نشر و اشاعت اور وسائل حمل و نقل بھی حکومت کے قبضہ و اختیار میں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ عوام کے سامنے اختلافی رائیں لانے، حکومت پر تنقید کرنے، اور اصلاحِ حال کے لیے منظم کوشش کرنے کے لیے ان ذرائع و وسائل کا استعمال ناگزیر ہے۔ اگر حکومت افراد کو ان کے آزادانہ استعمال کا موقع نہ دے تو جمہوریت باقی نہیں رہ سکتی۔

جمہوریت کے تقاضے اسی وقت پورے کیے جا سکتے ہیں جب معاشرہ میں افراد کی ایک بڑی تعداد اپنی معاشی زندگی میں حکومت کی دستِ نگر نہ ہو اور اس کی روزی کا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انحصار حکومت کی تنخواہ یا وظیفے پر نہ ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب آزادانہ کسبِ معاش کے مواقع حاصل ہوں اور افراد پیدائشِ دولت کا کاروبار کر سکتے ہوں۔ اس کے لیے بہت سے ذرائع پیدائش کا اجتماعی ملکیت سے باہر ہونا ضروری ہے۔ فرد کی سیاسی طاقت کا انحصار اس پر ہے کہ وہ معاشی طور پر حکومتِ وقت سے بے نیاز ہو کر بھی زندہ رہ سکے اور ترقی کر سکے۔ جو فرد معاشی طور پر کسی کا دستِ نگر ہو وہ اس کے خلاف کسی سیاسی طاقت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ سماج میں بہت سے ذرائع پیدائشِ دولت، اور بہت سے مواقع روزگار کا حکومت کے پورے قبضہ و اختیار سے باہر ہونا اس بات کی ضمانت ہوگا کہ بہت سے افراد آزادانہ رائیں قائم کریں اور اس کا اظہار کریں۔ اسی شکل میں یہ ممکن ہوگا کہ حکومتِ وقت کا کوئی ملازم یا قومی صنعتوں میں کام کرنے والا کوئی مزدور، اگر حکومت کی پالیسیوں کو غلط سمجھے اور اس کا ضمیر اِن پالیسیوں کے نفاذ میں تعاون کے لیے آمادہ نہ ہو، تو وہ حکومت کی چاکری ترک کر کے نجی کاروبار کے دائرہ میں روزگار حاصل کرے۔ سچی آزادیٔ ضمیر اور حقیقی جمہوریت کے لیے کسبِ معاش کا ایک وسیع میدان ضروری ہے جہاں کوئی بھی فرد حکومت سے بے نیاز ہو کر اپنی روزی کما سکے۔

دنیا کی بعض قوموں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ وہ زندگی کے کسی ایک شعبہ کو غیر معمولی اہمیت دے کر اس کی کسی قدر کے مبالغہ آمیز تصوّر کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کے لیے ایک ایسا طریقہ اختیار کرتی ہیں جو دوسرے شعبوں سے متعلق بنیادی اور اہم ترین قدروں کو بھی پامال کر دیتا ہے۔ معاشی فلاح، مساوات اور ازالۂ استحصال کے مقاصد کے لیے بنیادی سیاسی قدروں کی پامالی اشتراکی سماج کی نمایاں صفت ہے۔ اسلام میں اس غیر متوازن پالیسی کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ یہاں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے بنیادی مصالح کا تحفّظ کرنے والی قدروں کی نشان دہی قرآن و سنت میں کر دی گئی ہے، ان کے متناسب اور متوازن نفاذ کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور قرآن و سنت میں اس نفاذ کے اصولی طریقے بھی واضح کر دیے گئے ہیں۔ اسلام میں معاشی مفادات کے تحفظ یا معاشی ترقی کے لیے انفرادی آزادی، اور جمہوریت کی کامل قربانی نہیں دی جا سکتی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ب) اخلاقی اور رُوحانی ارتقا کے تقاضے :

تمام ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت اور معاشی طاقت کا تمرکز افراد کے اخلاقی اور رُوحانی ارتقا میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ اس شکل میں فرد کی اخلاقی ترقی کے مواقع کم ہو جاتے ہیں اور بعض رُوحانی مفاسد کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

عام افراد کے اخلاقی اور روحانی ارتقا کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ ان کو اپنا مقام بڑی حد تک محفوظ معلوم ہو اور وہ مسلسل بھیانک اندیشوں کا شکار نہ رہیں۔ اگر فرد کو ہمیشہ اپنی جان چلی جانے، یا آزادی چھن جانے، یا ضروریاتِ زندگی سے محروم کر دیے جانے کا اندیشہ لاحق رہے تو اسے وہ سکونِ خاطر نہیں نصیب ہو سکتا جس کا ایک کم سے کم معیار انسان کے لیے رُوحانی امور کی طرف متوجہ ہونے یا اپنی شخصیت کے لطیف تر پہلوؤں کی پرورش میں لگنے کے لیے ضروری ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں معاشی اور سیاسی طاقتیں حکومت کے ہاتھوں میں مرکوز ہوں اس طرح کے حالات پیدا ہونے کا اندیشہ بہ نسبت دوسرے معاشروں کے زیادہ ہوتا ہے۔ جب تک ایک کلیت پسند حکومت انصاف پر قائم رہے، افراد کی آزادی کا احترام کرے اور بلا لحاظ نظریہ و مسلک ہر فرد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کرے تب تک افراد کو سکون و اطمینان میسر رہے گا۔ لیکن اگر کبھی حکومت کا مزاج بگڑ جائے اور وہ کسی مخصوص فرد یا گروہ پر ظلم و زیادتی کرنے پر اتر آئے تو افراد اضطراب و بے چینی کا شکار ہو کر اس سکونِ خاطر سے محروم ہو جائیں گے۔ ایسا ہونے کا امکان ایک کلیت پسند معاشرہ میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں انسانی ضمیر کی قوتِ مدافعت کم ہو جاتی ہے اور خطرات کی شدت اسے غلامانہ ذہنیت میں مبتلا کر کے اربابِ اقتدار کا بندہ بن جانے پر آمادہ کر دیتی ہے ایک کلیت پسند ریاست کے معاشی اور سیاسی دباؤ کے باوجود انسانی ضمیر کا پاکیزہ اور موحد رہ جانا اتنا بڑا کام ہے جس کی چند غیر معمولی افراد سے تو توقع کی جا سکتی ہے مگر عام انسانوں سے اس کی توقع رکھنا زیادتی ہے۔ انسانیتِ عامہ کے روحانی مفاد کا تقاضا ہے کہ ایسے حالات رونما ہونے کا امکان نہ باقی رکھا جائے۔ فرد کو کسبِ معاش کے لیے آزادانہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذرائع پیدائش میسر ہونے کا رُوحانی فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنی قوتِ بازو سے اپنی ضروریات پوری کر کے ساری دنیا کی غلامی سے آزاد رہ سکتا ہے اور اپنے ضمیر کو دوسرے انسانوں یا انسانی اداروں کی مرضی کے تابع بنانے سے انکار کر سکتا ہے۔ اگر فرد کو یہ حق حاصل رہے تو وہ کسی بگڑی ہوئی حکومت کے دور میں بھی اپنی چھوٹی سی دنیا میں توحید پر قائم رہنے اور ایک پاکیزہ فضا برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

انسان کی اخلاقی صفات کو عملی جامہ پہن کر اچھے کاموں کی شکل میں ظاہر ہونے کے لیے کچھ ذرائع و وسائل، کسی حد تک طاقت و اختیار اور کسی نہ کسی "مواد" کی ضرورت پڑتی ہے۔ لطف و کرم، مواساة و ہمدردی، خدمت و ایثار، تعاون و دستگیری، اور دوسرے اخلاقِ حسنہ کے اظہار کے لیے فرد کی ملکیت ذرائع و وسائل کا کام کرتی ہے۔ ایک اچھے انسان کی ملکیت میں جو ذرائع پیدائش ہوں وہ اس کی اچھی صفات کے اظہار کا ذریعہ اور دوسرے انسانوں کے لیے باعثِ رحمت بن سکتے ہیں۔ موجودہ سماج میں اگر ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت استحصال اور ظلم کا ذریعہ بن جاتی ہے تو اس کی ذمہ داری بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ آج کا انسان اخلاقِ حسنہ سے عاری ہے۔ اس کے باوجود اس بگڑے ہوئے معاشرہ میں بھی ایسے افراد مل جاتے ہیں جو اپنے سرمایہ اور کاروبار کو سماجی بہبود اور اجتماعی فلاح کا خادم بنا کر رکھتے ہیں۔ بُرے افراد کو ان ذرائع سے محروم کرنا یا ان ذرائع پر ان کے قبضہ و اختیار کو محدود اور مقید کر دینا درست ہو سکتا ہے لیکن اچھے افراد کو ان ذرائع سے محروم کر دینا اچھائی کے ساتھ ظلم ہے۔ اس سے سماج کو بھی نقصان ہوتا ہے اور خود ان افراد کے اخلاقی ارتقاء میں رکاوٹ ہوتی ہے۔

اسلام کو اس بات پر اعتماد ہے کہ وہ انسانوں میں اچھی صفات پیدا کرنے اور ان کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس لیے ابتداء ہی سے ایک اصول موضوعہ کے طور پر یہ بات نہیں تسلیم کی جا سکتی کہ افراد کو ذرائع پیدائش کی ملکیت سے محروم کر دیا جائے۔ صحیح طریقہ یہ ہو گا کہ ان ذرائع سے انہی افراد کو اسی حد تک محروم کیا جائے جو اچھے، نہ بن سکیں، ان ذرائع کو مضرت رساں طریقوں سے استعمال کریں، اور باوجود تنبیہ کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے طرزِ عمل کی اصلاح نہ کریں۔ یہ حقیقت پسندانہ پالیسی اسلام کے اس مزاج سے بھی ہم آہنگ ہے کہ فرد کی اخلاقی تربیت اور اس کا تزکیہ اہم ترین مقصد ہے اور اس کے لیے بیش از بیش مواقع فراہم کیے جانے چاہییں۔ اگر افراد کے تزکیہ اور ان کی اخلاقی تربیت کے لیے ایک سازگار فضا پیدا کرنے کی خاطر ہمیں معاشی مفادات کو کسی حد تک قربان بھی کرنا پڑے تو یہ سودا مہنگا نہیں ہوگا۔

(ج) استحصال بے جا کا امکان کم کرنے کی مؤثر تدابیر:

اوپر ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت استحصال کا صرف 'امکان' پیدا کرتی ہے، اسے لازمی نہیں بنا دیتی۔ اس حقیقت کی روشنی میں کسی نظامِ زندگی کے لیے اصل مسئلہ یہ ہے کہ امکان کے باوجود استحصال کو واقع ہونے سے روکا کس طرح جائے۔

استحصال کا امکان موجود ہونے ہوئے اس بات کا اہتمام کہ عملاً استحصال نہ ہو، دو طرح سے کیا جا سکتا ہے، اور یہ اہتمام مکمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب بیک وقت ان دونوں طریقوں سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

ایک طرف تو اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ انسان کو انسان بنایا جائے تاکہ وہ اخلاقی محرکات کے تحت استحصال سے باز رہے۔ یہ داخلی تربیت انسان کو حیات و کائنات کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر کی تعلیم دے کر، اسے ایک بالاتر ہستی کے حضور جوابدہی کا احساس دلا کر، اس میں اجتماعی شعور بیدار کر کے، اور ایک اچھا اخلاقی طرزِ عمل اختیار کرنے کے روحانی، جمالیاتی اور عام سیاسی اور معاشی نتائج کو سامنے لا کر کی جا سکتی ہے۔ انسانوں کو ایک خاندان کے افراد ہونے کا شعور، اور اس بات کا احساس عطا کرنا چاہیے کہ ان کے مقاصد مشترک ہیں۔ یہ تربیت سماج کے تمام افراد کی ہونی چاہیے تاکہ جو فرد کاروبارِ زندگی میں جس حیثیت سے بھی حصہ لے انسان کی طرح حصہ لے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں ہم نے اجمالاً وہ نقطۂ نظر واضح کیا ہے جو اسلام بالخصوص ملکیت کے باب میں انسان کو عطا کرتا ہے۔ اگر ایک جدید ریاست اپنے نظامِ تعلیم و تربیت اور ذرائع نشر و اشاعت — پریس، سینما، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ — کو اس نقطۂ نظر کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیم کے لیے استعمال کرے تو بڑی حد تک ایک اچھی اخلاقی فضا پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ معاشرہ کے جو افراد سیاسی یا معاشی طور پر دوسرے افراد سے زیادہ طاقتور ہوں گے وہ ان کے استحصال سے باز رہیں گے۔

دوسری طرف اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ اخلاقی طور پر تربیت یافتہ سماج میں سے چند بہترین افراد کو منتخب کرکے سماج پر احتساب و نگرانی کا ایک نظم قائم کیا جائے۔ اس نظم کا کام یہ ہو کہ جہاں جہاں، جسے بھی استحصال کے مواقع حاصل ہوں اس پر کڑی نگاہ رکھے اور جو فرد یا گروہ حرص و ہوس کا شکار ہو کر استحصال کی طرف مائل ہو اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ یہ نظم کاروباری سرگرمیوں، تجارت و صنعت، اور عام کاروباری معاہدوں کو ایسے ضابطوں کا پابند بنائے کہ استحصال کے مواقع کم سے کم ہو جائیں۔ یہی نظم معاشرہ میں اجارہ دارانہ اتحاد اور معاشی طاقت کے غیر معمولی تمرکز کو بھی روکے تاکہ ایسا نہ ہو کہ چند ہاتھوں میں اتنی طاقت جمع ہو جائے کہ اس پر قابو پانا مشکل ہو جائے۔

آسانی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے کہ بیک وقت یہ دونوں طریقے اختیار کرنا کیوں ضروری ہے۔ اگر صرف اخلاقی تربیت پر بھروسہ کیا گیا تو یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک فرد یا چند افراد حرص و ہوس کا شکار ہو کر استحصال شروع کر دیں پھر اس کے ردِ عمل اور اس کی تقلید کے نتیجہ میں برائی کا ایک چکر چل پڑے جسے روکنے کے لیے کوئی با اقتدار ہستی نہ موجود ہو۔ انسان کوئی مشین نہیں کہ ایک خاص انداز پر تربیت پانے کے بعد خود اس انداز کو نہ بدل سکے اور ہمیشہ اسی طرزِ عمل پر قائم رہے جو اسے سکھایا گیا تھا۔ پھر تمام انسانوں کو یکساں تربیت دی بھی نہیں جاسکتی۔ نہ معاشرہ سے شر پسند افراد کو بالکل ختم کیا جاسکتا ہے۔ انسانوں کی تربیت ہمیشہ ناقص اور غیر مکمل رہتی ہے۔ اس طرح صرف احتساب و نگرانی کے ایک صاحبِ اقتدار نظام پر بھی پورا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اگر خود معاشرہ کی عام اخلاقی تربیت نہیں کی گئی تو نظمِ احتساب کے لیے بھی قابلِ اعتماد افراد نہیں مل سکیں گے۔ اگر ناتربیت یافتہ اور خام افراد سماج کے با اقتدار نگران بن بیٹھنے اور خود استحصال کرنے، یا استحصال کرنے والوں کا ساتھ دینے پر اتر آئیں تو سماج کی عام اخلاقی پستی کے سبب ان کو بدلنے کی عام ضرورت محسوس ہونے، اصلاحِ حال کی کوشش کی جانے اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان افراد کو بدل کر بہتر افراد لانے کا کوئی امکان نہ باقی رہے گا۔ برعکس اس کے اگر دونوں طریقے ساتھ ساتھ اختیار کیے جائیں تو دوہرا فائدہ ہوگا۔ انفرادی اخلاقی کوتاہیوں کی تلافی، اور سماج کو ان کے مضر اثرات سے بچانے کا اہتمام قانونی پابندیوں اور اجتماعی کنٹرول کے ذریعہ ہوگا، اور احتساب و نگرانی کے نظم کو بہترین کارکن مل سکیں گے جن کو سماج کا اخلاقی شعور راہِ راست پر رکھنے اور بوقتِ ضرورت بدل دینے پر قادر ہوگا۔

اسلام نے اس مسئلہ کا حل اسی طرح کیا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسرا باب

انفرادی ملکیّت کے ذرائع

اسلامی تصورِ ملکیت پر پہلے باب میں جو روشنی ڈالی جاچکی ہے اس کے بعد ذاتی ملکیت کے حق کی رسمی تعریف ضروری نہیں معلوم ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو تعریفیں منطقی طور پر تصورِ ملکیت کی وضاحت کے لیے وضع کی گئی ہیں وہ اسلام میں حقِ ملکیت کے صحیح مزاج کی عکاسی سے قاصر ہیں۔ ان میں ایسا عموم اور اطلاق پیدا ہو جاتا ہے جو اسلام میں حقِ ملکیت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ حقِ ملکیّت کا حقیقی مفہوم سمجھنا اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان ذمہ داریوں اور حدود کا مطالعہ کریں جو اس حق کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لیکن مطالعہ میں سہولت کی خاطر آغازِ مطالعہ میں اس موضوع پر مختصر سی گفتگو مفید معلوم ہوتی ہے۔

ذیل میں جن تعریفات کا مطالعہ کیا گیا ہے ان کا تعلق ملکیت نام کے حق سے ہے۔ ان کا اطلاق ان حالات پر ہوتا ہے جہاں ملکیت کے سارے حقوق پوری طرح موجود ہوں۔ بعض حالات میں مالک کا حقِ ملکیّت ناقص ہوتا ہے۔ حقِ ملکیّت دراصل کئی حقوق کا مجموعہ ہے، ملکیت ناقص ان میں سے صرف بعض حقوق پر مشتمل حقِ ملکیت کا نام ہے۔ ملکیت ناقص پر ہم بعد میں غور کریں گے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقِ ملکیّت کی تعریف

مشہور مغربی محقق اور ماہرِ قانون ،جان آسٹن نے ملکیّت یا (Dominium) کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

"اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے یہ کسی متعیّن شے پر ایک حق کی نشان دہی کرتا ہے جو استعمال کے اعتبار سے غیر محدُود اور تصرّف و انتقال کے اعتبار سے بے قید ہے"[1]

اس تعریف کا اصل جوہر استعمال ،تصرّف اور انتقال کے حقوق کا بے قید اور غیر محدُود ہونا ہے۔ یہ تعریف ملکیّت کو ایک مطلق حق کے طور پر پیش کرتی ہے جو اپنے اصل کے اعتبار سے، حدود و قیود سے نا آشنا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر ملکیّت اس تعریف پر پُوری اُترے۔ جیسا کہ آسٹن نے آگے چل کر خود لکھا ہے زیادہ تر املاک پر مالک کے اختیارات رواج ،قانون ملکی اور دوسروں کے حقوق ملکیّت سے اُبھرنے والی قیود کے ذریعہ محدود ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی حقِ ملکیّت کی اصل اور بنیادی تعریف یہی سمجھی گئی ہے۔ مغربی علمائے قانون حقِ ملکیّت کی تعریف عموماً اسی طور پر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقِ ملکیّت کا اصل جوہر دوسروں کو اپنی ملک پر مالکانہ تصرّف سے محروم رکھنے کا قانونی حق ہے۔[2]

حقِ ملکیّت کی یہ تعریف اسلامی تصورِ ملکیّت سے ہٹی ہوئی ہے کیونکہ اسلامی تصورِ ملکیّت میں اطلاق اور بے قیدی کا پہلو نہیں پایا جاتا۔ مالک اپنی ملکیّت میں مالکِ حقیقی کا نائب ہے اور اس کا تصرّف اللہ کے حکم کے تابع ہے۔ اللہ نے فرد کے اس حق کو ایسے حدود کا پابند بنایا ہے جن کا منشا خود مالک کی شخصیّت اور دُوسرے افراد نیز پورے معاشرہ کو ملکیّت کے مضر استعمال سے محفوظ رکھنا ہے۔ ساتھ ہی اللہ نے حقِ ملکیّت

---

[1] (John Austin : Lectures on Jurisprudence Vol II p. 790 Ed. R. Campbell, 3rd Edition, London, Murray 1911)

[2] (Encyclopaedia Americana, 'Article on 'property,' Vol. XXII p. 660)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ مالک پر کچھ مثبت ذمہ داریاں بھی عائد کی ہیں جو اس حق سے علیحدہ نہیں کی جا سکتیں۔ اکثر اوقات یہ ذمہ داری اپنی ملکیت میں دوسروں کا حق تسلیم کرنے، اس میں سے ان کا حصہ نکالنے یا انہیں اس کے استعمال کا موقع دینے، اور خود استعمال کرتے وقت دوسروں کے مصالح کو بھی ملحوظ رکھنے کی شکل میں عائد کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حدود اور ذمہ داریوں کے ہوتے ہوئے ملکیت کا کوئی بے قید اور مطلق تصور اسلامی نظریہ میں راہ نہیں پا سکتا۔

فقہ اسلامی میں بھی ملکیت کی متعدد تعریفیں ملتی ہیں۔ لیکن چند الفاظ میں کی جانے والی کوئی تعریف ان حدود اور ذمہ داریوں کا احاطہ نہیں کر سکتی جو اسلام میں حق ملکیت کے ساتھ لازماً وابستہ ہیں۔ ہمارے نزدیک حق ملکیت کی ایک مختصر جامع اور دوسری تعریفوں سے نسبتاً بہتر تعریف وہ ہے جو مشہور حنفی محقق علامہ زین العابدین ابراہیم ابن نُجیم (م ۹۷۰ھ) نے کی ہے۔ خود یہ تعریف اس تعریف کے مطابق ہے جو ابن ہمّام نے فتح القدیر میں بیان کی ہے۔ ابنِ نُجیم کی تعریف یہ ہے:

الملك قدرة يثبتها الشارع ابتداءً على التصرف، إلّا لمانع[1]

ملکیت تصرّف کر سکنے کا اختیار ہے جس کا منبع شارع کا اذن ہے، الّا یہ کہ کوئی مانع موجود ہو۔

اس تعریف[2] کی رُو سے ضروری ہے کہ ملکیت کا حصول شرعی طور پر ہوا ہو۔ وہی مالکانہ حقوق

---

[1]: ابن نجیم: الاشباہ والنظائر۔ صفحہ ۶۰۵۔ مطبوعہ تعلیمیہ پریس کلکتہ۔ ۱۲۶۰ھ

[2]: ملکیت کی بعض دوسری تعریفیں یہ ہیں:

في اصطلاح الفقه الملك اتصالٌ شرعيٌ بين الانسان وبين شيءٍ يكون سببا لتصرفه ومانعا عن تصرف غيره۔

فقہ کی اصطلاح میں ملکیت انسان اور کسی چیز کے درمیان ایک شرعی تعلق کا نام ہے جو اس کے تصرّف کا سبب بنتا ہے اور دوسروں کو تصرّف سے روکتا ہے۔

(عبدالنبی بن عبدالرسول الاحمد نگری: جامع العلوم الملقب بدستور العلماء، جلد ۳، صفحہ ۳۲۲ طبع اوّل۔ دائرۃ المعارف۔ حیدر آباد دکن ۱۳۲۹ھ)

الملك اباحة شرعية في عينٍ او منفعة تقتضي ربانی حاشیہ بر صفحہ ۱۳۰)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واختیارات معتبر ہیں جو مالک کو شریعت نے عطا کیے ہوں، کیونکہ حقِ ملکیّت کا اصل منبع شارع کا اذن ہے۔" یہ بات کہ کوئی ملکیّت بغیر شارع کے صریح اذن یا خاموش تائید کے ثابت نہیں ہوتی۔ فقہاء اسلام کے درمیان ایک متفق علیہا اصول ہے[۵] اس اصول کی روشنی میں ملکیّت کے اسلامی تصوّر اور مغربی تصوّر کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ اسلام میں ہر حق کا انحصار مالک حقیقی کے اذن پر ہے۔ وہی حق حق ہے جسے شریعتِ الٰہی نے حق قرار دیا ہو۔ مگر مغربی فکر میں انسان اشیاء کائنات کا مالکِ مطلق معلوم ہوتا ہے، اس لیے حقِ ملکیّت کے لیے کسی بالاتر طاقت کے اذن کی بحث نہیں پیدا ہوتی۔ وہاں تحقیق کا انداز یہ ہوتا ہے کہ کوئی حق عملاً کس طرح وجود میں آیا۔ پہلے رواج کیا تھا، پھر کس طرح "افراد" مالک بنے، اور ان کے مالکانہ تصرّفات کے حدود اور ان کی غرض و غایت کیا رہی۔ حقِ ملکیّت کی ماہیّت اور اس کے حدود و مقاصد تاریخی تجزیہ سے معلوم کیے جاتے ہیں۔ جس طریقہ کو انسانوں کے طویل عرصہ تک تعامل کی سند حاصل ہوتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹) تمکّن صاحبها من الانتفاع بتلك العین او المنفعة او اخذ العوض عنه من حیث هی كذالك۔

ملکیّت کسی چیز یا فائدہ کے سلسلہ میں اُس شرعی اجازت کا نام ہے جس کی رُو سے صاحبِ ملکیّت کو اس چیز یا فائدہ سے خود فائدہ اُٹھانے یا اس کا معاوضہ حاصل کرنے کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی حیثیت یہی ہے۔

(شہاب الدّین ابوالعباس احمد بن ادریس بن عبدالرحمٰن الصنہاجی المعروف بالقرافیؒ (م ۶۸۴ھ) الفروق۔ قاہرہ۔ ۱۳۴۴ھ۔ جلد ۳۔ صفحہ ۲۱۶)

الملك هو اختصاص حاجز شرعًا یسوغ لصاحبه التصرّف الّا لمانع۔

ملکیّت اس طرح مخصوص کر لینے کا نام ہے جو شریعت کی رُو سے (تصرّفِ غیر) سے محفوظ کر دے یا ایسا کرنے والا خود تصرّف کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ الّا یہ کہ کوئی مانع موجود ہو۔

(مصطفیٰ احمد الزرقاء: المدخل الفقهی العام الی الحقوق المدینة صفحہ ۱۵۹۔ مطبعہ جامعۃ السوریہ۔ دمشق۔ ۱۹۵۴ء)

[۵]: محمد ابوزہرۃ: الملکیة ونظریة العقد فی الشریعة الاسلامیة۔ محولہ "العدالة الاجتماعیة فی الاسلام"؛ سید قطب طبع قاہرہ ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۲۰

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے "فطری حق" قرار دے دیا جاتا ہے جس کا ماخذ قانونِ فطرت (Law of Nature) قرار پاتا ہے۔ ماضی قدیم سے مالکوں نے عملاً جو رویہ اختیار کیا وہی فطری قرار پا کر ملکیت کے فطری تصور سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ بعض مسلمان مصنفین بھی فطری کے لفظ سے دھوکا کھا کر اسی طرزِ استدلال کو اختیار کر لیتے ہیں۔ فقہائے اسلام نے جو اس مسئلہ پر ایک مختلف زاویۂ نگاہ سے غور کیا ہے۔ کائنات اور اس کی تمام اشیاء اللہ کی ملک ہیں اور وہی شارع بھی ہے۔ مالکِ حقیقی کی مرضی، جو شریعتِ اسلامی میں مذکور ہے، انسانوں کو حقِ ملکیت عطا کرتی ہے یا مالک وہ ہے جو شریعتِ اسلامی کی رُو سے مالک ہو۔ حقِ ملکیت کے اغراض و مقاصد اور حدود و قیود بھی شریعت ہی متعین کر سکتی ہے۔ کسی عالمِ تاریخ یا نبّاضِ فطرت کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے مزعومہ علم و بصیرت کی روشنی میں حقِ ملکیت کے مقاصد اور حدود دریافت کر کے انہیں ملکیت کے فطری ضوابط کا درجہ دے دے۔

اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے ملکیت کے اسلامی ضوابط اور فطرتِ انسانی کے درمیان مناسبت نہیں پائی جاتی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے جب خود خالقِ فطرت ہی شارع بھی ہے قرآن و سنت میں ملکیت کے باب میں جو ہدایات بھی دی گئی ہیں وہ فطرتِ انسانی کی مناسبت سے دی گئی ہیں۔ جس بات پر ہم زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسانی امور میں فطرت اور قانونِ فطرت کا صحیح مفہوم قرآن و سنت ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ فطرت کے بارے میں خود ساختہ تصورات سے منطقی استنباط کے ذریعہ اخذ کردہ نتائج کو ملکیت کے باب میں اپنے نظریات کی بنیاد بنا لیا جائے۔

مذکورہ بالا تعریف میں حقِ ملکیت کے مطلق ہونے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ مانع کا ذکر کر کے جامع طور پر ان حدود و قیود کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا ہے جو اسلام میں حقِ ملکیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس مرحلہ پر ان حدود و قیود کی تفصیل میں جانا کچھ ضروری نہیں۔ یہ اشیاء مملوکہ کی نوعیت، مالک کی شخصیت، اور سماجی حالات کے اعتبار سے مختلف واقع ہوئے ہیں۔ اسی طرح اپنی ملک میں دوسروں کو مداخلت سے باز رکھنے کا حق بھی مختلف حالات میں اور مختلف اشیاء کے سلسلہ میں مختلف معنی رکھتا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصولِ ملکیّت کے شرعی طریقے

حقِ ملکیّت کی تعریف کے بعد اب ہمیں ان طریقوں اور ذرائع کا مطالعہ کرنا ہے جن سے حاصل کی جانے والی چیزیں حاصل کرنے والے کی ملکیّت قرار پاتی ہیں۔ ان طریقوں کا اطلاق عام ہے مگر دو طرح کی اشیاء اصولی طور پر مستثنیٰ رکھی گئی ہیں۔

۱۔ وہ مشترکہ یا اجتماعی اقسامِ دولت جو انفرادی ملکیّت کے قابل نہیں قرار دی گئی ہیں، مثلاً دریا، پہاڑ، عام سڑکیں وغیرہ۔ ان کا تفصیلی ذکر ساتویں باب میں ملے گا۔

۲۔ وہ حرام اشیاء جو کسی مسلمان کی ملک نہیں ہو سکتیں کیونکہ ان کا صرف کرنا یا ان کی لین دین ان پر حرام ہے، مثلاً شراب، سور، اور اس کا گوشت وغیرہ۔

فقہائے اسلام نے حصولِ ملکیّت کے شرعی طریقوں کو مختلف اسالیب پر مرتب کیا ہے علمی مطالعہ کے لیے ہمیں ذیل کی تقسیم موزون ترین نظر آتی ہے۔

(ا) مباح چیزوں پر قبضہ۔

(ب) معاہدات کے ذریعہ انتقالِ ملکیت۔

(ج) وراثت کے ذریعہ انتقالِ ملکیت۔

(د) ملکیّت سے قدرتی طور پر حاصل ہونے والے ثمرات۔

(ا) مباح چیزوں پر قبضہ:

ایسی تمام اشیاء جو کسی کی ملک میں نہ ہوں اور جنھیں اسلامی قانون ذاتی ملکیّت میں آنے کے قابل قرار دیتا ہو، انفرادی ملکیت میں لائی جا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ایسا کرنے میں ان خصوصی ضوابط کی بھی پابندی کی جائے جو مختلف اشیاء کو ذاتی ملک میں لانے کے بارے میں مقرر کیے گئے ہوں۔

بعض استثنائی حالات کو چھوڑ کر اس دفعہ کا اطلاق زیادہ تر "احیاء اموات"، شکار، اور شکار سے ملتے جلتے قبضہ ابتدائی پر ہوتا ہے۔ مستثنیٰ حالات میں حالتِ جنگ اور شدید اضطراری کیفیّت شامل ہے۔ حالتِ جنگ میں اسلامی فوج کے سپاہی (مجاہد) کو اپنے مقتول کے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جسم پر پائے جانے والے لباس، ہتھیار وغیرہ پر قبضہ کر لینے کا اختیار دیا گیا تھا جسے سلب کہتے ہیں[۵۱]۔
ایک انسان جو بھوک، پیاس یا اسی طرح کی بنیادی ضرورت کے تحت ایسے شدید اضطرار میں مبتلا ہو کہ جان چلی جانے کا اندیشہ ہو اُسے "آخری چارہ کار کے طور پر" اپنی ضرورت کی ہر چیز کسی کے مال میں سے لے لینے کا حق دیا گیا ہے[۵۲]۔ اصولی اعتبار سے، اور عملی نقطۂ نظر سے بھی، ان استثنائی حالات کی اہمیت زیادہ نہیں۔

۱- احیائے موات :

شریعت کی اصطلاح میں "موات" کا اطلاق ان زمینوں پر ہوتا ہے جو "آبادی سے باہر ہوں، کسی کی ملک میں نہ ہوں، نہ ان پر کسی کا کوئی مخصوص حق ہو، . . . . آبادی سے باہر کی جو زمینیں آبادی والوں کے کام آتی ہوں، مثلاً چراگاہ یا ایندھن حاصل کرنے کی جگہ، تو وہ موات نہیں سمجھی جائیں گی . . . . اسی طرح نمک، تیل، تارکول وغیرہ ایسی اشیاء کے علاقے جن کی ضرورت سارے مسلمانوں کو ہو وہ بھی موات نہیں سمجھے جائیں گے[۵۳]۔ وہ زمینیں بھی موات نہیں ہیں جن میں نمک، کول تار وغیرہ کی کھلی ہوئی کان پائی جائے، کیونکہ یہ چیزیں مباح عام ہیں اور ان کی کانوں کو قبضہ کے ذریعہ انفرادی ملکیت نہیں بنایا جا سکتا[۵۴]۔

مجلّۃ الاحکام العدلیہ، جسے گذشتہ صدی میں خلافتِ عثمانیہ کے ایما پر حنفی فقہ کی روشنی میں مرتب کیا گیا تھا، ان زمینوں کی تعریف اس طرح کرتا ہے :

"ایسی زمینیں جو نہ کسی کی ملک میں ہوں نہ کسی شہر یا گاؤں کے باشندے انہیں

---

۵۱ : صحیح مسلم: کتاب الجہاد والسیر۔ باب استحقاق القاتل سلب القتیل۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک یہ کوئی مستقل حکم نہیں بلکہ اسی وقت نافذ ہوگا جبکہ امام نے جنگ سے پہلے اس کی صراحت کر دی ہو متعدد وجوہ سے یہی رائے قابلِ ترجیح معلوم ہوتی ہے مگر امام شافعی اور امام احمد اسے ایک مستقل حکم سمجھتے ہیں (ملاحظہ ہو شرح مسلم النووی)

۵۲ : اس مسئلہ پر تفصیلی بحث چھٹے باب میں کی گئی ہے۔

۵۳ : علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی الحنفی (م ۵۸۷ھ) : بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع۔ جلد ۶۔ صفحہ ۱۹۴۔ مطبع جمالیہ مصر۔ ۱۹۱۰ء۔

۵۴ : ایضاً

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چراگاہ کے طور پر یا ایندھن حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہوں اور جو آبادی کی آخری حد سے کم از کم اتنے فاصلے پر واقع ہوں کہ ایک بلند آواز آدمی اگر وہاں کھڑا ہو کر پوری قوت سے چلائے تو بھی وہاں نہ سنائی دے[1]۔"

یہ تعریف جو کاسانی کی مذکورہ بالا تعریف سے ملتی جلتی ہے، دوسرے حنفی مآخذ مثلاً ہدایہ وغیرہ کی تعریفات کے ہم معنی ہے۔ آبادی سے دوری کی شرط امام ابو یوسف[2]، امام طحاوی اور بعض دوسرے اکابر فقہاء کے یہاں ملتی ہے، اگرچہ پھر بھی یہ مسئلہ اختلافی ہے[3]۔ بہر حال یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ یہ ایک انتظامی شرط ہے، اور دوری کی مقدار کا تعین حالات کے ساتھ بدلتے رہنا چاہیے۔ یہ کام ہر دور میں اسلامی ریاست کا ہے کہ وہ اس بارے میں حالات کی مناسبت سے ضابطے وضع کرے۔

صرف یہی ضروری نہیں کہ اس زمین پر کوئی دوسرا پہلے سے قبضہ نہ کر چکا ہو بلکہ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ ریاست نے اسے حمیٰ —— سرکاری کاموں کے لیے مخصوص —— تو نہیں قرار دے دیا ہے[3]۔ ریاست کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ اس طرح کی کوئی زمین کسی فرد یا ادارے کے لیے مخصوص کر دے[4]۔

کیا یہ بھی ضروری ہے کہ فرد کسی 'موات' زمین پر قبضہ کرنے سے پہلے ریاست سے باقاعدہ اجازت حاصل کرے؟ امام ابو حنیفہ، اور ان کی رائے کی تائید میں امام طحاوی اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے[5]۔ اجازت طلبی ضروری قرار دینے کا ایک اہم فائدہ یہ ہو گا کہ متعدد افراد کے ایک ہی قطعۂ زمین پر قبضہ کی خواہش سے جھگڑے پیدا ہونے

---

[1] : مجلۃ الاحکام العدلیہ۔ دفعہ ١٢٧٠

[2] : الکاسانی : بدائع الصنائع۔ جلد ٦ صفحہ ١٩٤

[3] : محمد بن محمد ابو حامد الغزالی : الوجیز۔ صفحہ ٢٤٢، مطبعۃ الآداب المؤید، مصر، ١٣١٧ھ

[4] : الکاسانی۔ حوالۂ بالا۔

[5] : کمال الدین محمد بن عبد الواحد السیواسی المعروف بابن الہمام : فتح القدیر۔ جلد ٨ صفحہ ١٣٦، کتاب احیاء الموات، المکتبۃ الامیریۃ بولاق، مصر۔ ١٣١٨ھ۔ مختصر الطحاوی صفحہ ١٢٤-١٢٥، مطبعۃ دار الکتاب العربی، قاہرہ ١٣٧٠ھ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا امکان نہ باقی رہے گا۔[51] بنا بریں مجلۃ الاحکام العدلیہ میں اس رائے کو ضابطہ کی شکل دے دی گئی ہے (دفعہ ۱۲۷۲)۔ امام ابوحنیفہ نے اپنی رائے کی تائید میں ذیل کی حدیث بھی پیش کی ہے۔

لیس للمرء الا ما طابت بہ نفس امامہ۔[52]

انسان کو اسی چیز کا حق پہنچتا ہے جس پر اس کا امام (صدرِ ریاست) راضی ہو۔

لیکن امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ جمہور فقہا اس رائے کو صحیح نہیں سمجھتے۔[53] ان کے نزدیک اگر دوسری شرطیں پوری ہو رہی ہوں تو شریعتِ اسلامی کی نگاہ میں افراد کو آپ سے آپ قبضہ کا حق حاصل ہے۔ ریاست سے باقاعدہ اجازت حاصل کرنا ضروری قرار دینے کے لیے کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اس باب میں امام ابوحنیفہ کی رائے زیادہ تر مصالح عامہ کی رعایت پر مبنی ہے۔ مصالح عامہ کے نقطۂ نظر سے ان کی رائے کی اہمیت جدید حالات میں اور بڑھ گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اس طرح کی افتادہ زمینیں بافراط پائی جاتی تھیں۔ اب شاذ و نادر ہی مل سکتی ہیں۔ انسانی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ ذرائع حمل و نقل کی فراوانی نے آبادی سے دور ہونے یا نزدیک ہونے کے فرق کو ناقابلِ لحاظ بنا دیا ہے۔ ریاست کی اجازت ضروری ہو تو اس خطرے کا ازالہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک صاحبِ دولت اٹھ کھڑا ہو اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس طرح کی ساری زمینوں کو اپنی ملکیت بنا لے۔ یہ احیائے موات کی ایک ایسی شکل ہو گی جس سے مفادِ عامہ کو بالآخر نقصان پہنچے گا۔ ان وجوہ سے موجودہ حالات میں مناسب یہی ہو گا کہ افتادہ زمینوں کی آبادکاری کے خواہاں افراد کو ریاست سے اجازت حاصل کرنے کا مکلف بنا دیا جائے۔ اسلامی قانون کے جدید ماہرین کا رجحان مجلۂ عثمانیہ کی طرح اس رائے کو ضابطہ کی شکل

---

۵۱ : قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم: کتاب الخراج صفحہ ۷۷، مطبعہ سلفیہ، قاہرہ - ۱۹۴۶ء

۵۲ : ابن ہمام: فتح القدیر بحوالۂ بالا اور بدائع الصنائع جلد ۶ صفحہ ۱۹۵

۵۳ : ابو یوسف: بحوالۂ بالا صفحہ ۷۶-۷۷، فتح القدیر بحوالۂ بالا۔ اور مؤطا امام محمد: کتاب الصرف و ابواب الربا۔ باب احیاء الارض باذن الامام او بغیر اذنہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دے دینے کے حق میں ہے[۵۱]۔

مندرجہ بالا شرائط کی تکمیل کے باوجود کسی افتادہ بنجر زمین (موات) پر مجرّد قبضہ کسی فرد کو اس قطعۂ زمین کا مالک نہیں بنا دیتا۔ قبضہ سے فرد کو صرف اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ پھر کوئی دوسرا فرد اس قطعۂ زمین پر قبضہ نہیں کر سکتا، اور ایک معیّنہ مدّت تک اُسے اس بات کا موقع رہتا ہے کہ محنت کر کے اس زمین کا احیاء کرے۔ احیاء کے معنی ہیں زمین کو مفید مصرف میں لانا جس کی عام شکلیں آبپاشی وغیرہ کے ذریعہ سے قابلِ کاشت بنا لینا، یا اس پر عمارت تعمیر کر لینا ہیں۔ حقِ ملکیت احیاء کر لینے پر حاصل ہوتا ہے[۵۲]۔ قبضہ ابتدائی ملکیّت کے پیش خیمہ یا مقدمہ کی حیثیّت رکھتا ہے۔ اگر مدّت متعیّنہ کے اندر فرد اس زمین کو مفید استعمال میں نہ لا سکا تو اس کا حقِ احیاء سوخت ہو جاتا ہے۔ زمین اب اس کے قبضہ سے باہر اور دوسرے افراد کے لیے قبضہ کے قابل قرار پا جاتی ہے۔

جمہور فقہاء نے سنّت کی روشنی میں اس عبوری دور کی مدّت تین سال مقرّر کی ہے جس میں قبضہ کرنے والے کو احیاء کر لینے کا موقع ہوگا۔

عن طاؤس قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم: عادیّ الارض للہ وللرّسول ثمّ لکم من بعد فمن احیا ارضاً میتۃً فھی لہٗ، ولیس لمحتجرحق بعد ثلاث سنین[۵۳]۔

طاؤس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: زمانہ قدیم سے افتادہ چلی آنے والی زمینیں اللہ اور اس کے رسول کی ہیں، پھر وہ ان کی جانب سے تمہارے لیے ہیں۔ پس جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اس کی ہو گئی۔ اور احاطہ بندی کرنے والے کا تین سال بعد کوئی حق باقی نہ رہ جائے گا۔

۵۱: محمد یوسف موسیٰ: الاموال ونظریۃ العقد فی الاسلام۔ صفحہ ۱۸۷، قاہرہ ۱۹۵۲ء

۵۲: الکاسانی: بدائع الصنائع، جلد ۶، صفحہ ۱۹۴

۵۳: ابو یوسف: کتاب الخراج۔ صفحہ ۷۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدت کی تعیین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی تھی:

عن عمرو بن شعیب ان عمر رضی اللہ عنہ جعل التحجیر ثلاث سنین فان ترکہا حتی تمضی ثلاث سنین فاحیاھا غیرہ فھو احق بھا۔[1]

عمرو بن شعیب سے روایت کی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے احاطہ بندی کی مدت تین سال مقرر کی۔ اگر احاطہ بندی کرنے والا زمین کو چھوڑے رکھے تاآنکہ تین سال گذر جائیں اور پھر کوئی دوسرا فرد اس زمین کا احیاء کرلے تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہوگا۔

احاطہ بندی سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی افتادہ قطعۂ زمین کے گرد چار دیواری کھینچ کر اس پر قبضہ کرے۔ اس شخص کو تین سال تک اس بات کا موقع حاصل رہے گا کہ وہ محنت کرکے اس زمین کو مفید استعمال میں لے آئے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدت کی یہ تعیین قطعی اور دائمی ہے یا یہ کہ ایک انتظامی حکم ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے حالات کی مناسبت سے دیا تھا؟ موخر الذکر صورت میں زمین کی نوعیت، زمانہ کے حالات اور سماج کی ضروریات کے اعتبار سے اس مدت میں رد و بدل کیا جاسکتا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ کسی زمانہ میں عام طور پر زمینوں کو کارآمد بنانے کے لیے اس سے کم مدت کافی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مخصوص قطعہ زمین کی بازیافت اور آبادکاری کے لیے اس سے زیادہ مدت درکار ہو۔ اگر یہ مخصوص مدت قرنِ اول کے حالات و ضروریات کے پیشِ نظر متعین کی گئی تھی تو اس میں رد و بدل کی گنجائش ہے۔ امام شافعی کی رائے یہی ہے[2]، اور شوافع کے نزدیک احاطہ بندی کرنے والے کے لیے شرعاً کوئی مخصوص مدت نہیں متعین کی گئی ہے۔ بلکہ اگر اس نے عرصۂ دراز تک اس زمین کو کارآمد نہیں بنایا تو ریاست

---

[1] یحییٰ بن آدم القرشی (م ۲۰۳ھ) کتاب الخراج صفحہ ۹۱ مطبعہ سلفیہ قاہرہ ۱۳۴۷ھ نیز ابو یوسف کتاب الخراج ص ۶۵

[2] (Nicholas P. Aghnids: Mohammedan Theories of Finance Page 504; New York, Columbia University 1916

www.KitaboSunnat.com

اس سے مطالبہ کرے گی کہ یا تو زمین کو کارآمد بنائے یا چھوڑ دے[۵۱]۔ دورِ جدید کے حالات پر نگاہ کرتے ہوئے ہماری رائے یہ ہے کہ شافعی مسلک کے مطابق اس بات کو حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے کہ قبضہ کرنے والے کو احیاء کے لیے کتنی مدت تک موقع دیا

غیر مملوکہ افتادہ زمینوں کو کارآمد بنانے والے کے حق ملکیت کا ثبوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث سے ملتا ہے جن میں سے ایک حدیث اوپر نقل کی جا چکی ہے۔ اوپر فقہاء کے حوالہ سے جو دوسرے ضابطے نقل کیے گئے ہیں وہ بھی زیادہ تر حدیثوں سے ماخوذ ہیں۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:

"من اعمر ارضاً لیست لاحدٍ فھو احق بھا" قال عروۃ قضی بھا عمر فی خلافتہ[۵۲]۔

عائشہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"جو کسی ایسی زمین کو آباد کرلے جو کسی کی ملکیت نہ ہو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے"۔

عروہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اسی کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔

عن سعید بن زید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من احیی ارضاً میتۃ فھی لہ ولیس لعرقٍ ظالمٍ حق[۵۳]۔

سعید بن زید نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جس نے کسی مُردہ زمین کو کارآمد بنا لیا وہ اس کی ہوگئی اور ظالم کے لیے کوئی حق نہیں۔

موتان الارض للہ وللرسول ثم ھی لکم منی ایھا المسلمون[۵۴]۔

مردہ زمینیں اللہ کی اور اس کے رسول کی ملک ہیں۔ اس کے بعد اے مسلمانو یہ میری

---

۵۱ : یحییٰ بن شرف النووی- منہاج الطالبین وعمدۃ المفتین صفحہ ۶۹ نیز الغزالی : الوجیز - بحوالہ بالا

۵۲ : بخاری : ابواب الحرث والمزارعہ وماجاء فیہ - باب من احیا ارضاً مواتاً

۵۳ : ابوداؤد : کتاب الخراج والفئی والامارہ - باب احیاء الموات

۵۴ : ابوعبید القاسم بن سلام : کتاب الاموال ص۲۸۶ مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ - قاہرہ ۱۳۵۳ھ

۵۵ : یہ روایت کتاب الاموال کے حاشیہ نگار محمد حامد الفقی نے حافظ ابن حجر کی التلخیص الحبیر کے حوالے سے پیش کی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانب سے تمہارے لیے ہیں۔

اس مفہوم کی ایک حدیث اوپر بھی گذر چکی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ افتادہ زمینوں کا مالک اللہ اور اس کا رسول ہے۔ اور ایسی زمینوں کو کارآمد بنا لینے والے کو اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے اس زمین پر حق ملکیت حاصل ہو جائے گا۔

اس طرح کے قبضہ ابتدائی کو دنیا کے تقریبًا تمام قوانین میں ذریعہ ملکیت تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے اسے جن شرائط کا پابند بنایا ہے۔ اس نے اس ضابطہ کو ایک مخصوص مزاج عطا کر دیا ہے۔ اسلامی ضابطہ کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں بنائے ملکیت صرف قبضہ نہیں بلکہ قبضہ کر کے کارآمد بنانے کو قرار دیا گیا ہے۔ اس امر کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ ایک فرد کا قبضہ دوسرے افراد یا سارے معاشرہ کے لیے مضرت رسانی کا باعث نہ بنے۔ ان امتیازات کی بنا پر اسلامی ضابطہ نظریۂ ملکیت بر بنائے قبضہ (Occupancy Theory of Property) سے مختلف مزاج کا حامل ہے۔ اسلام نے ہر حال میں ذاتی ملکیت کو مفید انسانیت بنا کر رکھنے کا اہتمام کیا ہے اور یہ اہتمام اس ضابطہ میں بہت نمایاں ہے۔

دورِ جدید میں ملکیت کے اس ذریعہ کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ تاریخ کے گذشتہ ادوار میں جب آبادی کم تھی اور زمینیں بکثرت افتادہ و بیکار پڑی رہتی تھیں تو اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ ماضی قریب میں نئے براعظموں کی دریافت نے ایک بار پھر وہی صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ اب سائنس کی ترقی نے عظیم ریگستانوں، برف سے ڈھکے ہوئے علاقوں، اور زیرِ سمندر زمین کو مفید استعمال میں لانے کی راہیں کھول دی ہیں۔ ان نئے امکانات کے پیشِ نظر اس ذریعہ کی اہمیت پھر بڑھ جاتی ہے کیونکہ کرۂ ارض کا بیشتر حصہ سمندر، برف، یا ریت سے ڈھکا ہوا ہے۔

۲۔ شکار:

افتادہ زمینوں کے علاوہ جنگل کے جانور، پانی اور گھاس وغیرہ بھی ایسی چیزیں ہیں جو قبضہ ابتدائی کے ذریعہ انفرادی ملکیت میں داخل کی جا سکتی ہیں[۱]۔ غیر مملوکہ زمینوں کے درخت

---

[۱] : مجلۃ الاحکام العدلیہ: دفعات ۱۲۳۴، ۱۲۴۳، ۱۲۴۷ اور ۱۲۴۸ نیز بدائع الصنائع۔ جلد ۶، صفحات ۱۹۳، ۱۹۴

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اُن کے پھل بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ قرآن نے خشکی اور سمندر میں پائی جانے والی حلال مخلوقات کے شکار کو رزقِ حلال کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی، چارہ اور آگ کو مباح عام اشیا قرار دے کر ہر فرد کو اس بات کا حق دیا ہے کہ وہ بقدرِ ضرورت استعمال میں لانے کے لیے ان چیزوں کو اپنی ملکیت بنا سکے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الناس شرکاء فی الماء والکلاء والنار۔[۵۱]

سارے انسان پانی، گھاس اور آگ میں شریک ہیں۔

المسلمون شرکاء فی ثلث فی الماء والکلاء والنار۔[۵۲]

سارے مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں۔ پانی، گھاس اور آگ میں۔

شکار کے ذریعہ جانوروں پر قبضہ کرنے کی ایک شرط یہ ہے کہ بلا اجازت دوسروں کی مملوکہ زمین نہ استعمال کی جائے اور نہ ایسے جنگلات میں شکار کھیلا جائے جو ریاست نے سرکاری اغراض کے لیے مخصوص قرار دے دیے ہوں۔[۵۳] ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں ہر فرد کو ان ذیلی ضوابط کی پابندی کرنی ہوگی جو حکومت مصالحِ عامہ کے پیشِ نظر وقتاً فوقتاً وضع کرے۔

سمندر، دریا، جھیل اور تالاب وغیرہ پانی کے بڑے بڑے ذخیرے انفرادی ملکیت نہیں بن سکتے لیکن ہر فرد کو ان میں سے اپنی مختلف ضروریات مثلاً پینے اور آبپاشی کے لیے پانی حاصل کرنے کا حق ہے۔ جو پانی ان ذخیروں سے نکال کر محفوظ کر لیا جائے وہ ذاتی ملکیت بن جاتا ہے۔ کنوئیں کا پانی بھی اصلاً مباح عام ہے مگر کنوئیں کے مالک کو اردگرد کی زمینوں کی ملکیت کے سبب دوسرے افراد کو، اپنی ضرورت کی حد تک روکنے کا حق حاصل ہے۔

ان پانیوں میں جو مچھلیاں یا دوسری قدرتی مخلوقات پائی جاتی ہیں وہ بھی مباح عام ہیں۔

---

۵۱ : ابو عبید : کتاب الاموال، صفحہ ۲۹۵

۵۲ : ابوداؤد : کتاب البیوع - باب فی منع الماء، ابن ماجہ : باب المسلمون شرکاء فی ثلاث اور ابو یوسف : کتاب الخراج، صفحہ ۱۱۵

۵۳ : کاسانی : بدائع الصنائع - جلد ۶ - صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہر مباح عام چیز کی طرح یہ بھی قبضہ کے ذریعہ ذاتی ملکیت بنائی جا سکتی ہیں۔ بعض محققین کے نزدیک یہی اصول ذاتی طور پر تعمیر کرائے ہوئے حوض یا تالاب پر بھی منطبق ہوتا ہے[۱]۔

ایسے حالات میں جبکہ کسی مباحِ عام چیز تک پہنچنے کے لیے کسی کی زمین میں سے گزرنا ضروری ہو، زمین کے مالک کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ البتہ اگر ضرورت مند کو مطلوبہ چیز کسی اور ذریعہ سے نہ مل سکتی ہو تو اسے مالکِ زمین کے منع کرنے کے باوجود مباحِ عام چیز کو حاصل کرنے کے لیے اس کی زمین پر سے گزرنے کا حق حاصل ہے[۲]۔ بعینہٖ یہی اصول گھاس اور خودرو چارے پر بھی منطبق ہوتا ہے[۳]۔

۳۔ معدنیات اور دفینے (رکاز):

پانی، آگ اور چارے وغیرہ کی طرح معدنی اشیاء کے وہ ذخیرے بھی مباحِ عام ہیں جو سطح زمین پر کھلے ہوئے پائے جائیں (یعنی معادنِ ظاہرہ) اور جن کے حصول میں زیادہ محنت کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔ نمک، تارکول، پارہ اور کیمیاوی خاصیتیں رکھنے والے معدنی پانی کے ذخیرے اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ہر فرد کو ان ذخیروں سے استفادہ کا حق حاصل ہے۔ جو فرد ان چیزوں کو جتنی مقدار میں نکال لے گا وہ قبضہ کی بنا پر ان کا مالک ہو جائے گا[۴]۔ البتہ خود یہ ذخیرے انفرادی ملکیت نہیں بنائے جا سکتے۔ یہی حیثیت سمندر میں پائے جانے والے موتی، مرجان اور دوسری قیمتی اشیاء کی بھی ہے[۵]۔

ان معدنی ذخیروں کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے جو زمین کے اندر چھپے

---

[۱] : کاسانی: بدائع الصنائع، جلد ۶، صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴

[۲] : 〃 : 〃 〃 ، صفحہ ۱۸۸ تا ۱۹۳، اور مجلۃ الاحکام العدلیہ دفعات ۱۲۴۸، ۱۲۵۵

[۳] : 〃 : 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ، 〃 ، 〃

[۴] : کاسانی: بدائع الصنائع، جلد ۲، صفحہ ۶۵، موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامۃ (م ۶۲۰ھ): المغنی جلد ۲، ص ۶۲۱۔ مطبعۃ المنار، مصر ۱۳۴۵ھ، اور عبدالرحمان الجزیری: الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد ۱، زکوٰۃ المعدن والرکاز۔ شرکۃ فن الطباعۃ۔ قاہرہ۔

[۵] : ملاحظہ ہو مذکورہ بالا مآخذ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے پائے جاتے ہیں (یعنی معادنِ باطنہ) اور جن کے نکالنے میں کافی محنت اور اخراجات کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً سونے، چاندی، لوہے، اور تانبے وغیرہ کی کانیں حنفی، شافعی، اور حنبلی مکاتبِ فقہ کی رائے یہ ہے کہ اگر یہ کانیں کسی شخص کی مملوکہ زمین میں پائی جائیں تو مالکِ زمین کی یا اس شخص کی ملکیت ہوں گی جس کو زمین کے مالک نے ان کے نکالنے کی اجازت دی ہو۔ اگر یہ کانیں غیر مملوکہ اور مباح عام زمینوں میں پائی جائیں تو اس شخص کی ملکیت ہوں گی جو ان کو دریافت کرے اور نکالے۔ تفصیلات کے اندر دن مکاتبِ فقہ کے درمیان اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں قابلِ ترجیح رائے مالکی مکتبِ فقہ کی ہے جس کے مطابق زمین کے اندر پائی جانے والی کانیں اصلاً تمام مسلمانوں کی ملکیت ہیں اور ان کی مالکِ مختار اسلامی ریاست ہے[۱]۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہم ساتویں باب میں کریں گے۔

دفینوں سے مراد وہ سکے، سونے چاندی کے برتن، اسلحہ، اور دوسرے قیمتی سامان ہیں جو زمین کے اندر دفن کیے ہوئے پائے جائیں۔ اگر قرائن سے یہ ثابت ہو جائے کہ دفینہ اسلامی دورِ حکومت سے پہلے کا ہے اور اس کا مالک کوئی مسلمان یا ذمی نہیں تھا۔ تو وہ پانے والے کی ملکیت بن جائے گا، بشرطیکہ اس نے اسے اپنی مملوکہ زمین میں یا کسی ایسی زمین میں پایا ہو جو کسی کی ملکیت نہ ہو۔ مملوکہ زمین میں پائے جانے والے دفینے زمین کے مالک کی ملکیت قرار پائیں گے[۲]۔ دفینہ اگر ریاست کی کسی زمین میں پایا گیا ہے تو وہ ریاست

---

[۱] : مالکی مسلک کے لیے ملاحظہ ہو۔ امام مالک بروایت سحنون عن عبدالرحمٰن بن القاسم: المدونۃ الکبریٰ مطبع خیریہ مصر ۱۳۲۴ھ۔ جلد ا صفحہ ۲۴۷/۲۴۹ اور اس پر ابنِ ارشد کے "مقدمات" صفحہ ۲۴۱/۲۴۳ اور "بلغۃ السالک لاقرب المسالک" تالیف الشیخ احمد الصاوی۔ علی الشرح الصغیر للدردیر۔ جلد ا صفحہ ۲۱۴ مصطفیٰ بابی و اولادہ۔ مصر ۱۳۴۰ھ

حنفی مسلک کے لیے کاسانی: بدائع الصنائع جلد ۲ صفحہ ۶۵/۶۸، ابو یوسف: کتاب الخراج صفحہ ۲۲، ابنِ عابدین: ردّ المحتار علی درّ المختار جلد ۲ صفحہ ۶۰

شافعی مسلک کے لیے نووی: منہاج الطالبین و عمدۃ المفتین۔ باب زکوٰۃ المعدن والرکاز والتجارۃ۔

حنبلی مسلک کے لیے المغنی: بحوالۂ بالا صفحہ ۶۲۰/۶۲۱، نیز چاروں مکاتبِ فقہ کی آراء کے لیے۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ جلد ا۔ صفحات ۶۱۶ تا ۶۲۰۔

[۲] : ملاحظہ ہوں مذکورہ بالا مآخذ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ملکیت قرار پائے گا۔

اگر سکے اسلامی دور کے ہوں، یا قرائن سے یہ ثابت ہو جائے کہ مال مدفون کسی مسلمان یا ذمّی کی ملکیت تھا تو وہ "لقطہ" قرار پائے گا اور پانے والے کی ملکیت میں نہیں داخل ہو گا۔ اگر دفینہ کی حیثیت مشتبہ ہو، اور قرائن سے اس بات کا فیصلہ نہ کیا جا سکے کہ وہ کس دور کا ہے اور کس کی ملکیت ہے تو ایک رائے یہ ہے کہ اسے غیر اسلامی دور کا دفینہ قرار دے کر زمین کے مالک کی، یا غیر مملوکہ زمین میں اُسے پانے والے کی، ملکیت قرار دیا جائے؛ اور دوسری رائے یہ ہے کہ اسے اسلامی دور کا مال سمجھ کر لقطہ قرار دے دیا جائے۔[۵۲] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہم ساتویں باب میں کریں گے۔

(ب) انتقالِ ملکیّت بذریعہ معاہدہ:

حصولِ ملکیت کا دوسرا شرعی طریقہ کسی مملوکہ چیز کا شرعًا درست معاہدہ کے ذریعہ مالک سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہونا ہے۔ یہ انتقال بالعوض بھی ہو سکتا ہے اور بلا عوض بھی۔ اس طرح کے انتقالِ ملکیت کی ایک عام شکل تجارتی سودے کی ہے جس کے ذریعہ کسی چیز کی ملکیت فروخت کنندہ سے خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ دوسری شکل ہبہ کی ہے۔ ایک فرد کو دوسرے فرد، ادارے یا ریاست کی جانب سے عطیہ مل سکتا ہے۔ اسی کی ایک شکل وصیّت بھی ہے جس کے ذریعہ مالک کے مرنے کے بعد متعلقہ ملکیّت اس شخص کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جس کے حق میں وصیّت کی گئی ہو۔

وصیّت کے علاوہ ایسے تمام معاہدوں میں طرفین کی رضامندی شرط ہے۔ یہاں ہمیں ان تفصیلی ضوابط کا جائزہ نہیں لینا ہے جو تجارتی سودے، ہبہ یا وصیّت کے سلسلہ میں اسلام نے

---

۵۱ : پچھلے صفحہ (۱۴۲) کا نوٹ ملاحظہ ہو۔

۵۲ : پہلی رائے احناف کی ہے۔ اگرچہ بعض حنفی فقہاء نے دوسری رائے بھی اختیار کی ہے۔ ملاحظہ ہو کاسانی: بدائع الصنائع، جلد ۶، صفحہ ۶۵-۶۶ اور فتح القدیر جلد ا، صفحہ ۵۴۷۔ دوسری رائے حنابلہ کی ہے ملاحظہ ہو المغنی جلد ۲، صفحہ ۶۱۳۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے مقرر کیے ہیں ۔ ان ضابطوں کا منشاء یہ ہے کہ معاملہ جبر و اکراہ، دھوکا فریب، اور ابہام و لاعلمی سے پاک ہو ۔ اور کوئی فریق دوسرے کا استحصال نہ کرے ۔ ایسے ضابطے مقرر کیے گئے ہیں کہ ایک فریق دوسرے فریق کے بھولے پن، کمزوری و بے بسی، شدتِ احتیاج اور ناواقفیت سے بے جا فائدہ نہ اٹھا سکے ۔

بعض حالات میں انتقالِ ملکیت کا معاملہ جبراً بھی کرایا جا سکتا ہے ۔ اس کی نمایاں ترین مثال حق شفعہ کی ہے ۔ مالک اگر اپنی غیر منقولہ جائداد مثلاً مکان، کھیت، باغ وغیرہ فروخت کرتا ہو تو اس کی خریداری کا اوّلین حق شریک یا پڑوسی کو پہنچتا ہے[1] ۔ وہ مالک کو مجبور کر سکتا ہے اگر اسے جائداد فروخت کرنا ہے تو دوسرے خریداروں پر اسے ترجیح دے ۔ مالکی فقہ میں بعض منقولہ املاک کے سلسلہ میں بھی شفعہ کا حق تسلیم کیا گیا ہے لیکن حنفی فقہ کے مطابق اس کا اطلاق صرف غیر منقولہ املاک پر ہوتا ہے ۔ امام شافعی کے نزدیک یہ حق پڑوسی کو نہیں ۔ صرف شریک کو پہنچتا ہے[2] ۔ شریک اُسے کہتے ہیں جو متعلقہ جائداد، سامان یا جانور کے ایک حصّہ کا مالک ہو اور ابھی بٹوارہ نہ ہوا ہو، یا خود وہ چیز ناقابلِ تقسیم ہو ۔ حنفی مسلک کی تائید متعدد احادیث سے ہوتی ہے جن کا مطالعہ متعلقہ مآخذ سے کیا جا سکتا ہے ۔ شریک کے لیے اس حق کا ثبوت دوسرے قوانین میں بھی ملتا ہے مگر پڑوسی کو حقِ شفعہ دینا اسلامی فقہ کا خصوصی امتیاز ہے ۔

معاہدۂ بیع میں جبر و اکراہ کا دخل ایسے حالات میں بھی جائز ہے جب ریاست اجتماعی ضروریات کے لیے کسی ذاتی ملک کے حصول پر مجبور ہو ۔ اس پر تفصیلی گفتگو بارھویں باب میں کی گئی ہے ۔

(ج) وراثت :

انتقالِ ملکیت کی ایک شکل خونی رشتہ کی بنا پر ملکیت کا ایک فرد سے دوسرے فرد

---

[1] : الکاسانی - بدائع الصنائع - جلد ۵ - صفحہ ۴

[2] : " " " "

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی طرف منتقل ہونا ہے۔ انتقالِ ملکیت کی اس شکل کو پچھلی شکلوں سے ممتاز کرنے والی چیز یہ ہے کہ اس میں مالک کی رضامندی شرط نہیں ہے۔ یہ انتقال مالک کی مرضی سے قطع نظر بلکہ بعض اوقات اس کے علی الرّغم شارع کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ شارع نے ان رشتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے جن کے پائے جانے پر مرنے والے کی ملکیت کے مقررہ حصے متعین افراد کو منتقل ہوں گے۔ وراثت کا ضابطہ قرآن کریم میں سورۂ نساء میں ملتا ہے اور اس کی مزید تشریح سنّت نے کر دی ہے۔ ضابطۂ میراث کے مطابق ایک فرد کو اس کے ماں باپ اور دوسرے قریبی اعزّہ کے انتقال پر ان کی ملکیت کا ایک حصہ مل جاتا ہے۔ مرنے والے کی ملکیت کی اس ضابطہ کے مطابق تقسیم لازمی ہے اور بجز ایک تہائی ملکیت کی حد تک وصیّت کا اختیار استعمال کرنے کے مالک اس میں کوئی ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ بعض مغربی ممالک کے توریث اولادِ اکبر کے قانون کے برخلاف یہ ضابطہ مرنے والے کی جائداد کو عموماً متعدد افراد کے درمیان تقسیم کر دیتا ہے جس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔

چونکہ حصولِ ملکیت کے اس ذریعہ پر بعض بنیادی اعتراضات کیے گئے ہیں اس لیے اس پر اجمالی بحث بے محل نہ ہوگی۔

جان لاک اور جان اسٹوارٹ مل نے وراثت کے خلاف یہ دلیل پیش کی ہے کہ یہ بات تصوّرِ ملکیت کے منافی ہے، یا کم از کم یہ کہ اس سے اخذ نہیں کی جا سکتی، کہ مالک کی ملکیت اس کی مرضی سے قطع نظر لازماً چند متعین رشتہ داروں کا حق قرار پائے۔ ملکیت کا تصوّر یہ چاہتا ہے کہ مالک کو اس بات کا حق دیا جائے کہ وہ اپنے بعد اپنی جائداد جس کو چاہے منتقل کر دے۔ گویا وصیّت کا مطلق حق تصوّرِ ملکیت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے[۱]

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس طرح ایک فرد کو بغیر اس کی اپنی محنت کے، اور بلا لحاظ اس کے کہ وہ لائق ہے یا نالائق مفت دولت ملتی ہے جو انصاف کے خلاف اور مصالح کے منافی ہے۔ اس طریقہ سے سماج میں دولت کی تقسیم میں ناہمواری بھی بڑھتی ہے۔ مناسب

---

[۱] (Ency lopaedia Britainica Vol. XII Article on interitence)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے کہ وراثت کا طریقہ ختم کر کے مرنے والے کا ترکہ ریاست کے خزانے میں داخل کر دیا جایا کرے۔[1]

پہلا اعتراض ملکیت کے مطلق تصور پر مبنی ہے اور اس لیے اسلام کے نزدیک ناقابلِ قبول ہے۔ اولاد، ماں باپ، اور دوسرے قریبی اعزّہ کے خونی رشتہ کو ترکہ کی تقسیم کی بنیاد بنانے کے بجائے پورے ترکہ پر وصیّت نافذ کرنے کا حقِ ملکیت کے اسی مطلق تصور سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسلام میں فرد کی ملکیت دراصل نیابتی ملکیت ہے، اصل مالک اللہ ہے جس نے فرد کو اپنی زندگی گذارنے کے لیے مال و املاک بطور ذرائع عطا کیے ہیں۔ جب وہ اپنی زندگی پوری کر چکا تو اس کے چھوڑے ہوئے مال کی یہ حیثیت ختم ہو گئی، اب اسے بہرصورت دوسروں کے کام آنا ہے۔ یہ ذرائع کن لوگوں کو کس نسبت سے عطا کیے جائیں، اس کا فیصلہ کرنے کا حق اصل مالک ہی کو حاصل ہے۔ فرد کو جس مقصد کے تحت حقِ ملکیت ملا تھا وہ اس کی زندگی پوری ہونے کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مالکِ حقیقی نے انسانوں کے عمومی مفاد و مصالح کے پیشِ نظر ترکہ کی تقسیم کا ایک ضابطہ مقرر کر دیا جو گوناں گوں برکات کا حامل ہے۔ اگر فرد کو وصیّت کے ذریعہ اپنی ساری ملکیت اپنے منشاء کے مطابق دوسروں کو منتقل کرنے کا حق دیا جاتا تو کوئی ضروری نہیں تھا، بلکہ اس کا بہت کم امکان تھا، کہ وہ انسانی زندگی کے ان تمام مصالح کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتا۔

وراثت کا بہت گہرا تعلق خاندانی نظام اور عائلی زندگی سے بھی ہے۔ وراثت کا نظام خاندان کو تسلسل بخشنے اور اسے ایک وحدت کے طور پر برقرار رکھنے میں بہت اہم حصہ لیتا ہے۔ خاندان کے مختلف افراد کے درمیان باہمی تعاون اور خدمت کا جو تعلق قائم ہے اسے باقی رکھنے اور مستحکم کرنے میں جہاں طبعی اور جذباتی عوامل کو دخل ہے وہاں مادّی اور معاشی عوامل

---

[1] مشہور افادی مفکر بنتھم بھی وراثت کا طریقہ ختم کر دینے کا قائل تھا۔ سوشلسٹ مفکرین بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:

(J. D. H. Cole : Inheritance ;

Encyclopaedia of Social Science Vol VIII)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اسلام کے قانونِ وراثت اور محروم یا معذور افرادِ خاندان کی کفالت کے بارے میں اس کے ضوابط کا ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس نے معاشی زندگی میں خاندانی تعلقات کو کتنی اہمیت دی ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ نفقاتِ واجبہ کی بحث میں دیکھیں گے[1]، جن رشتہ داروں کو ایک فرد کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ میں حصہ دار بنایا گیا ہے انہی رشتہ داروں پر یہ ذمہ داری بھی ڈالی گئی ہے کہ اس فرد کی زندگی میں بشرطِ ضرورت اس کی معاشی کفالت کریں۔ اس طرح اسلام میں خاندان کا ادارہ فرد کے بنیادی معاشی مفادات کا محافظ، اور اس کی ناگزیر ضروریاتِ زندگی کا کفیل بنایا گیا ہے۔ اس اصول کا تقاضا ہے کہ اگر ایک طرف افرادِ خاندان کی ایک دوسرے کے ضمن میں معاشی ذمہ داریاں متعین ہوں تو دوسری طرف ان کے معاشی حقوق بھی متعین ہوں۔ اسلام میں ترکہ کے اندر مختلف رشتہ داروں کے اضافی حصوں کی تعیین کو اس اصول کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

اگر ترکے میں مختلف رشتہ داروں کے اضافی حقوق نہ متعین کیے جائیں بلکہ مالک کو وصیت کا مطلق حق دے دیا جائے تو یہ اصول قائم نہیں رہ سکتا۔ مالک کو اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو بھی محروم کرنے کا اختیار مل جاتا ہے جو خاندان کی معاشی اہمیت کو ختم کر دینے والی چیز ہے۔ بعض رشتہ داروں کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنے کے نتیجہ میں خاندان میں جھگڑے پیدا ہونے اور اس کا امن و سکون درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ خاندانی زندگی کو اندیشوں، بے اطمینانی، عدمِ تحفظ اور تنازعات سے پاک رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر مرنے والے وارث کا مقام معلوم اور متعین ہو۔ ورثاء کے حصوں کا قانوناً متعین ہونا خاندان کی فضا کو رشک و حسد، بغض و کینہ اور دوسرے پست جذبات سے اور خود غرضانہ سازشوں سے پاک رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے ورثاء کے اضافی حصے متعین کر دیے ہیں اور مالک کو اس میں کسی قسم کے رد و بدل کا اختیار نہیں دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک تہائی جائداد کی حد تک وصیت کا حق بھی ورثاء کے مابین ترکہ کی تقسیم کے شرعی تناسب

---

[1] : ملاحظہ ہو باب ۶

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو نہیں بدل سکتا۔[۵]

اس تناسب کی تعیین اللہ تعالیٰ نے خود کر دی ہے کیونکہ وہی انسانوں کے مصالح کا مکمل علم رکھتا ہے۔

آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۔ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۔ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۔ (نساء : ۱۱)

تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور حکمت والا ہے۔

دوسرا اعتراض بھی ملکیت کے بارے میں ایک ایسا نقطۂ نظر ظاہر کرتا ہے جو اسلام کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ معترضین کا موقف یہ ہے کہ کسی فرد کو بغیر محنت کے ملکیت نہ حاصل ہو۔ بغیر محنت کے ملکیت کا حصول وہ صرف ریاست کے لیے جائز سمجھتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک ملکیت صرف محنت پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق چند مفید انسانیت اعمال و وظائف سے بھی ہے جو ملکیت کے شرعی استعمال سے وابستہ ہیں۔ اگر کسی مخصوص شکل میں ملکیت بغیر محنت کے حاصل ہو لیکن اس کے ذریعہ دولت کا اس طور پر استعمال میں آنا ممکن ہو جائے کہ وہ سماج کے چند افراد کے لیے خصوصاً اور پورے سماج کے لیے عموماً مفید ثابت ہو تو اسلام اس شکل کو بھی مناسب خیال کرتا ہے۔

وارث کو جو دولت بغیر محنت کے ہاتھ آتی ہے وہ بالعموم اس کے کسی قریبی رشتہ دار کی محنت کا پھل ہوتی ہے جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں، اس رشتہ دار کو اپنی زندگی میں بشرط ضرورت اپنے ہونے والے وارث کی محنت کے پھل سے فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ہے۔ پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی سماجی نظام اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ ہر فرد اپنی محنت کے پھل سے خود ہی فائدہ اُٹھائے، کسی دوسرے کو اس سے فائدہ نہ پہنچے۔ انسان صرف اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے محنت نہیں کرتا بلکہ اپنی اولاد، اپنے ماں باپ اور دوسرے قریبی اعزہ کی کفالت یا امداد بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ ان رشتہ داروں کو وہ اپنی زندگی میں اپنی محنت کے پھل میں سے راضی

---

[۵] : ملاحظہ ہو باب ۴۔ انتقال ملکیت کا حق۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوشی ایک حصّہ دینا رہتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کے مرنے کے بعد ان رشتہ داروں کو اس کے ترکے کا وارث بنانا اس کی مرضی کے خلاف قرار دیا جائے یا اس پر اس وجہ سے اعتراض کیا جائے کہ یہ ترکہ ان کو بغیر کسی محنت کے ملتا ہے۔ مالک کی وفات پر اس کی چھوڑی ہوئی دولت بہر صورت دوسرے افراد ہی کے کام آئے گی جنہوں نے اس کے حصول کے لیے خود محنت نہ کی ہوگی۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ یہ دولت ایسے افراد کے کام آئے جن کا اس سے مستفید ہونا نہ صرف یہ کہ مالک کے نزدیک پسندیدہ تھا بلکہ جن کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ اس کی معاشی جدّ و جہد، دولت کمانے، پس انداز کرنے اور بطور ترکہ چھوڑ جانے کا ایک زبردست محرّک تھا۔

اگر وراثت کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور مرنے والے کی ساری املاک ریاست کو منتقل کر دی جایا کریں تو کسب دولت کا ایک اہم محرک ختم ہو جائے گا۔ چونکہ اس شکل میں بے سہارا متعلقین کو سہارا دینے کی ذمّہ داری ریاست کے سر ہوگی لہٰذا افراد کو صرف اپنی ذاتی ضروریات کی تکمیل کی فکر ہوگی اور بحیثیتِ مجموعی افراد میں محنت کرنے اور دولت حاصل کر کے اسے پس انداز کرنے کی امنگ کم سے کم تر ہوتی جائے گی۔

یہ خیال کہ افراد کے ہاتھوں میں آنے والی املاک کوئی مفید سماجی عمل نہیں انجام دیتیں اور ریاست کے ہاتھوں میں جانے والی املاک بہر صورت مفید عام طریقہ پر استعمال کی جاتی ہیں صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ دیکھیں گے اسلام نے اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ انفرادی ملکیّت مفادِ عامہ کے تابع رہے۔ اسلامی ضابطۂ میراث کی برکات سے سماج کا بہت بڑا حصّہ مستفید ہوتا ہے، نہ کہ کوئی محدود طبقہ۔ اس کے تحت بہت سے بے سہارا نابالغ لڑکے اور لڑکیوں کو، بیوائوں، عمر رسیدہ عزیزوں، بوڑھوں اور کمزور اور بے سہارا لوگوں کو سہارا مل جاتا ہے۔ معترضین کی تجویز کے مطابق سارے ترکے سرکاری خزانہ میں داخل کیے جائیں گے اور متوفّی کے بے سہارا متعلقین کو سہارا دینے کی ذمّہ داری بھی ریاست کے سر ہوگی۔ اس تجویز کو نظام وراثت کا ایک اچھا بدل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ریاست کو ایک زبردست دفتری نظام قائم کرنا ہوگا اور اس طرح حاصل ہونے والی املاک کا ایک حصّہ تنخواہوں اور دوسرے انتظامی مصارف پر خرچ ہو جائے گا۔ اگر ان املاک کو افراد کے ہاتھوں میں رکھنے سے بھی بے سہارا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگوں کو سہارا دینے کا مقصد حاصل ہو سکتا ہو تو ان درمیانی لوگوں کا اضافہ، اور اس دفتری نظام کا قیام، ایک کھلا ہوا اسراف ہے۔

پھر اس طرح حاصل ہونے والی املاک میں کارخانے، کھیت، اور تمام دوسرے ذرائع پیدائش شامل ہوں گے۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ سماج کا تمام سرمایہ اور جملہ ذرائع پیدائش ریاست کی ملکیت بن جائیں گے۔ افراد کے پاس صرف محنت، رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وراثت کا طریقہ ختم کر دینے کی تجویز سوشلسٹ سماج قائم کرنے کے پروگرام کا ایک جزو قرار دی گئی ہے[1]۔ اور پر ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ مکمل اجتماعی ملکیت کا اصول اختیار کرنے میں کیا خرابیاں مضمر ہیں اور اسلام اسے کیوں قبول نہیں کر سکتا۔

انفرادی ملکیت کی بقاء کے لیے ضروری ہے کہ مرنے والے کا ترکہ ریاست کو نہیں بلکہ افراد ہی کو منتقل ہو۔ وراثت کے ذریعہ بہت سے قابل کار افراد کو تعلیمی یا کاروباری زندگی کے آغاز ہی میں ایک سہارا مل جاتا ہے۔ ایک کاروباری یا تاجر کی اولاد اور دوسرے متعلقین کو اس کی زندگی میں بھی اس کے کاروبار میں حصہ لینے کے زیادہ مواقع مل سکتے ہیں اور انہی لوگوں کو اس کی موت کے بعد اس کاروبار کے خود چلانے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ عملی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ طریقہ کاروبار کے تسلسل اور ترقی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

یہ اعتراض بھی درست نہیں ہے کہ وراثت کا طریقہ سماج کے اندر دولت کی تقسیم میں پائی جانے والی ناہمواری میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ اسلامی ضابطہ میراث مرنے والے کی ملکیت کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور کسی دلیل سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح دولت کی تقسیم میں عدم مساوات بڑھتی ہے۔ طریقہ وراثت کے اثرات سے قطع نظر سماج میں دولت کی تقسیم کے اندر جو ناہمواری پائی جاتی ہے اسے کم کرنے کے دوسرے موزوں تر ذرائع موجود ہیں۔ اس مقصد کے لیے اس طریقہ کو ختم کرنا ضروری نہیں ہے۔

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ خاندان کے ادارہ کی بقاء اور استحکام کے لیے اور انفرادی ملکیت کو باقی رکھنے کے لیے وراثت کا طریقہ ضروری ہے۔ اس طریقہ کو ختم

[1]: ملاحظہ ہو جی۔ ڈی۔ ایچ۔ کول کا محولہ بالا مقالہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر دینا، یا مالک کو اپنے پورے ترکہ پر وصیّت کا حق دے دینا متعدد مفاسد کا باعث بن سکتا ہے[1]۔

(د) ثمراتِ ملکیّت :

حصولِ ملکیّت کا آخری ذریعہ ثمراتِ ملکیّت ہیں۔ اپنے باغ کے پھل، مویشی کی نسل، اور اس قسم کے دوسرے قدرتی ثمرات اصل مال کے مالک کی ملکیّت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ بات حقِ ملکیّت کے لازمہ کی حیثیّت رکھتی ہے کہ ثمراتِ ملکیّت مالک ہی کا حق سمجھے جائیں۔ بالعموم ان ثمرات کے برآمد ہونے میں مالک کی محنت اور نگرانی کو بھی خاصا دخل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حصولِ ملکیّت کے اس ذریعہ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

---

[1] : انتقالِ ملکیّت کی ایک اور شکل بھی ہے جسے وراثت سے مماثلت کے سبب اسلامی قانون پر لکھنے والے بعض ماہرین نے وراثت کے مثل قرار دیا ہے۔ بعض جرائم کا ارتکاب مجرم کو شرعًا اس بات کا مکلّف قرار دے دیتا ہے کہ اپنے مال کا ایک حصّہ بطور تاوان و تلافیِ نقصان اس شخص کے حوالے کر دے جسے اس جرم سے نقصان پہنچا ہو۔ ضربِ شدید، زخمی کر دینا، کوئی عضو تلف کر دینا یا کسی کی ملکیّت کو نقصان پہنچانا اسی قسم کے قابلِ تاوان جرم ہیں۔ جسمانی نقصانات کے تاوان کی مقداریں شریعت نے مقرّر کر دی ہیں۔ وراثت سے مماثلت کی وجہ یہ ہے کہ ارتکابِ جرم سے مجرم اور مظلوم کے درمیان ایک ایسا تعلق وجود میں آجاتا ہے جو مجرم کی ملکیّت میں مظلوم کا ایک متعیّن حصّہ ثابت کر دیتا ہے جسے بذریعہ عدالت وصول کیا جا سکتا ہے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو :

مصطفیٰ احمد الزرقاء : المدخل الفقہی العام الی الحقوق المدنیہ۔ صفحہ ۱۵۹۔ مطبع جامع سوریا دمشق ۱۹۵۴ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوتھا باب

مالک کے حقوق

اس باب میں ہم ان حقوق کا مطالعہ کریں گے جو مالک کو شرعی طریقوں سے حاصل کی ہوئی املاک پر حاصل ہیں۔ حقوقِ ملکیت کا مطالعہ کرتے وقت اس حقیقت پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے کہ یہ حقوق چند حدود کے پابند ہیں۔ ان حدود و قیود کا مطالعہ ہم اگلے باب میں کریں گے۔

حقِ ملکیت دراصل کئی حقوق کا مجموعہ ہے۔ کامل حقِ ملکیت چار طرح کے حقوق پر مشتمل ہے۔

(ا) استعمال اور تصرف کا حق

(ب) مزید نفع کمانے کے لیے کاروبار میں لگانے کا حق

(ج) انتقالِ ملکیت کا حق

(د) تحفظ کا حق

(ا) حقِ استعمال و تصرف :

ہر مالک کو اپنی ملکیت کے استعمال کا پورا حق حاصل ہے۔ یہ استعمال اپنے فائدہ کے لیے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی ہو سکتا ہے اور دوسروں کے فائدے کے لیے بھی۔ خدا نے اشیاء کائنات پیدا ہی اسی لیے کی ہیں کہ انسان ان سے فائدہ حاصل کرے۔ قرآن کریم نے بار بار انسان کو اس بات پر ابھارا ہے کہ کائنات میں پھیلی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور ان کو اپنی دنیوی اور اخروی کامیابی کے لیے ذریعہ کے طور پر استعمال کرے۔ استعمال کی بے شمار صورتیں ہوتی ہیں، ان طریقوں کی تخصیص و تحدید نہیں کی جا سکتی۔ شریعت نے صرف چند حدود متعین کر دیے ہیں، ان حدود کے اندر رہتے ہوئے مالک کو اپنی ہر خواہش کی تسکین اور غرض کی تکمیل کے لیے اپنی ملکیت کو استعمال میں لانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

حقِ تصرّف حقِ استعمال کا لازمہ ہے۔ اپنی قدرتی و پیدائشی حالت میں اشیاء جس شکل میں پائی جاتی ہیں ان میں ترمیم و تبدیلی عمل میں لا کر انسان اسے زیادہ مفید مطلب بنا لیتا ہے۔ وہ سارے تصرفات اصولاً درست ہیں جن کا منشاء اپنی مملوکہ چیز کو زیادہ مفید مطلب بنانا ہو۔ اس حق کا اطلاق منقولہ اور غیر منقولہ جائداد، اور ذی روح اور غیر ذی روح ہر طرح کی املاک پر ہوتا ہے۔ ان تصرّفات کی بھی کوئی انتہا نہیں، انسان کی جدّت پسند طبیعت ہر دور میں نئی نئی ہیئتیں تلاش کر لیتی ہے۔ اسے اس کی پوری آزادی ہے کیونکہ اشیاء کائنات اس کے لیے مسخّر کر دی گئی ہیں۔ البتہ ان تصرّفات کو شریعت کے متعیّن کردہ حدود کے اندر ہونا چاہیے۔

(ب) نفع آور کاروبار میں لگانے کا حق:

ہر مالک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی املاک کو مزید نفع کمانے اور اس طرح انھیں اپنی ملکیت میں اضافہ کرنے کے لیے استعمال کرے۔ اس مقصد کے تحت اپنی ملکیّت کے ذریعہ خود کوئی پیدا آور کاروبار کر سکتا ہے۔ اور کسی دوسرے کاروباری کے واسطہ سے بھی اپنا منشا پورا کر سکتا ہے۔ اسلام نے اس حق کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے۔ سرمایہ یا مال و جائداد کو تجارتی، صنعتی یا زرعی کاروبار میں لگانے کے علاوہ اپنی منقولہ یا غیر منقولہ املاک کو کرایہ پر دینا بھی نفع آور کاروبار کی ایک جائز شکل قرار دیا گیا ہے۔ ملکیّت کے ذریعہ نفع کمانے کا حق سخت ترین اعتراضات کا ہدف بنایا گیا ہے۔ اوپر

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ بعض مفکّرین ملکیّت کا حق تسلیم کرتے ہیں مگر اس مخصوص حق کا انکار کرتے ہیں۔ انفرادی ملکیّت کو ختم کر کے اجتماعی ملکیّت کا نظام قائم کرنے کی تجویز بھی اس مخصوص حق کو ختم کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے۔ ان باتوں کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس حق پر قدرے تفصیلی گفتگو کریں۔ ہم یہ واضح کریں گے کہ اسلام کن دلائل کی بناء پر نفع اور کرایہ کو درست سمجھتا ہے، اور اس کے نزدیک نفع (Profit) اور کرایہ (Hire) کا تصوّر کیا ہے۔ ضمناً اس پر بھی روشنی ڈالی جائے گی کہ اسلام نے سود (Interest) کو کیوں حرام قرار دیا ہے۔

نفع:

نفع کمانے کا ذریعہ زیادہ تر مالک کا نقد سرمایہ ہوتا ہے۔ تاریخی طور پر نقد سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کی چار شکلیں پائی جاتی رہی ہیں۔

۱۔ اپنے سرمایہ سے خود کاروبار کرنا اور اس سے ہونے والے نفع کو اپنا سمجھنا۔

۲۔ کسی کاروبار میں سرمایہ کے ساتھ شریک ہو جانا اور نفع میں طے شدہ نسبت کے مطابق حصّہ دار بن جانا۔

۳۔ خود کاروباری عمل میں حصّہ نہ لینا بلکہ سرمایہ کو اس شرط پر کسی کاروباری کے سپرد کر دینا کہ وہ نفع کا ایک حصّہ مالک کو دے گا۔

۴۔ سرمایہ کو ایک متعیّن شرح سود پر قرض دینا۔

پہلی شکل میں نقد سرمایہ کے علاوہ ملکیّت کی دوسری قسمیں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کی بعض جدید شکلیں مثلاً کمپنیوں کے حصّے خریدنا، یا سرکاری بانڈ (Bonds) تمسّکات (Securities) یا بچت کے سرٹیفکیٹ (Savings Certificates) خریدنا بھی معمولی سے فرق کے ساتھ مذکورہ بالا چار شکلوں میں سے کسی نہ کسی شکل کے تحت آ جاتی ہیں۔ ذیل میں ہم ہر شکل پر الگ الگ غور کریں گے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱- ذاتی کاروبار :

پہلی شکل نفع کمانے کی سب سے ابتدائی اور فطری شکل ہے - ان لوگوں کو چھوڑ کر جو نفع کو کسی حالت میں درست نہیں قرار دیتے عام طور پر انسانیت نفع کمانے کے اس طریقہ کو صحیح سمجھتی رہی ہے کیونکہ یہ نفع مالک کا "کمایا ہوا" نفع ہے -

اس نفع کے جواز پر بحث کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ کاروبار میں نفع کیونکر ہوتا ہے - ایک کاروباری فرد ایک متعین سرمایہ کی مدد سے مختلف پیدا آور خدمات اور خام مال کو یکجا کر کے ایک پیداواری عمل شروع کرتا ہے - ایک عرصہ تک وہ اس عمل میں مشغول رہتا ہے ، پھر جب مال تیار ہو جاتا ہے تو اسے بازار میں لا کر فروخت کرتا ہے - تیار شدہ مال کی فروخت سے اُسے جو آمدنی ہوتی ہے وہ اس اصل سرمایہ سے زیادہ ہوتی ہے جو اس کی تیاری میں صرف کیا گیا ہے - آمدنی اور لاگت کا یہ فرق نفع کہلاتا ہے - جس مثال پر ہم غور کر رہے ہیں اس میں اس نفع کے اندر کاروباری فرد کی ان خدمات کا معاوضہ بھی شامل ہے جو اس نے عام منیجر ، کاریگر یا مزدور کے طور پر انجام دی ہوں - عام طور پر نفع اس اجرت سے زیادہ ہوتا ہے جو یہ کاروباری فرد کسی دوسری جگہ ملازمت یا مزدوری کر کے حاصل کر سکتا تھا - اگر ہم مجموعی منافع میں سے لاگت کے علاوہ اس اُجرت کو بھی وضع کر دیں تو جو رقم بچتی ہے وہ کاروبار کا خالص منافع (Pure Profit) کہی جا سکتی ہے[1]

یہ بھی ممکن ہے کہ تیار شدہ مال کی فروخت سے ہونے والی آمدنی لاگت سے کم ہو - اس صورت میں ہم یہ کہتے ہیں کہ کاروبار میں خسارہ ہوا - پس نفع یا نقصان تیار شدہ مال کی فروخت سے ہونے والی آمدنی اور اس کی تیاری پر آنے والی لاگت کے درمیانی فرق کا نام ہے - ہمیں پہلے

---

[1] : علم معاشیات کی اصطلاح میں خالص منافع معلوم کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مجموعی منافع میں سے کاروبار میں لگے ہوئے سرمایہ کا سود وضع کر لیا جائے - ہمارے نزدیک سود نفع ہی کا ایک حصہ ہے جو سرمایہ دار کاروباری فرد سے وصول کر لیتا ہے - سود کو نفع سے ممتاز کرنے والی چیز موجودہ معاشرہ کا قانونی نظام اور کاروباری رواج ہے ایسا کرنے کی کوئی مستحکم اصولی اور اقتصادی وجہ نہیں ہے -

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سوال پر غور کرنا ہے کہ یہ فرق کیوں واقع ہوتا ہے۔

کاروبار کا آغاز کرتے وقت کاروباری فرد کو چند بنیادی اہمیت رکھنے والے فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ وہ اپنا سرمایہ کس صنعت میں لگائے۔ کیا پیدا کرے کس معیار (QUALITY) کا سامان پیدا کرے اور کس مقدار میں پیدا کرے۔ اپنا کارخانہ کہاں قائم کرے۔ اور پھر کس بازار میں، کب مال فروخت کرے۔ یہ فیصلے اسے حال میں کرنے ہوتے ہیں۔ جبکہ اس کا مال ایک عرصہ کے بعد مستقبل میں تیار ہو کر بازار میں لایا جا سکے گا۔ اس کی آمدنی کا انحصار اس قیمت پر ہے جس پر یہ مال مستقبل میں فروخت کیا جا سکے گا۔ اس قیمت کا انحصار اس وقت کے حالاتِ طلب اور اس مال کی مجموعی رسد پر ہے۔ ایک کاروباری فرد کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ مستقبل کے حالاتِ طلب کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکے۔ حالاتِ طلب کی تعیین میں بہت سے عوامل کو دخل حاصل ہے، جن میں سے چند یہ ہیں۔ صارفین کا ذوق، مختلف اشیاءِ صرف کے درمیان ان کی ترجیحات کا نظام (Scales of References) ، ان کی آمدنی، بازار میں دوسری اشیاء کی قیمتیں، مال کی فروخت کے وقت مستقبل کے بارے میں صارفین کی توقعات وغیرہ اسی طرح ایک کاروباری کے لیے ممکن نہیں کہ وہ مستقبل کے حالاتِ رسد کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکے۔ جو مال وہ تیار کر رہا ہے اس کو بلا شمار دوسرے کاروباری بھی تیار کر رہے ہوں گے، جو ایک دوسرے سے آزاد رہتے ہوئے کاروبار کرتے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں ان کے اندازے مال کی تیاری میں ان کے طریقے، اور بالآخر مال کی قیمتِ فروخت کے بارے میں ان کی پالیسی ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتی ہے۔ تھوڑے سے غور و فکر سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ رسد اور طلب کے حالات، بالخصوص طلب کے حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے مستقبل سے متعلق ہونے، اور تبدیل ہوتے رہنے کی وجہ سے یہ ممکن نہیں کہ حال میں ان کے بارے میں ٹھیک ٹھیک اندازے قائم کیے جا سکیں۔ ان کے بارے میں جو اندازے بھی قائم کیے جائیں گے وہ عدمِ تیقن (Uncertainty) کا شکار ہوں گے۔

اگرچہ زیرِ تیاری مال کی قیمتِ فروخت ایک غیر متعین اور غیر متیقن چیز ہے، لیکن لاگت کے عناصر — مزدور کی اجرت، مینیجر کی تنخواہ، کارخانہ کی عمارت کا کرایہ، مشینوں کا کرایہ یا ان کی قیمت،

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور خام مال کی قیمت وغیرہ ـــــ متعین اور معلوم چیزیں ہیں۔ کاروبار شروع کرتے وقت کاروباری فرد کو مزدوروں، کاریگروں اور دوسرے ملازمین سے اور مکان کے مالک یا زمیندار سے متعین اجرتوں اور کرایوں پر معاملہ کرنا ہوتا ہے۔ اسے بازار کے نرخ پر خام مال مشینیں وغیرہ خریدنی ہوتی ہیں۔ یہ اخراجات اُسے حال میں کرنے ہوتے ہیں جبکہ اس کی آمدنی مستقبل میں ہو گی۔ یہ اخراجات متعین اور معلوم ہیں، جبکہ اس کی آمدنی غیر متعین اور غیر معلوم ہے۔ لیکن اس کے لیے ایسا کیے بغیر چارہ نہیں۔ ایسا کرنے کے لیے وہ اپنے سرمایہ کو استعمال کرتا ہے۔ آئندہ مال کی فروخت سے ہونے والی آمدنی کی توقع پر وہ حال میں اپنے سرمایہ میں سے خام مال اور مشینوں کی قیمتیں اور پیدا آور خدمات کے معاوضے ادا کرتا ہے۔

کاروبار کے مذکورہ بالا بنیادی فیصلے کرتے وقت، اور مذکورہ بالا متعین اخراجات برداشت کرتے ہیں، کاروباری فرد اپنا رہنما کس چیز کو بناتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنا رہنما مستقبل کے حالاتِ بازار کے بارے میں اپنے اندازے اور اپنے زیرِ تیاری مال کی آئندہ متوقع قیمت فروخت کو بناتا ہے۔ وہ اپنا سرمایہ اس کام میں لگاتا ہے جس کے اندر اسے اس بات کی توقع ہو کہ تیار شدہ مال کی فروخت سے ہونے والی آمدنی اور اس پر آنے والی لاگت کا مثبت فرق بیش از بیش ہو گا۔ کاروبار کے دوسرے اہم فیصلے بھی وہ اسی بنیاد پر کرتا ہے۔ خام مال یا مشینیں خریدتے وقت، یا اُجرتوں اور کرایہ کی شرحیں طے کرتے وقت اس کی نظر اس بات پر رہتی ہے کہ اس طرح آنے والی لاگت متوقع آمدنی سے کم، اور کم سے کم تر ہو۔ وہ اس بات کا اندازہ لگاتا ہے کہ مختلف پیدا آور خدمات مال کی تیاری میں کیا حصّہ لیں گی، اور متوقع آمدنی کی تشکیل میں کسی مخصوص پیدا آور خدمت کا منفرد حصہ کیا ہو گا۔ وہ کسی پیدا آور خدمت کو زیادہ سے زیادہ اتنی ہی اجرت دے سکتا ہے جتنی مزید آمدنی کہ اس خدمت کے استعمال سے متوقع ہو۔ بالفاظِ دیگر، علم معاشیات کی اصطلاح میں، ان معاوضوں کی آخری حد ان پیدا آور خدمات کی مارجنل پیداآوری بحساب آمدنی' (Marginal Revenue Prod ctı ity) ہے۔ لیکن چونکہ کاروباری کو ٹھیک ٹھیک آمدنی نہیں معلوم ہو سکتی۔ لہٰذا وہ کسی عاملِ پیدائش کی مارجنل پیدا آوری کا بھی بالکل صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی متوقع آمدنی ہی کو رہنما بنا سکتا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری طرف پیداآور خدمات کے مالک یہ کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ثمنوں پر معاملہ طے کریں۔ وہ کم سے کم اتنا ہی لے سکتے ہیں جتنا ان کو دوسرے کاروباری اداروں میں کام کرنے سے بآسانی مل سکتا ہے۔ اس سے کم پر وہ کسی مخصوص کاروباری فرد سے معاملہ نہیں کرتے۔ یہ پیداآور خدمات کے معاوضوں کی ابتدائی حد ہے۔ اس آخری اور ابتدائی حد کے درمیان کسی شرح پر بازار کی مسابقت معاملہ طے کرا دیتی ہے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ معاملہ بالآخر ایک متعیّن شرح معاوضہ پر طے ہوتا ہے۔ لاگت متعیّن ہوتی ہے، جبکہ وہ آمدنی بہرصورت غیر متعیّن اور غیر متیقن (Uncertain) رہتی ہے جس کی توقع پر کاروباری فرد یہ متعیّن لاگت برداشت کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

کاروباری فرد کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ لاگت کو کم سے کم رکھے اور تیارشدہ مال کو زیادہ سے زیادہ داموں پر فروخت کرے، لیکن جیسا کہ معاشیات کا ہر طالب علم جانتا ہے، اس کی کوشش کی کامیابی کا پیمانہ بہت محدود ہے کیونکہ بازار کی قوتیں اور مسابقت کا عمل ایک کاروباری فرد کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے کاروباری فرد کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنا مال تیار کرنے کے لیے پیداوار کے ایسے طریقے استعمال کرے کہ لاگت کم سے کم آئے۔

اب یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ تیارشدہ مال کی فروخت کے بعد عملاً آمدنی اور لاگت کے درمیان فرق کیوں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک متعیّن چیز ایک غیر متعیّن چیز کے برابر اتفاق ہی سے ہو سکتی ہے۔ ایسا ہونا ضروری نہیں۔ مستقبل کے حالات کا ٹھیک ٹھیک کاروباری فرد کے اندازوں کے مطابق ثابت ہونا ضروری نہیں، بلکہ اکثر اس کے خلاف ہی ہوتا ہے۔ آمدنی لاگت سے زیادہ ہوگی، یا اس سے کم، اور شاذ و نادر، اس کے مساوی۔ آمدنی اور لاگت کے درمیان فرق واقع ہونے، یعنی کاروبار میں نفع یا نقصان ہونے کی ذمہ داری، اصولی طور پر عدم تیقن (Uncertainty) کی اس کیفیت پر ہے جس سے کاروبار کو مفر نہیں۔[1]

---

[1] : بعض غیر متیقن (Uncertain) امور میں اس بات کا امکان ہے کہ ریاضی حاشیہ برصفحہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر مستقبل کے حالات پوری طرح معلوم اور متعین ہوتے تو صورتِ حال بالکل دوسری ہوتی۔ لیکن ایسا ممکن نہیں۔ انسانی زندگی میں کاروبار کی ایسی تنظیم ممکن نہیں ہے کہ لاگت اور آمدنی لازماً برابر ہوا کریں، کیونکہ آمدنی کا انحصار غیر متعین، غیر متیقن اور تبدیل پذیر عوامل پر ہے۔

یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی ہے کہ کاروبار میں نفع اور نقصان سے مفر نہیں۔ کاروباری فرد سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بہرصورت اپنے مال کو لاگت کے مساوی قیمت پر فروخت کرے۔ بعض حالات میں جبکہ طلب اُس کاروباری کی توقع سے کم ہوگئی ہو، صارفین اُس مال کو اس قیمت پر خریدنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ ایسی صورت میں کاروباری فرد مجبور ہوگا کہ مال کو لاگت سے کم داموں پر فروخت کرکے اپنے سرمایہ کا جو کچھ حصہ بھی بازیافت کرسکتا ہے کرلے۔ سماج کاروباری کو اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ اس کا مال لاگت کے داموں ضرور فروخت ہوجائے گا اور اسے کبھی خسارہ نہ اُٹھانا پڑے گا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اگر حالاتِ طلب کاروباری کی توقع

(بقیہ حاشیہ صفحہ) اس امر کے وقوع کے امکانات ریاضی کے اصولوں کی مدد سے معلوم کرلیے جائیں۔ کارخانہ میں آگ لگنے کا خطرہ، گودام میں چوری کا خطرہ وغیرہ حوادث کے وقوع کے امکانات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایسے امور میں عدمِ تیقن کی کیفیت، اور خطرہ سے ہونے والے نقصانات کا ازالہ تامین (Insurance) کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ انشورنس کے بیمے دی جانے والی سالانہ رقم کاروباری فرد کی لاگت میں شامل ہوجاتی ہے۔ ایسے خطرات کو حقیقی عدمِ تیقن سے مبرّا قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ ان کے مقابلہ کا یقینی طریقہ انشورنس ہے۔ لیکن کاروبار کو اس حقیقی عدمِ تیقن سے پاک نہیں کیا جاسکتا جس کی وضاحت اوپر تفصیل سے کی جاچکی ہے۔

(یہاں انشورنس کا ذکر اس مفروضہ کی بنا پر کیا گیا ہے کہ اسے سود اور دوسری ناجائز باتوں سے پاک کرکے بھی منظم کیا جاسکتا ہے، اور بعینہٖ وہی کام لیا جاسکتا ہے جو یہ نظام آج کل انجام دیتا ہے ——— یعنی کاروبار سے ان خطرات (Risk) کا ازالہ جن کے وقوع کی حسابی پیمائش ممکن ہے۔ خود اس مفروضہ پر بحث اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مطابق یا اس سے کچھ زیادہ موافق ثابت ہوں اور اس کے لیے یہ ممکن ہو کہ لاگت سے زیادہ داموں پر مال فروخت کر کے نفع کمائے تو اس سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسا نہ کرے بلکہ لاگت کے مساوی قیمت لینے پر اکتفا کرے۔

قبل اس کے کہ ہم اس سوال پر غور کریں کہ یہ کیوں ضروری ہے کہ کاروبار میں نفع ہو تو اس کا مستحق کاروباری فرد ہی کو قرار دیا جائے، ہمیں اس بات کا جائزہ بھی لینا چاہیے کہ نفع کے واقع ہونے میں خود کاروباری فرد کی صلاحیتوں اور اس کی جدّ وجہد کو کس حد تک دخل ہے۔

سب سے پہلے مستقبل کے بارے میں ان توقعات (Expectations) پر غور کیجیے جن کی روشنی میں کاروباری فیصلے کیے جاتے ہیں۔ مختلف افراد میں مستقبل کے بارے میں اندازے قائم کرنے کی صلاحیت مختلف درجوں میں پائی جاتی ہے۔ جو فرد جتنا زیادہ تجربہ کار ہوگا، ماضی اور حال سے جتنا زیادہ واقف ہوگا، اور جتنی زیادہ فہم و فراست، بصیرت اور دور بینی رکھتا ہوگا وہ اتنے ہی زیادہ صحیح اندازے قائم کر سکے گا۔ اگر کسی کاروباری فرد کو کاروبار میں نفع ہوتا ہے تو یقیناً اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ اس نے مستقبل کے بارے میں نسبتاً صحیح اندازے قائم کیے۔ برعکس اس کے جو کاروباری افراد اپنی محدود صلاحیتوں، کم تجربہ اور نسبتاً محدود معلومات کی بنا پر اتنے زیادہ صحیح اندازے نہ قائم کر سکیں ان کو کم نفع ہوگا یا نقصان ہوگا۔ عدم تیقن (Uncertainty) کی فضا میں کامیابی کے ساتھ کاروبار کرنے میں فرد کی چند مخصوص صلاحیتوں اور علم و تجربہ کا خاصا دخل ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان فیصلوں پر غور کیجیے جو مستقبل کے بارے میں قائم کردہ توقعات اور اندازوں کی روشنی میں کاروباری فرد کرتا ہے۔ ان اندازوں کی روشنی میں موزون فیصلے کرنے کی صلاحیت بھی مختلف افراد کے اندر مختلف درجوں میں پائی جاتی ہے، اور اس میں بھی کاروباری تجربہ اور مہارت کو خاصا دخل ہوتا ہے۔

پھر کاروبار میں اس بات کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے کہ جب خارج کی کسی تبدیلی یا ذاتی غور و فکر اور مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر مستقبل کے بارے میں قائم کیے ہوئے اندازوں میں ترمیم و تبدیلی ہو تو اپنے کاروباری فیصلوں میں اسی مناسبت سے ترمیم و تبدیلی عمل میں لائی جائے، اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھرتی کے ساتھ لائی جائے۔ مختلف افراد کے اندر پھرتی کے ساتھ نئے فیصلے کرنے کی صلاحیت بھی یکساں نہیں ہوتی۔

اس طرح ایک فیصلہ کر لینے کے بعد اسے پوری طرح نافذ کرنا، اور ایسے وقت پر نافذ کرنا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جا سکے، کاروبار کی کامیابی کے لیے ضروری ہے مختلف کاروباری افراد کے اندر یہ صلاحیت بھی مختلف درجوں میں پائی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ وہ تمام صلاحیتیں، مثلاً فہم و فراست، بصیرت و دُور بینی، قوتِ فیصلہ، قوتِ نفاذ، صبر و استقلال، جرأت اور تحرانگیزی، خود اعتمادی اور عزم وغیرہ جن کو عدم تیقن کی فضا میں کامیابی کے ساتھ کاروبار کرنے میں دخل ہے مختلف افراد کے اندر مختلف درجوں میں پائی جاتی ہیں، جن افراد کے اندر یہ صلاحیتیں دوسرے افراد سے نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں وہ نسبتاً زیادہ کامیابی کے ساتھ کاروبار کر سکتے ہیں اور نسبتاً زیادہ نفع کما سکتے ہیں۔

اب ان صلاحیتوں سے قطع نظر مختلف ان صلاحیتوں پر غور کیجیے جن کا تعلق نئے پیداواری طریقوں کی دریافت اور ان کے استعمال سے کسی مال کی تیاری کے لیے پیدا آور خدمات کو نئے طریقہ سے یکجا کرنے اور ان سے زیادہ چستی کے ساتھ کام لے کر ان کی پیدا آوری میں اضافہ کرنے سے، کسی پرانے سامان کی ایک نئی قسم کو بازار میں لا کر صارفین کی توجہات جذب کرنے سے، اپنے مال کی فروخت کے لیے مہارت کے ساتھ جاذبِ توجہ اشتہار دینے سے اور نئی تحلیل اس پیداواری عمل سے ہے جسے ایک ماہر معاشیات نے تجدد (Innovation) کا موزوں نام دیا ہے[1]۔ یہاں عمل تجدد کا تفصیلی تجزیہ ضروری نہیں۔ صرف اس بات پر زور دینا ہے کہ کاروباری افراد اس مخصوص صلاحیت میں بھی یکساں نہیں ہوتے جبکہ اس کا اثر نفع کے حصول پر بہت گہرا پڑتا ہے۔

---

[1] : تجدد کے عمل کی تشریح اور نفع سے اس کے تعلق کو سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو:
(Joseph A. Schumpeter : The Theory of Economic Development New York, Oxford University Press—1961, Ch : II and IV)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہر بڑے کاروباری کے لیے ضروری ہے کہ کاروبار کے بہت سے شعبوں کے بارے میں فیصلے کرنے اور دوسرے انتظامی امور کی دیکھ بھال کا کام تنخواہ دار مینیجروں کے سپرد کر دے۔ یہ مینیجر بہت سے امور کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں جن کا اثر بالآخر کاروبار کی کامیابی یا ناکامی اور اس میں ہونے والے نفع یا نقصان پر پڑتا ہے۔ ان مینیجروں کی تنخواہیں مقرر ہوتی ہیں اور ان کے فیصلوں سے نفع یا نقصان کی شکل میں جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس کا ذمہ دار کاروبار کا مالک ہوتا ہے نہ کہ یہ مینیجر۔ اس حقیقت کے پیش نظر کاروباری فرد کے لیے اپنی ماتحتی کے لیے موزوں ترین افراد کا انتخاب اور تقرر ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اسے کسی طرح بھی یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ آئندہ مختلف اہم امور میں کوئی مینیجر موزوں، اور نفع بخش فیصلے کرے گا یا غیر موزوں نقصان پہنچانے والے فیصلے کرے گا۔ یہ فیصلے مستقبل میں پیش آنے والے مسائل سے متعلق ہیں اور حال میں ان کے بارے میں ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پس کاروباری فرد کارخانہ کے عہدہ داروں کا تقرر بھی عدمِ تیقن (Uncertainty) کی فضا میں کرتا ہے۔ وہ اپنا رہنما اپنی مردم شناسی اور فہم و فراست ہی کو بنا سکتا ہے۔ موزوں فرد کا انتخاب بالآخر اس کے لیے نفع میں اضافہ کا سبب بنے گا اور غیر موزوں فرد کا انتخاب نفع میں کمی یا خسارہ کا باعث ہو گا۔

کاروباری فیصلوں کی نوعیت پر اس بحث[1] سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ان کی

---

[1] : کاروباری فیصلوں کی نوعیت، عدمِ تیقن اور نفع کے باہمی تعلق اور کاروباری جدوجہد کی نوعیت اور مزاج پر تفصیلی بحث کے لیے مندرجہ ذیل دو مآخذ کا مطالعہ خاص طور پر مفید رہے گا۔ اوپر کی بحث میں ہم نے قصداً تفصیلات میں جانے سے اور ایسے فنی امور سے گریز کیا ہے جن کو سمجھنے کے لیے علم معاشیات سے یک گونہ مناسبت ناگزیر ہے۔ معاشیات کے طالب علم، اور موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے خواہش مند حضرات ذیل کے مآخذ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں:

(B. S. Keirstead : An Essay in the THEORY OF Profit Distributions ; Oxford, Basil Black Well, 1957) F. H. KNIGHT : RISK, UNCERTAINTY AND PROFIT.

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صحت اور موزونیت کا انحصار بڑی حد تک کاروباری فرد کی صلاحیتوں، جدوجہد اور حُسنِ نیت پر ہے اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ بات بالکل معقول اور انصاف کے مطابق ہے کہ کاروبار میں ہونے والے نفع کا مستحق کاروبار کے مالک کو قرار دیا جائے۔ اسی طرح کاروبار میں نقصان ہونے کی ذمہ داری بڑی حد تک کاروباری فرد کے اندازوں کی غلطی، اس کے فیصلوں کی غیر موزونیت اور اس کی صلاحیتوں اور جدوجہد کے محدود اور ناقص ہونے پر ہے۔ کاروبار میں نقصان ہو تو وہ بھی کاروبار کے مالک ہی کو برداشت کرنا چاہیے۔ کاروبار میں نفع اس بات کی علامت ہے کہ مستقبل کے غیر متعین اور غیر متیقن حالات کا نسبتاً صحیح اندازہ قائم کیا گیا، اس کی روشنی میں موزون فیصلے کیے گئے، اور فی الجملہ کاروبار میں اچھی صلاحیتوں اور سعی و جہد کا مظاہرہ کیا گیا۔ نفع حقیقی عدمِ تیقن کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا انعام ہے۔ اسی طرح نقصان اس مقابلہ میں ناکامی کی سزا ہے۔

نفع کو کاروباری فرد ہی کا حق سمجھنا ضروری ہے کیونکہ زیرِ غور شکل میں اس نے اپنے سرمایہ کو اس خطرہ کے باوجود کہ اسے نقصان ہو سکتا ہے اور وہ اصل سرمایہ یا اس کے ایک حصہ سے بھی محروم ہو سکتا ہے ایک عرصہ تک کام میں مشغول رکھا تھا۔ اس نے اپنی صلاحیتوں اور ساری سعی و جہد کو ایک ایسے کام میں لگائے رکھا جس میں نفع یقینی نہیں تھا اور نقصان کا اندیشہ موجود تھا۔ لہٰذا نفع ہونے کی شکل میں یہ نفع اسی کو ملنا چاہیے۔

نفع کو کاروباری فرد کا حق سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہی نفع کاروبار کے اس خسارہ کی تلافی کر سکتا ہے جو ماضی میں ہو چکا ہو یا مستقبل میں واقع ہو۔ ہر کاروبار میں خسارہ کا اندیشہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ کبھی کبھی ہونے والے خسارہ کی تلافی اسی طرح ممکن ہے کہ جب نفع ہو تو اسے مالک کا حق سمجھا جائے۔

پیدا آور کاروبار ایک مفید سماجی عمل ہے۔ اس سے ہماری ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری طلب پوری ہوتی ہے۔ اس طریقہ سے ملک کے قدرتی وسائل کا اس طرح پر استعمال عمل میں آتا ہے جس کا صارفین کی طلب تقاضا کرتی ہے۔ لیکن کاروبار کے جاری رہنے کے لیے ضروری ہے کہ کاروباری افراد کو اس بات کی ضمانت دی جائے کہ کاروبار میں نفع ہوگا تو وہ ان کا حق سمجھا جائے گا۔ کاروبار نفع کی امید پر کیا جاتا ہے۔ اگر نفع کو کاروباری افراد کا حق نہ دیا گیا تو وہ خطرات مول لینے اور عدم تیقن کی فضا میں اپنا سرمایہ لگانے اور کاروباری جدوجہد کرنے پر نہیں آمادہ ہوں گے۔

نفع کا امکان ہی کاروباری افراد کو کسی کام کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کا کم یا زیادہ ہونا کاروباری صلاحیتوں کو ایک کام سے ہٹا کر دوسرے کام میں لگاتا ہے۔ اس کا نہ ہونا یا خسارہ ہونا کاروباری افراد کو اپنی عدم صلاحیت، یا غلطی پر متنبہ کرتا ہے۔ مسلسل خسارہ نالائقوں کو کاروبار چھوڑ دینے پر مجبور کرتا ہے۔ مسلسل نفع اچھے کاروباریوں کو زیادہ وسائل سرمایہ پر قابو عطا کرتا ہے۔ اس طرح نفع کا وقوع اور اس کو کاروباری فرد کا حق قرار دینا ایک مفید سماجی عمل انجام دیتا ہے۔

مذکورہ بالا تجزیہ میں مثال کے طور پر صنعتی کاروبار کو سامنے رکھا گیا ہے۔ لیکن اس بحث کا اطلاق اصولی طور پر زرعی اور تجارتی کاروبار پر بھی ہوتا ہے۔ فرق صرف تفصیلات میں ہے نوعیت میں نہیں۔ تاجر تیار شدہ مال کو ایک جگہ خرید کر دوسری جگہ یا ایک وقت خرید کر دوسرے وقت فروخت کرتا ہے۔ اسے بھی مال خریدتے وقت مستقبل میں، خواہ یہ مستقبل کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو، حالاتِ طلب کا اندازہ لگانا ہوتا ہے۔ مال خرید کر بازار میں لانے کے وقت تک قیمت تبدیل ہو سکتی ہے۔ جس کا تمام تر اثر اس کی آمدنی پر پڑتا ہے۔ یہاں بھی لاگت (قیمت خرید) متعین ہوتی ہے اور قیمتِ فروخت غیر متعین اور غیر متیقن ہوتی ہے۔ تاجر کو بھی اپنا کاروبار عدم تیقن کی فضا میں انجام دینا ہوتا ہے۔ خواہ اکثر اوقات یہ عدم تیقن درجہ میں اس عدم تیقن سے کم ہو جو بڑے صنعتی کاروبار میں پایا جاتا ہے۔ تاجر کے لیے بھی نفع اور نقصان دونوں ہی کا امکان رہتا ہے۔ صنعتی کاروبار کرنے والے کی طرح تاجر بھی چند مفید سماجی اعمال انجام دیتا ہے۔ اسی طرح زراعت میں بھی پیداواری عمل کے آغاز اور فصل کی تیاری کے درمیان زمانی فصل پایا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتا ہے۔ کسان کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی پیداوار کے بازار میں پہنچنے تک حالاتِ طلب میں کیا تبدیلی ہو گی اور پیداوار کس نرخ پر فروخت کی جا سکے گی۔ وہ بھی اپنے کاروباری فیصلوں میں مستقبل کے بارے میں اپنے اندازوں کو ہی اپنا رہنما بناتا ہے۔ زراعت میں بھی لاگت متعین اور آمدنی غیر متعین اور غیر متیقن ہوتی ہے۔ یہاں بھی بعض خطرات کا مقابلہ تامین دانشورانش کے ذریعہ ممکن ہے لیکن حقیقی عدم تیقن کے مقابلہ سے مفر نہیں۔

۲۔ شرکت:

سرمایہ کے نفع آور استعمال کی دوسری شکل یہ ہے کہ ایک فرد اپنے سرمایہ کے ساتھ دوسرے فرد، یا افراد سے مل کر کاروبار کرے۔ کاروبار میں ہر شریک سرمایہ اور کاروباری جدوجہد دونوں کے ساتھ آتا ہے۔ اس شکل میں نفع اور نقصان میں ہر شریک پہلے سے طے شدہ نسبت کے مطابق حصہ دار ہو گا۔ یہ شرکت کی سادہ ترین شکل ہے۔

اس شکل میں اور ذاتی کاروبار کی شکل میں ہونے والے نفع کے اندر اصولاً کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اس لیے اس شکل میں نفع کی توزیع اور اس کے استحقاق پر علیحدہ گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

شرکت سے متعلق تفصیلی قانونی بحثوں کا مطالعہ اسلامی فقہ کی کتابوں کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ تفصیلات میں مختلف فقہا کے درمیان جو اختلاف ہے اس کی نشان دہی یا اس پر بحث ہمارے لیے ضروری نہیں۔ ذیل میں ہم صرف بعض اہم باتوں کا ذکر کریں گے۔

اگر دو فریق برابر سرمایہ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوں تو امام مالک اور شافعی کے نزدیک ضروری ہے کہ وہ دونوں نفع اور نقصان میں برابر برابر شریک ہوں لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک وہ غیر مساوی نسبتیں بھی طے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اگرچہ ان کا سرمایہ برابر ہے لیکن کاروباری صلاحیتوں اور عملی جدوجہد کے اعتبار سے دونوں افراد کے درمیان فرق ممکن ہے۔ شرکت کی اس عام شکل کو فقہی اصطلاح میں شرکت العنان کہا جاتا ہے۔

اس شکل میں شرکاء کی ذمہ داری (Liability) سرمایہ میں ان کے حصوں کی نسبت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے متعین ہوتی ہے۔

شرکت کی ایک اختلافی شکل شرکت المفاوضہ ہے۔ شرکاء اپنے تمام سرمایہ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوتے ہیں، لیکن ان سرمایوں کا باہم مساوی ہونا ضروری ہے۔ خسارہ کی شکل میں شرکاء کی ذمہ داری غیر محدود (Unlimited Liability) ہوتی ہے۔ نفع کی شکل میں ہر شریک کو برابر برابر حصے ملتے ہیں۔ شرکت کی اس شکل کو صرف فقہ حنفی میں صحیح قرار دیا گیا ہے۔[۵۲]

۳۔ مضاربت :

سرمایہ کو نفع آور کاروبار میں لگانے کی تیسری شکل یہ ہے کہ مالک اپنا سرمایہ کسی کاروباری فرد کے سپرد کر دے۔ صاحب سرمایہ صرف سرمایہ فراہم کرے اور کاروباری فریق اسی سرمایہ کے ذریعہ کاروبار چلائے۔ یہ مضاربت کی سادہ ترین شکل ہے جس میں ایک شریک صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا شریک صرف کاروباری جدوجہد کرتا ہے۔ سرمایہ نہیں لگاتا۔

کاروبار میں نفع ہوگا تو دونوں فریق اس نفع میں طے شدہ نسبتوں کے مطابق حصہ دار ہوں گے۔ کاروبار میں نقصان ہوگا تو اس کو سرمایہ لگانے والا برداشت کرے گا، کاروباری فریق کو صرف یہ نقصان ہوگا کہ اسے اپنی سعی وجہد کا کوئی صلہ نہ مل سکے گا۔ کسی فریق کے حق میں بہرصورت کسی متعین رقم کی ادائیگی کا معاہدہ نہیں کیا جاسکتا۔ سرمایہ فراہم کرنے والا یہ شرط نہیں پیش کرسکتا کہ نفع ہو یا نقصان اُسے ایک متعین رقم ضرور ملنی چاہیے۔ اسی طرح کاروباری جدوجہد کرنے والا فریق یہ شرط نہیں طے کرسکتا کہ نفع ہو یا نقصان اُسے ایک متعین رقم ضرور ملنی چاہیے۔ البتہ نفع کی تقسیم کے لیے دونوں فریق باہمی رضامندی سے جو تناسب بھی چاہیں

---

۵۱ : تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو :

کاسانی : بدائع الصنائع جلد ۶، صفحہ ۵۶، و مابعد

محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن رشد : بدایۃ المجتہد جلد ۲، صفحہ ۲۵۱ و مابعد
مطبع مصطفی البابی الحلبی و اولادہ۔ مصر۔ ۱۹۵۰ء

۵۲ : ایضاً

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طے کر سکتے ہیں۔

فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ سرمایہ فراہم کرنے والا فریق نقصان کی ذمہ داری کاروباری فریق کے سر نہیں ڈال سکتا۔ وہ یہ نہیں طے کر سکتا کہ نقصان کی صورت میں بھی اپنا اصل سرمایہ واپس ملنا چاہیے۔ کاروبار میں خسارہ کے باعث اگر پورا سرمایہ ختم بھی ہو جائے تو اس کی یا اس کے کسی حصہ کی ادائیگی کاروباری فریق کے ذمہ نہیں ہوگی[۱]

جہاں تک نفع کے اس حصہ کا تعلق ہے جو محنت اور کاروباری جدوجہد کرنے والے فریق کو ملتا ہے، اس کا جواز بظاہر کسی دلیل کا محتاج نہیں معلوم ہوتا۔ مزید برآں، اس پر بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ہمیں نفع کے اس حصہ پر غور کرنا ہے جو سرمایہ لگانے والے کو ملتا ہے۔ خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہ فریق خود کاروباری جدوجہد نہیں کرتا۔ نہ کاروباری فیصلوں اور ان کے نفاذ میں کوئی حصہ لیتا ہے۔

اوپر ہم نے کاروباری نفع کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ نفع غیر متعین حالات میں سرمایہ کو خطرہ میں ڈال کر موزوں کاروباری فیصلے کرنے اور کامیابی کے ساتھ عدم تیقن کا مقابلہ کرنے کا اجر ہے۔ یہاں ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ سرمایہ فراہم کرنے والا اس مجموعی عمل میں کیا حصہ لیتا ہے جس کے نتیجہ میں کاروبار میں نفع ہوتا ہے۔

یہ بات تھوڑے غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کاروبار شروع کرنے، کاروباری فیصلوں کو نافذ کرنے، زیر تیاری مال کے بیچ پیدا آور خدمات اور خام مال کو یکجا کرنے اور کاروباری

---

[۱] : مضاربت کے سلسلہ میں تفصیلات کے مطالعہ، اور اس ضمن میں مختلف مکاتب فقہ کے درمیان اختلافی امور پر بحث کے لیے ملاحظہ ہو :

کاسانی : بدائع الصنائع جلد ۶، صفحہ ۷۷ و مابعد

ابن رشد : بدایۃ المجتہد جلد ۲، صفحہ ۲۳۶ و مابعد

عبدالرحمان الجزیری : الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد ۳، مباحث المضاربہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمل کو جاری رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سرمایہ موجود ہو اور کاروباری فریق اس سرمایہ کی مدد سے اپنے فیصلوں کو عمل کا جامہ پہنا سکے۔ کاروباری فریق جو فیصلے بھی کرتا ہے، جو اسکیمیں بھی بناتا ہے ان کو عمل کا جامہ پہنانا سرمایہ ہی کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ اگر سرمایہ نہ ہو تو کاروباری فریق کے اندازے کتنے ہی صحیح ہوں، وہ اپنی صلاحیتوں کی بدولت مستقبل کے بارے میں کتنی ہی ٹھیک توقعات قائم کرے، اور اس کے کاروباری فیصلے کتنے ہی موزون کیوں نہ ہوں، وہ صرف خیالی محل تعمیر کر سکتا ہے، عملاً کاروبار نہیں چلا سکتا۔ بغیر سرمایہ کے وہ پیدائش اشیا اور ان کی فروخت سے قاصر رہتا ہے۔

سرمایہ دار نے کاروباری فرد کو سرمایہ فراہم کیا ہے اور سرمایہ پر وارد ہونے والے تمام خطرات کو خود برداشت کرنے کا ذمہ لیا ہے۔ عدمِ تیقن کی فضا میں کاروباری فرد جو فیصلے بھی کرتا ہے ان کے نتیجہ میں نفع و نقصان دونوں کا امکان ہے۔ اپنے سرمایہ کو ان فیصلوں کا تابع بنا کر اور نقصان کی ذمہ داری سے کاروباری فریق کو بری قرار دے کر، سرمایہ فراہم کرنے والے نے کاروبار میں ایک اہم حصہ لیا ہے۔ اگرچہ عدمِ تیقن کا مقابلہ کاروباری فرد کرتا ہے، لیکن نقصان ہونے کی شکل میں اس کا اثر سرمایہ دار پر پڑتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر انصاف کا تقاضا ہے کہ جب کاروبار میں نفع ہو تو اس کا فیض سرمایہ دار کو بھی پہنچے، کیونکہ اس کے سرمایہ نے خود کو کاروباری فرد کے فیصلوں کا تابع بنا کر، اور نقصان کی ذمہ داری لے کر، کاروباری عمل میں ایک زبردست حصہ لیا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو کاروباری نفع کے جواز اور استحقاق پر جو بحث اوپر کی جا چکی ہے وہ اس مخصوص شکل پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مختلف کاروباری اعمال پہلی شکل میں ایک جگہ مرکوز تھے اور زیرِ غور شکل میں فیصلے کرنے اور کاروباری جدّوجہد کرنے کا عمل ایک فریق انجام دیتا ہے، اور ان فیصلوں کے نفاذ کے لیے سرمایہ فراہم کرنے اور نقصان کا خطرہ برداشت کرنے کا کام دوسرا فریق کرتا ہے۔ ایسی صورت میں انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ کاروباری نفع کا مستحق دونوں فریقوں کو قرار دیا جائے۔

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں، نقصان کی شکل میں بھی اس کا اثر دونوں فریقوں پر پڑتا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ سرمایہ دار پر اس کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن کاروباری فریق کو اپنی جدوجہد کے نتائج سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ اگر وہ بجائے کاروبار کرنے کے کسی دوسرے کاروباری ادارہ میں ملازمت کر لیتا تو اسے ایک متعین اجرت مل سکتی تھی۔ لیکن زیرِ غور شکل میں اسے سرے سے کوئی آمدنی ہی نہیں ہوتی۔ بلاشبہ یہ نقصان، اکثر حالات میں اس نقصان سے کم ہوتا ہے جو سرمایہ دار کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ کمی صرف حسابی اور عددی کمی ہے۔ اس بات کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کسی کاروبار میں زیادہ اہمیت کس کو حاصل ہے۔ سرمایہ کی فراہمی اور اسے کاروباری فیصلوں کے تابع بنا کر خطر میں ڈالنے کو، یا خود کاروباری جدوجہد کو۔ دونوں کی اضافی اہمیتوں کی پیمائش کا کوئی طریقہ ممکن نہیں۔

سرمایہ فراہم کرنے والے کو نفع کا جو حصہ ملتا ہے اس میں عدمِ تیقن کے کامیاب مقابلہ کا بھی دخل ہے۔ سرمایہ کے مالک کا یہ فیصلہ کہ وہ مضاربت کے اصول پر اپنا سرمایہ کس کاروباری فریق کے سپرد کرے ایک اہم کاروباری فیصلہ ہے۔ اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ غیر متیقن حالات میں کاروباری فیصلوں کی ایک اہم قسم مختلف کاموں کے لیے موزوں افراد کا انتخاب ہے۔ زیرِ غور شکل میں سرمایہ کا مالک اپنی فہم و فراست اور مردم شناسی سے کام لیتے ہوئے سرمایہ لگانے کے لیے ایک ایسے کاروباری فریق کا انتخاب کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کامیابی کے ساتھ کاروبار کر سکے۔ اسے یہ فیصلہ کرتے وقت قطعیت کے ساتھ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ عملاً کامیابی ہوگی یا ناکامی۔ وہ اپنا رہنما صرف کاروباری فریق کی صلاحیتوں کے بارے میں اپنے اندازہ کو ہی بنا سکتا ہے۔ اگر وہ کسی لائق اور موزوں فرد کا انتخاب کرتا ہے تو اسے بالآخر نفع ملتا ہے۔ اگر وہ اس انتخاب میں غلطی کرتا ہے تو اسے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کمپنی کا معمولی حصہ خریدنا چاہتا ہے تو وہ اپنی واقفیت اور تجربہ کی حد تک کسی ایسی کمپنی کا انتخاب کرتا ہے جس کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہوں۔ یہ انتخاب بھی عدمِ تیقن کی فضا میں کیے جانے والے کاروباری فیصلوں کی ایک قسم ہے۔ مضاربت کے اصول پر سرمایہ لگانے والے یا کمپنی کا حصہ خریدنے والے کو ملنے والا نفع اس کے انتخاب کی موزونیت اور عدمِ تیقن کی فضا میں ایک صحیح فیصلہ کرنے کی علامت ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرمایہ فراہم کرنے والے کو نفع میں سے ایک حصہ ضرور ملنا چاہیئے۔ وہ اپنے سرمایہ کو خطرہ میں ڈالنے پر اُسی وقت آمادہ ہو سکتا ہے جب اسے نفع کی اُمید ہو۔ نقصان کے اندیشہ کے باوجود وہ اس خطرہ کو اسی شکل میں برداشت کر سکتا ہے جب اُسے یہ اطمینان ہو کہ اگر اُسے نقصان اُٹھانا پڑے تو آئندہ کبھی ہونے والا نفع اس کی تلافی کر سکتا ہے۔

ہر سرمایہ دار کاروباری صلاحیتوں کا حامل نہیں ہوتا، اسی طرح ہر کاروباری صلاحیتوں کا حامل فرد صاحبِ سرمایہ نہیں ہوتا۔ سماجی مصالح کے پیشِ نظر ایسی راہیں نکالنی ضروری ہیں کہ کاروباری جدّوجہد کر سکنے والے افراد کو سرمایہ مل سکے، اور سرمایہ دار افراد کو کاروباری افراد کا تعاون حاصل ہو سکے۔ مضاربت کا اصول اسی تقاضائے مصلحت کی تکمیل کرتا ہے۔ وہ اس مقصد کو اس طرح حاصل کرتا ہے کہ کسی فریق کے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔

سُود کی حُرمت :

سرمایہ کے نفع آور استعمال کی ایک رائج شکل یہ بھی ہے کہ مالک اپنے سرمایہ کو کسی دوسرے فرد کو قرض کے طور پر دے، اور اس سے ایک مدّت کے بعد اصل رقم کی واپسی اور اس مدّت تک ایک متعیّن سالانہ شرح کے مطابق سود حاصل کرنے کا معاہدہ کر لے۔ اسلام نے اس شکل کو حرام قرار دیا ہے۔

...... وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا، فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ، وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ - (البقرہ ۲:۲۷۵)

اور اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اب جس کو اپنے رب کی نصیحت پہنچے اور وہ آئندہ سود سے باز آجائے تو جو کچھ (سودی لین دین) پہلے ہو چکا وہ اس کا ہے، اور اس باب میں اس کا معاملہ اللہ کے سپرد، اور جو اب بھی یہ حرکت کرے تو ایسے لوگ جہنمی ہیں اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۔ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۔

اے اہلِ ایمان اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود باقی رہ گیا ہے اس کو اگر تم درحقیقت مومن ہو، تو چھوڑ دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی وارننگ دی جاتی ہے۔ اگر تم توبہ کر لو (اور سودی معاملات سے باز آجاؤ) تو تمہارے راس المال تمہارے ہیں (وہ تم کو ملیں گے) نہ تم زیادتی کرو نہ تم پر زیادتی کی جائے گی۔ (البقرہ : ۲۷۹)

یہاں ہم ان قرضوں پر لیے جانے والے سود پر بحث نہیں کریں گے جو ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور غیر کاروباری اغراض کے لیے لیے جاتے ہیں۔ اس قسم کے سود کی برائیاں نسبتاً زیادہ واضح ہیں۔ ذیل میں ہم یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس سود کو کیوں حرام قرار دیا گیا ہے جو سرمایہ دار کسی کاروباری فرد سے کاروباری اغراض کے لیے دیے جانے والے قرض پر وصول کرتا ہے۔ چونکہ ضرورت کے قرضوں پر سود کی توجیہ بھی اکثر مفکرین نے بالواسطہ طور پر کاروباری قرضوں کے سود کا جواز ثابت کر کے کی ہے، لہٰذا اصل اہمیت اسی بحث کو حاصل رہی ہے۔

کاروبار میں ہونے والے نفع کی نوعیت اور کاروباری عمل میں سرمایہ کے حصّہ پر اوپر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ پیداآور کاروبار عدمِ تیقن کی فضا میں انجام پاتا ہے۔ نفع ایک غیر یقینی امر ہے۔ کاروبار میں سرمایہ کی شرکت لازماً نفع پر نہیں منتج ہوتی — کیونکہ کاروبار میں نفع اور نقصان دونوں کا امکان رہتا ہے۔ جب سرمایہ کا کاروبار میں لگنا لازماً نفع پر نہیں منتج ہوتا تو یہ بات انصاف کے خلاف ہے کہ اس سرمایہ پر بہر صورت ایک متعیّن سالانہ "نفع" کا مطالبہ کیا جائے۔ کاروبار میں لگے ہوئے سرمایہ پر "نفع" کی ایک متعیّن شرح کا مطالبہ اسی صورت میں حق بجانب ہو سکتا ہے جب خود کاروبار میں نفع کا وقوع اور اس کی مقدار متعیّن اور یقینی ہو۔ چونکہ ایسا نہیں ہے اس لیے سرمایہ پر ایک متعیّن شرحِ سود کی ادائگی کا مطالبہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درست نہیں قرار دیا جاسکتا۔

نفع آوری سرمایہ کی لازمی صفت نہیں ہے[1]۔ اگر ایسا ہوتا تو جس کاروبار میں بھی سرمایہ لگایا جاتا نفع ہوتا۔ سرمایہ کاروباری فیصلوں کے نفاذ کا ذریعہ اور آلہ ہے۔ اس کی مدد سے عوامل پیدائش کو یکجا کیا جاسکتا ہے، پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن اسے اس بات میں کوئی دخل نہیں کہ اس پیداوار کی فروخت سے آمدنی کتنی ہوتی ہے۔ نفع کا انحصار آمدنی پر ہے نہ کہ پیداوار کی مقدار پر۔ سرمایہ اور سامان سرمایہ (CAPITAL GOODS) پیداواری عمل میں جو حصہ بھی لیتے ہیں وہ پیداوار کی تیاری تک محدود ہے۔ یہ پیداوار بازار میں فروخت ہوسکے گی یا نہیں۔ کس قیمت پر فروخت ہوگی، اور اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی مجموعی آمدنی لاگت سے کم ہوگی یا اس سے زیادہ ان باتوں کا انحصار سرمایہ پر نہیں دوسرے امور پر ہے۔

کاروباری قرض سے کاروبار میں لگائے جانے والے قرض سرمایہ پر سود کے مطالبہ کی غیر معقولیت کو سمجھنے کے لیے اس صورتِ حال پر غور کیجیے جب کاروبار میں خسارہ ہوا ہو۔ ایک طرف تو کاروباری کو خسارہ کے باوجود اس قرض کی واپسی کا انتظام کرنا ہے اور دوسری طرف وہ اپنی سعی وجہد کے باوجود ایک عرصہ تک کاروبار کے نتیجہ میں کوئی آمدنی نہیں حاصل کرسکا۔ اس کے ساتھ ہی اس سے یہ مطالبہ کرنے کی کیا بنیاد ہے کہ وہ اپنی جیب سے سود کی رقم بھی ادا کرے؟

چونکہ قرض سرمایہ دینے والا کاروبار میں نقصان کی شکل میں کوئی ذمہ داری نہیں لیتا اور اپنا پورا سرمایہ واپس لیتا ہے، لہٰذا اگر قرض سرمایہ لے کر کاروبار کرنے والے کو نفع ہو تو اس

---

[1]: پیدا آوری یا نفع آوری کے سرمایہ کی لازمی صفت ہونے، اور اس تصور پر مبنی نظریۂ سود پر تفصیلی تنقید کے لیے ملاحظہ ہو: (Eugen V. Bhom Bawerk : Capital and Interest, Book II Kelly and Millman Inc New York—1957)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شکل میں بھی سرمایہ دار کو اس نفع میں سے کسی حصہ کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کے سرمایہ نے دراصل کاروبار میں کوئی حصہ ہی نہیں لیا ہے۔ یہ بات بظاہر قابلِ تعجب معلوم ہو گی لیکن تھوڑے غور و فکر سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ قرض سرمایہ بحفاظت واپسی کی شرط پر دیا جاتا ہے۔ قرض دیتے وقت سرمایہ دار کاروباری سے اس بات کی قانونی ضمانت حاصل کر لیتا ہے کہ اس کا اصل سرمایہ واپس کر دیا جائے گا۔ عام طور پر اس غرض کے لیے کاروباری فرد کو اپنا کارخانہ، کوئی اور جائداد، یا کوئی ایسی چیز ضمانت میں دینی پڑتی ہے جس کے ذریعہ خسارہ کی شکل میں اصل سرمایہ کی بازیافت ممکن ہو۔ کاروباری فرد بلاشبہ قرض لیے ہوئے سرمایہ کو عواملِ پیدائش کی فراہمی و مختلف کاروباری اغراض کے لیے استعمال کرتا ہے لیکن استعمال میں آنے کے باوجود یہ سرمایہ اس خطرہ سے بری الذمہ رہتا ہے جو اس استعمال میں مضمر ہے۔ قرض سرمایہ اس عدمِ تیقن سے بری اور بے فکر رہتا ہے جو کاروبار کا خاصہ ہے۔ اگر کاروباری فیصلوں کی غیر موزونیت کے سبب سرمایہ کا ایسا استعمال عمل میں آئے جس کے نتیجہ میں کاروبار میں خسارہ ہو تو اس سرمایہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو عملاً استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس خسارہ کا تمام تر اثر کاروباری فرد پر پڑتا ہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح اصل سرمایہ کی واپسی کا اہتمام کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی ذریعہ سے اتنا سرمایہ دوبارہ نہیں فراہم کر سکتا تو اس خسارہ کا اثر اس کی اس جائداد پر پڑتا ہے جو اس نے ضمانت میں درج کرائی ہے۔ لہٰذا کاروبار میں پیش آنے والے خطرات اور عدمِ تیقن کی کیفیت کو برداشت کرنے والی چیز وہ سرمایہ نہیں جو قرض لے کر استعمال کیا جا رہا ہے بلکہ اصل سرمایہ کی واپسی کے وہ متبادل ذرائع، یا وہ چیزیں ہیں جن کی سرمایہ دار کو ضمانت دی گئی ہے۔

اوپر ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ پیداواری عمل میں سرمایہ کا حصہ یہ ہے کہ وہ خود کو کاروباری فرد کے ان فیصلوں کا تابع بنائے جو وہ غیر متیقن کاروباری امور میں کرتا ہے، اور خسارہ کا خطرہ مول لے۔ قرض سرمایہ پیداواری عمل میں یہ حصہ نہیں لیتا۔ پھر وہ کونسا عمل ہے جس کے عوض اصل سرمایہ کی واپسی کے ساتھ سود کا بھی مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کے نزدیک کاروباری اغراض کے لیے دیے جانے والے قرضوں پر بھی سود

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حرام ہے کیونکہ اس کے اصول کے مطابق سرمایہ دار اسی صورت میں اپنے سرمایہ کے ذریعہ نفع کما سکتا ہے جب وہ ہر حال میں کاروبار کے نتائج میں شریک رہے۔ نفع ہو تو نفع پائے اور نقصان ہو تو نقصان اٹھائے۔ نفع وہی حاصل کر سکتا ہے جو نقصان ہونے کی شکل میں نقصان بھی گوارا کرے۔ نقصان کی ذمہ داری سے کنارہ کش رہ کر سرمایہ پر نفع کمانے کی کوئی بھی شکل اسلام میں جائز نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت واضح الفاظ میں اس اصول کی تصریح فرما دی ہے:

عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الخراج بالضمان۔[1]

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نفع، نقصان اٹھانے کی ذمہ داری کے ساتھ وابستہ ہے۔"

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل سلف وبيع، ولا شرطان في بيع، ولا ربح ما لم تضمن، ولا بيع ما ليس عندك۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک ہی معاملہ میں ادھار دینا اور تجارتی سودا کرنا دونوں کا شمول درست نہیں۔ نہ ایک تجارتی معاملہ میں دو مختلف شرطیں کرنا صحیح ہے اور نہ اس چیز کا نفع لینا صحیح ہے جس کے نقصان کی ذمہ داری تم نے نہ لی ہو۔ ایسی چیز کی فروخت بھی صحیح نہیں جو تمہارے پاس موجود نہ ہو۔"

---

[1]: ابوداؤد، کتاب البیوع۔ باب فیمن اشتری عبدًا فاستعملہ ثم وجد بہ عیبًا۔ اسی حدیث کو حاکم نے مستدرک (جلد ۲ صفحہ ۱۵) میں بھی اسی مضمون کی دوسری متعدد حدیثوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ بعض حدیثوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولی ارشاد کا عملی پس منظر بھی سامنے آتا ہے۔ جو بات اصولی طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ فروخت کی جانے والی چیز کے منافع اور ثمرات سے استفادہ کا حق اُسے ہے جو اس پر وارد ہو سکنے والے خطرات کا ذمہ دار ہو۔

[2]: ابوداؤد: کتاب البیوع۔ باب فی الرجل یبیع ما لیس عندہ۔ یہ حدیث ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ ... . وعن ربح ما لم یضمن [لہ]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے ...... اور اس چیز کا نفع لینے سے جس کے نقصان کی ذمہ داری نہ لی گئی ہو۔"

ان احادیث میں 'ضمان' سے مراد ان تمام خطرات کے نتائج کی ذمہ داری ہے جو کسی چیز پر وارد ہو سکتے ہیں۔ اشیاء تجارت کے چوری چلے جانے آگ سے جل جانے یا کسی آفت ناگہانی کے سبب اچانک تباہ ہو جانے کے نتیجہ میں خسارہ کی ذمہ داری بھی 'ضمان' میں شامل ہے اور بازار کا بھاؤ گر جانے کے سبب خسارہ کی ذمہ داری بھی 'ضمان' میں شامل ہے۔ فقہاء کے نزدیک ضمان کا جو مفہوم ہے اسے ہم اس طور پر بھی بیان کر سکتے ہیں کہ یہ قابلِ تامین خطرات (Insurable Risks) اور ناقابلِ تامین خطرات یا حقیقی عدمِ تیقّن (True Uncertainty) سے وابستہ خطرات دونوں کو جامع ہے۔ فقہاء

اسلام نے ضمان کا جو تجزیہ کیا ہے اس میں قابلِ تامین اور ناقابلِ تامین خطرات کے درمیان تفریق نہیں کی گئی ہے، کیونکہ ان کے زمانہ میں تامین کا رواج نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ تمام فقہاء اسلام اس اصول پر متفق ہیں کہ نفع کا استحقاق ضمان سے وابستہ ہے۔ کوئی فرد ضمان سے بری ہو کر نفع کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔[ٹہ] سرمایہ پر نفع اسی وقت کمایا جا سکتا ہے جب کاروبار میں پیش آنے والے خطرات کی ذمہ داری بھی قبول کی جائے۔ اس ذمہ داری میں شریک ہوئے بغیر سرمایہ پر نفع نہیں کمایا جا سکتا ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر فرما دیا ہے کہ نفع ذمہ داری کے ساتھ وابستہ ہے۔

اوپر کی بحث سے واضح طور پر یہ اصول سامنے آتا ہے کہ اسلام کے نزدیک سرمایہ

لہ: مسند امام احمد۔ نشر کردہ استاذ احمد محمد شاکر۔ جلد ۱۰ نمبر ۶۶۲۸ اور نمبر ۶۶۷۱۔ استاذ شاکر نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

ٹہ: اس اصول پر مکمل بحث کے لیے ملاحظہ ہو کاسانی: بدائع الصنائع، جلد ۶، صفحہ ۶۲، ۶۳۔

www.KitaboSunnat.com

پر نفع اسی وقت مل سکتا ہے جب وہ کاروبار میں اس عدمِ تیقن کے تابع اور خطر انگیزی کا حامل ہو کر داخل ہو جو کاروبار کا خاصہ ہے۔ نقصان سے بری الذمہ ہو کر کاروبار میں داخل ہونے والا سرمایہ نفع کا طالب نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں ہر طرح کے سود کی حرمت کے علاوہ خود یہ اصول بھی کاروباری اغراض کے لیے دیے جانے والے قرضوں پر سود کے ناجائز ہونے کا ایک قطعی ثبوت ہے۔

مذکورہ بالا تینوں شکلوں ——— ذاتی کاروبار، شرکت اور مضاربت ——— میں سرمایہ کاروبار میں نقصان کے خطرہ کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ زیرِ غور شکل میں سرمایہ اپنی بحفاظت واپسی کی شرط کے ساتھ، نقصان کے خطرہ سے بری الذمہ ہو کر داخل ہوتا ہے۔ یہی فرق اس آخری شکل میں نفع کے استحقاق کو ختم کر دیتا ہے۔ اس اصول کی معقولیت پر مزید اطمینان کے لیے اس نفسیاتی کیفیت کا بھی مطالعہ کر لینا مفید ہوگا جو سرمایہ کے کاروبار میں شرکت کی ان دو مختلف صورتوں میں کاروباری فرد کی ہوتی ہے۔ پہلی صورت میں کاروباری فرد کو صرف دو طرح کے خطرے ہوتے ہیں۔ ایک خطرہ یہ ہے کہ نقصان کی شکل میں وہ خود آمدنی سے محروم رہے گا۔ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ سرمایہ داروں کی نظر میں اس کی ساکھ گر جائے گی، وہ ان کا اعتماد کھو دے گا، اور آئندہ اسے کاروبار کے لیے مضاربت کے اصول پر سرمایہ نہ حاصل ہو سکے گا۔ یہ دو خطرے اس بات کے لیے کافی ہیں کہ اُسے ذمہ دارانہ عمل پر آمادہ کریں اور وہ حتی الامکان کاروباری فیصلوں میں غلطی سے اجتناب کرے۔ دوسری صورت میں ان دو خطروں کے علاوہ اسے ایک تیسرا خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے، اور وہ خطرہ یہ ہے کہ خسارہ کی شکل میں اسے اصل سرمایہ یا اس کا ایک حصہ اپنے گھر سے ادا کرنا پڑے گا۔ یہ نیا خطرہ کاروباری جدوجہد میں اس کے لیے زنجیر پا بن جاتا ہے۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ کاروبار میں غیر معمولی احتیاط سے کام لے۔ وہ اس جرأت اور خطر انگیزی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا جو اس خطرہ کے بغیر ممکن تھی اس میں غیر معمولی جھجک پیدا ہو جاتی ہے۔ کاروباری عمل میں کامیابی اور نفع کی مقدار کی تعیین میں جرأت، خطر انگیزی، اور بے جھجک فیصلے کرنے کی صفات کو جو اہم مقام حاصل ہے اس کے پیش نظر واجب الادا قرض سرمایہ سے کاروبار کرنے اور ذاتی

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرمایہ، شرکت کے سرمایہ، یا مضاربت کے اصول پر حاصل کیے ہوئے سرمایہ سے کاروبار کرنے میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ پہلی صورت میں نفع کا امکان کم اور دوسری صورت میں زیادہ ہوتا ہے[1]۔

کرایہ:

اپنی ملکیت کے نفع آور استعمال کی جائز شکلوں میں سے ایک شکل یہ بھی ہے کہ اسے کرایہ پر دیا جائے۔ کرایہ پر صرف وہی چیزیں دی جا سکتی ہیں جو صرف (CONSUME) نہ کی جاتی ہوں بلکہ استعمال (USE) کی جاتی ہوں، مثلاً زمین، مکان، مشین، فرنیچر، برتن اور دوسری دیرپا اشیائے صرف اور جانور وغیرہ[2]۔ استعمال اور صرف کا بنیادی فرق یہ ہے کہ استعمال کی جانے والی چیز خود برقرار رہتی ہے اور ایک عرصہ تک اپنے استعمال کرنے والے کو چند فوائد منتقل کر سکتی ہے۔ صرف کی جانے والی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کے عمل میں یہ چیزیں بذاتِ خود اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں مثلاً کھانے پینے کی چیزیں انسان کے بدن کا جزو بن جاتی ہیں یا خام صنعتی مال جو دوسرے مال کی تیاری میں لگ جاتا ہے روئی کپڑے کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے، چمڑا جوتا بنانے میں کام آ جاتا ہے، وغیرہ۔ فقہی اصطلاح میں اشیا کے صرف کو استہلاک کہا گیا ہے۔ یعنی ایسا استعمال جس میں خود وہ چیز ہلاک ہو جاتی ہے اپنا امتیازی وجود کھو بیٹھتی ہے۔ اس کے برعکس کرایہ پر دی جانے والی چیزیں پوری طرح صرف ہو جانے کے بجائے گھسنے اور پرانے ہونے کی حد تک متاثر ہوتی ہیں۔ استعمال سے ان کی وہ عمر کم ہو جاتی ہے جس کی حد تک وہ مزید استعمال کی جا سکتی ہیں۔ اصولی طور پر

---

[1]: جرأتِ اقدام، خطر انگیزی، اور بے جھجک فیصلوں کی صفات اور نفع کے باہمی تعلق پر (Schumpeter, Knight) اور (Keirstead) کی محولۂ بالا کتابوں کا مطالعہ مفید رہے گا۔

[2]: الکاسانی: بدائع الصنائع جلد ۴، صفحہ ۱۷۳

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی قانون میں کرایہ "کسی چیز کے استعمال کے فائدوں کی قیمت" کو کہتے ہیں۔ کرایہ پر دی جانے والی چیز اصل مالک ہی کی ملکیت رہتی ہے مگر اس کے فوائدِ استعمال کرایہ پر لینے والے کی ملکیت بن جاتے ہیں۔ اشیاء صرف کا کرایہ پر لین دین اس لیے درست نہیں ہے کہ وہ ایسے فائدے کی حامل نہیں ہوتیں جو اصل شئے (عین) کو برقرار رکھتے ہوئے حاصل کیے جا سکیں۔

ایک صاحبِ بصیرت فقیہ نے کرایہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے :

"اجارہ کے معنی ——— اجارہ لغوی اعتبار سے فائدہ (منفعت) کی بیع کا نام ہے اسی لیے اہلِ مدینہ اسے بیع کہتے ہیں اور مراد لیتے ہیں فائدہ کی بیع۔ اسی وجہ سے اس معاملہ میں عوض کو "اجرت" کہا گیا ہے، اور اجرت کے لغوی معنی ہیں فائدہ کا معاوضہ . . . . درختوں یا انگور کی بیلوں کو ان کے پھل کی خاطر کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا کیونکہ پھل "عین" ہیں اور اجارہ منفعت کی بیع کو کہتے ہیں نہ کہ عین کی بیع کو . . . . درہم و دینار یا ان کی دھات کا کرایہ پر لین دین جائز نہیں ہے، نہ پیتل اور سیسہ کا اجارہ درست ہے۔ اسی طرح ان تمام چیزوں کا کرایہ پر لین دین غلط ہے جو (عام طور پر) ناپی یا تولی جاتی ہیں، کیونکہ ان سے انتفاع اسی وقت ممکن ہے جبکہ خود ان چیزوں کا استہلاک عمل میں لایا جائے، جبکہ اجارہ کے تحت آنے والی چیز فائدہ ہے نہ کہ اصل شئے"[۱]

جیسا کہ اوپر کی عبارت میں صراحت کر دی گئی ہے، نقد سرمایہ کو کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا۔ نقد سرمایہ کو خرچ کیے بغیر اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ وہ خود باقی رہتے ہوئے اپنے فوائدِ استعمال منتقل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا[۲]

کرایہ پر معاملہ اسی شکل میں درست ہوگا جب کرایہ پر دی جانے والی چیز اس حالت میں ہو کہ اس سے فوائدِ استعمال کا حصول یقینی ہو۔ جہاں کہیں بھی فوائدِ استعمال کا حصول مشتبہ ہوتا ہے

---

۱ : علامہ ابن مسعود کاسانی : بدائع الصنائع، جلد ۴، صفحہ ۱۷۴ - ۱۷۵

۲ : نقد سرمایہ کے "فوائدِ استعمال" کو بنیاد بنانے والے نظریۂ سود پر تفصیلی تنقید کے لیے بھی بام باورک کی مذکورہ بالا کتاب (CAPITAL AND INTEREST) کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہاں اسلام کرایہ پر معاملہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مثلاً بنجر زمین جس پر کاشت نہ کی جاسکتی ہو زرعی اغراض کے لیے کرایہ پر نہیں دی جاسکتی۔[۱]

کرایہ پر دی جانے والی چیز سے فوائد استعمال حاصل کرنے کے لیے اگر اس کی مرمت اور درستی ضروری ہو تو اس کی ذمہ داری، اور اس پر آنے والے اخراجات کا بار مالک کے ذمہ ہوگا نہ کہ کرایہ دار کے ذمہ۔ مثلاً کرایہ پر لیے جانے والے مکان کی مرمت مالک مکان کے ذمہ ہے نہ کہ کرایہ دار کے۔ مرمت کے اخراجات کرایہ دار کے ذمہ کرنے کی شرط اسی صورت میں صحیح تسلیم کی جاسکتی ہے جب اسے کرایہ میں سے وضع کرنے کی شرط بھی طے کر لی جائے۔[۲]

کرایہ پر دی جانے والی چیز کے ضائع ہو جانے یا کسی آفت یا حادثہ کے سبب اسے نقصان پہنچ جانے کی شکل میں اس کا نقصان مالک کو برداشت کرنا ہوگا، کرایہ دار اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں کرایہ پر دی جانے والی چیز کی ضمان، مالک سے متعلق ہے۔ جب تک یہ نہ ثابت ہو جائے کہ کرایہ پر دی جانے والی چیز کے ضائع ہونے یا اسے نقصان پہنچنے میں کرایہ دار کی بے تدبیری، غلط استعمال، دانستہ لاپروائی، اور معروف طریقہ کے مطابق اس کا تحفظ نہ کرنے کو دخل تھا اسے ان نقصانات کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جاسکتا۔[۳]

کرایہ کی آمدنی مالک کے لیے ایک جائز آمدنی ہے۔ کرایہ اور کسی شے یا خدمت کی قیمت میں اصولاً کوئی فرق نہیں۔ جس طرح ایک سیر گیہوں کی قیمت لینا درست ہے اسی طرح کھانے کے برتنوں کے ایک دن کے فوائد استعمال کی قیمت لینا بھی درست ہے۔ دونوں صورتوں میں قیمت ادا کرنے والا ان فوائد کی قیمت ادا کرتا ہے جن کی اسے خرید کردہ یا کرایہ پر لی ہوئی چیز سے توقع ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں قیمت وصول کرنے والا ان فوائد

---

۱ : کاسانی : بدائع الصنائع، جلد ۴ صفحہ ۱۷۵

۲ : مذکورہ بالا امور اور کرایہ کے معاملہ سے متعلق دوسری تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:
بدائع الصنائع جلد ۴ صفحہ ۲۰۷ ، ومابعد، اور بدایۃ المجتہد جلد ۲ صفحہ ۲۱۹ اور مابعد

۳ : ایضاً

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی قیمت وصول کرنا ہے جس سے وہ خریدار کے حق میں دست بردار ہوتا ہے۔

کرایہ پر دی جانے والی چیزیں استعمال سے پرانی ہوتی گھستی اور ٹوٹ پھوٹ اور فرسودگی (Depreciation) کا شکار ہوتی ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ چیزیں اپنی عمر پوری کر لیتی ہیں اور نا قابلِ استعمال ہو جاتی ہیں۔ مکان گر جاتا ہے، فرنیچر بوسیدہ اور دانہ کارہ رفتہ ہو جاتا ہے، برتن نا قابلِ استعمال ہو جاتے ہیں۔ کرایہ کے طور پر دی جانے والی رقم کے ایک حصہ کو اخراجات فرسودگی (Depreciation Allowance) سمجھنا چاہیے۔ یہ رقم اس چیز کی مجموعی قیمت کا وہ حصہ ہے جس کے بقدر کسی متعینہ مدت میں استعمال کے سبب، اس چیز کی قیمت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اگر ایک میز کی قیمت دس روپے ہے، اور وہ دس سال تک استعمال کی جاسکتی ہے (اور اس پوری مدت میں یکساں فائدہ پہنچاتی رہتی ہے) تو اس کے سالانہ کرایہ میں سے ایک روپیہ کی رقم اس کی فرسودگی کی تلافی کرتی ہے۔ یہی رقم ان فوائدِ استعمال کی لاگت ہے جن کو مالک کرایہ دار کے ہاتھوں فروخت کرتا ہے۔

جس طرح تجارت میں کسی چیز کو اس کی لاگت سے زیادہ داموں پر فروخت کرنا اس لیے حق بجانب ہے کہ کبھی کبھی تاجر اپنے مال کو لاگت سے کم داموں پر فروخت کرنے پر بھی مجبور ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کرایہ کی رقم بھی لاگت سے زیادہ رکھی جاسکتی ہے۔ ایسی صورتیں بھی پیش آتی رہتی ہیں جن میں مالک کو اپنے سامان کا اتنا کم کرایہ ملے کہ اس سے اس کی لاگت نہ پوری ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دوسری اشیا کی قیمتوں کی طرح کرایہ کی شرح کی تعیین بھی طلب اور رسد کی قوتیں کرتی ہیں۔ وہ مالک جو کرایہ پر چلانے کے لیے سامان یا جائداد خریدتا ہے اس بات کا خطرہ مول لیتا ہے کہ اسے مستقبل میں جو کرایہ ملے وہ اس کی لاگت (یعنی اس چیز کے اخراجاتِ فرسودگی) سے کم ہو۔ کرایہ پر چیزیں چلانے کا کاروبار بھی عدمِ تیقن کی فضا میں انجام دیا جاتا ہے۔ اس کاروبار کی یہ نوعیت اس بات کے لیے کافی ہے کہ لاگت سے زیادہ کرایہ لینے کو جائز قرار دیا جائے۔ اس نکتہ کی وضاحت ہم اوپر "نفع" کی بحث میں کر چکے ہیں۔

آخر میں ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کریں گے کہ کرایہ کے استحقاق، اور لاگت سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیادہ کرایہ لینے کے جواز پر یہ بات بھی دلیل ہے کہ نقصان کی ذمہ داری اور کرایہ پر دی جانے والی چیز سے متعلق ضمان تمام تر مالک اٹھاتا ہے۔

۱- زرعی زمینوں کا کرایہ (لگان)

جہاں تک غیر زرعی اغراض کے لیے کرایہ پر لی جانے والی زمینوں کا معاملہ ہے۔ اس کی حیثیت وہی ہے جو کسی مکان کے کرایہ کی ہے۔ غیر زرعی زمینوں کا کرایہ ان فوائد استعمال کی قیمت ہے جن کا حصول یقینی اور غیر مشتبہ ہے۔ مکان یا گودام کی تعمیر کے لیے کرایہ پر لی جانے والی زمینوں کا معاملہ یہی ہے۔ البتہ زمین کا کرایہ اخراجات فرسودگی کے عنصر سے خالی ہوتا ہے، کیونکہ زمین کی عمر غیر محدود ہے، اور اس کے استعمال سے اس میں فرسودگی نہیں آتی۔

زرعی اغراض کے لیے کرایہ پر لی جانے والی زمینوں کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ فرق یہ ہے کہ جس فائدہ کے لیے زرعی زمین کرایہ پر لی جاتی ہے اس کے حصول میں بعض ایسے اسباب کی بنا پر ناکامی ہوسکتی ہے جو کرایہ دار کے قابو سے باہر ہیں۔ مثلاً کوئی آفت ناگہانی جس کی وجہ سے فصل بالکل برباد ہوجائے، یا زمین بارانی ہو اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے کوئی پیداوار نہ ہو۔ زرعی زمین کا فائدہ استعمال یہ ہے کہ اس کو پیداوار حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ اگر کوئی زمین بنجر ہو یا شور زدہ ہونے کی وجہ سے زراعت کے قابل ہی نہ ہو تو جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ زرعی اغراض کے لیے اس کو کرایہ پر دینا درست نہیں ہوگا۔ اگر زمین زراعت کے قابل ہے، لیکن کسی خارجی سبب کی بنا پر جس میں کرایہ دار کے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہ ہو۔ اس سے پیداوار حاصل کرنا ناممکن ہوجائے، تو کرایہ دار پر اس کا کرایہ واجب نہیں ہوگا[1]

---

[1] : ابن رشد: بدایۃ المجتہد جلد ۲ صفحہ ۲۳۱، محمد قدری پاشا: مرشد الحیران دفعات $\frac{۵۹۵}{۵۹۶}$ طبع بولاق مصر ۱۸۹۱ء
زرعی زمینوں کے کرایہ کے جواز پر بحث اور اس سے متعلق تفصیلی شرائط اور ان کے بارے میں مختلف مکاتب فقہ کے درمیان اختلافات کے جائزہ کے لیے فقہ کی معروف کتابوں کے 'اجارہ' سے متعلق ابواب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ ان شرائط کے ساتھ زمین کو کرایہ پر دینے کا اصول بے انصافی اور ضرر سے پاک ہے۔ دوسری اشیا کی طرح زمین کا کرایہ بھی اسی حال میں جائز رکھا گیا ہے جبکہ اس کے فوائد استعمال معلوم اور ان کا حصول یقینی ہو۔ نہ ہی یہ بات کہ کاشتکار کو اپنی پیداوار کی فروخت سے نفع ہوتا ہے یا نہیں، اور وہ اسے لاگت سے زیادہ داموں پر فروخت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں، تو یہ کرایہ کی بحث سے غیر متعلق ہے۔ یہ سوال تو ان تمام اشیاء کے سلسلہ میں پیدا ہو سکتا ہے جن کو کرایہ پر یا اُجرت پر حاصل کر کے پیداآوری کاروبار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً مشینیں، کارخانہ کی عمارت، مزدور کی خدمات وغیرہ۔ جس طرح دوسری چیزوں کے کرایہ کا جواز اور استحقاق اس بات پر منحصر نہیں کہ کرایہ دار کو اپنے کاروبار میں ان چیزوں کے استعمال سے ان کی لاگت سے زیادہ آمدنی ہو۔ اسی طرح زرعی زمینوں کے بارے میں یہ بحث نہیں چھیڑی جا سکتی۔ کرایہ کے جواز اور استحقاق کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ان فوائدِ استعمال کا حصول یقینی ہو جو براہِ راست کرایہ پر لی جانے والی چیز سے متعلق ہیں۔ زرعی زمینوں کے معاملہ میں جس چیز پر نظر رکھی جائے گی وہ زمین کا پیداوار کے حصول کا ذریعہ ہونا ہے نہ کہ اس کی پیداوار کی فروخت سے نفع کا حصول۔ زمین کے مالک کے لیے زرعی زمین کے کرایہ کا حق دار ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ زمین قابلِ کاشت ہو اور کاشتکار کے لیے اس کی اس صلاحیت سے فائدہ اُٹھانا ناممکن نہ ہو جائے۔ زرعی زمین کا کرایہ زمین کی اس پیداواری قوت کا معاوضہ ہے جس سے مالک کرایہ دار کے حق میں دستبردار ہوتا ہے۔

دوسری چیزوں کی قیمتوں کی طرح اشیائے استعمال کے کرایہ، اور زرعی زمینوں کے کرائے (لگان) کی شرحیں متعین نہیں کی گئی ہیں بلکہ ان کی تعیین کو بازار کے حالات اور طرفین کی رضامندی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر فروخت کنندہ یا زمیندار کسی مخصوص صورتِ حال میں خریدار یا کرایہ دار کی مجبوری یا کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ظالمانہ قیمتیں وصول کرنا چاہے اور غیر معمولی نفع اندوزی پر اتر آئے تو اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے مناسب اقدام کرنے کا اختیار اسلامی ریاست کو ہے۔ مسئلہ کے اس پہلو پر بارھویں باب میں بحث

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی جائے گی۔

۲۔ مزارعت :-

مزارعت اس کو کہتے ہیں کہ زرعی زمین کا مالک اپنی زمین کسی دوسرے فرد کو اس زمین کی پیداوار میں ایک متعین نسبت سے حصّہ دار ہونے کی شرط پر کاشت کے لیے دے۔

مزارعت کے موضوع پر نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے متعدد احادیث مروی ہیں۔ یہ احادیث دو طرح کی ہیں۔ بعض احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مزارعت کا عمل جائز ہے۔ نبی صلّی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ طریقہ اختیار کیا ہے اور آپ کے سامنے صحابہ کرام اس پر عمل کرتے رہے ہیں جس سے آپ نے انہیں منع نہیں کیا۔ دوسری وہ احادیث ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مزارعت ممنوع ہے۔ یہاں ان احادیث پر تفصیلی بحث ممکن نہیں۔ اس کے لیے موزوں ماخوذ کی طرف رجوع کرنا چاہیے[۵]۔ ان احادیث کی روشنی میں جمہور فقہاء نے یہ رائے قائم کی ہے کہ مزارعت جائز ہے، اور سلف سے آج تک امّت کی اکثریت اس رائے پر عمل کرتی رہی ہے۔ البتہ اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ مزارعت کی کونسی

---

۵ : حنفی مسلک کے لیے کاسانی : بدائع الصنائع جلد ۶ صفحہ ۱۷۵-۱۸۵ (کتاب المزارعۃ)

ابنِ ہمام : فتح القدیر جلد ۸ صفحہ ۳۲-۴۵ (کتاب المزارعۃ)

اور سرخسی : المبسوط، جلد ۲۳ صفحہ ۲ تا ۱۶۱۔ اور دوسرے معروف ماخذ

مالکی مسلک کے لیے : بلغۃ السالک لاقرب المسالک : شیخ احمد الصاوی علی الشرح الصغیر

احمد الدردیر۔ جلد ۲ صفحہ ۱۶۵-۱۶۶ مصطفی بابی وا ولادہ۔ مصر۔ ۱۳۴۰ھ

اور المدونۃ الکبریٰ، جلد ۴ صفحہ ۲۹ (فی الشرکۃ فی الزرع)

شافعی مسلک کے لیے : منہاج الطالبین وعمدۃ المفتین : ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی

کتاب المساقاۃ (صفحہ ۶ طبع ۱۳۴۳ھ) اور اس پر شہاب الدین احمد الرملی کی شرح

(نہایۃ المحتاج)۔

حنبلی مسلک کے لیے : ابن قدامہ کی المغنی اور شرح الکبیر جلد ۵ صفحہ ۵۸۱/۵۹۵ نیز اس موضوع پر احادیث کے مفصل جائزہ اور جامع بحث کے لیے ملاحظہ ہو : سیّد ابوالاعلیٰ مودودی : مسئلہ ملکیتِ زمین صفحہ ۲۵ تا ۷۰ مکتبہ جماعت اسلامی۔ لاہور ۱۹۵۰

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شکلیں جائز ہیں اور کونسی جائز نہیں ہیں۔ مزارعت کی بعض شکلوں اور ان کے بارے میں فقہار کی رایوں کا خلاصہ درج ذیل ہے[۱]۔

۱۔ مزارعت کی سب سے سادہ شکل یہ ہے کہ زمین کا مالک صرف زمین فراہم کرے اور کاشتکار اپنے پاس سے بیج اور آلاتِ زراعت فراہم کرکے اپنی محنت سے اس زمین پر کاشت کرے۔ پیداوار میں دونوں فریق طے شدہ نسبتوں سے شریک ہوں۔

مزارعت کی یہ شکل امام محمد اور امام ابو یوسف کے نزدیک جائز ہے اور حنفی فقہ میں فتویٰ اسی رائے کے مطابق ہے۔ اگرچہ خود امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ شکل ناجائز ہے۔ متقدمین حنابلہ کے نزدیک یہ شکل جائز نہیں مگر متاخرین نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے[۲]۔

امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک یہ شکل ناجائز ہے۔

۲۔ مزارعت کی دوسری شکل یہ ہے کہ زمین کا مالک بیج بھی فراہم کرے اور کاشتکار آلاتِ زراعت فراہم کرکے اس زمین پر محنت کرے۔ پیداوار میں دونوں فریق طے شدہ نسبتوں سے شریک ہوں۔

امام محمد، امام ابو یوسف اور حنبلی فقہا کے نزدیک یہ شکل جائز ہے۔ حنفی فقہ میں فتویٰ امام محمد اور امام ابو یوسف کی رائے کے مطابق ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک یہ شکل ناجائز ہے۔ مالکی فقہ میں یہ معاملہ مذکورہ بالا شکل میں تو ناجائز ہے لیکن جیسا کہ آئندہ بتایا جائے گا ان کے نزدیک مزارعت کا جو طریقہ جائز ہے اس کے تحت تھوڑی

---

[۱] : مندرجہ بالا تفصیلات زیادہ تر عبدالرحمٰن الجزیری کی الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۳ مباحث المزارعۃ سے ماخوذ ہیں۔ مذکورہ بالا ماخذ سے بھی مدد لی گئی ہے۔

[۲] : ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ بیج مالکِ زمین فراہم کرے بعض متقدمین مثلاً خرقی وغیرہ نے اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے لیکن امام احمد سے ایک دوسرا قول بھی مروی ہے جس کے مطابق اگر بیج کاشتکار فراہم کرے تو بھی مزارعت کا معاملہ جائز ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ مالکِ زمین اور کاشتکار دونوں بیج کی فراہمی میں شریک ہوں۔ ملاحظہ ہو المغنی جلد ۵ صفحہ ۵۹۰ اور الشرح الکبیر صفحہ ۵۸۷۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سی ترمیم کے ساتھ یہ شکل بھی آ سکتی ہے۔

۳۔ مزارعت کی تیسری شکل یہ ہے کہ زمین مالک کی ہو، محنت کاشت کار کرے، اور بیج اور آلاتِ زراعت دونوں فریق مل کر فراہم کریں۔ پیداوار میں دونوں طے شدہ نسبتوں کے ساتھ شریک ہوں۔

مزارعت کی یہ شکل امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی جائز ہے اور دوسرے فقہاءِ احناف کے نزدیک بھی۔ حنبلی فقہ میں بھی یہ شکل جائز ہے۔ البتہ شافعی فقہ میں یہ شکل جائز نہیں۔ مالکی فقہ میں مزارعت کی جائز شکل نیچے بیان کی گئی ہے۔ جس سے یہ واضح ہے کہ اگرچہ مذکورہ بالا شکل میں یہ معاملہ جائز نہیں لیکن بعض ترمیموں کے ساتھ یہ شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔

۴۔ مزارعت کی چوتھی شکل یہ ہے کہ زمین، بیج اور آلاتِ زراعت زمین کا مالک فراہم کرے اور کاشت کار صرف محنت کرے۔ پیداوار میں دونوں فریق طے شدہ نسبتوں کے ساتھ شریک ہوں۔

مزارعت کی یہ شکل بھی حنبلی فقہا اور امام محمد اور امام ابویوسف کے نزدیک جائز ہے۔ حنفی فقہ میں فتویٰ انہی کی رائے کے مطابق ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک یہ شکل ناجائز ہے۔

۵۔ مزارعت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ زمین، بیج، آلاتِ زراعت اور محنت ہر چیز میں دونوں فریق شریک ہوں۔ اور پیداوار میں طے شدہ نسبتوں کے مطابق حصہ دار ہوں۔ حنبلی فقہاء، امام محمد اور امام ابویوسف کے نزدیک یہ شکل بھی جائز ہے اور حنفی فقہ میں فتویٰ بھی اس کے حق میں ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک یہ شکل جائز نہیں ہے۔ امام مالک اور مالکی فقہا کے نزدیک یہ شکل تھوڑی ترمیم کے بعد جائز ہے، جیسا کہ ذیل میں بتایا جائے گا۔

امام مالک اور مالکی فقہا کے نزدیک مزارعت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ زمین کے کرایہ کے بقدر اس کے استعمال کی ایک قیمت مقرر کر لی جائے، اسی طرح محنت کے معاوضہ کا بھی اندازہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر کے ایک رقم متعیّن کر لی جائے، اور آلاتِ زراعت کے استعمال کا معاوضہ بھی نقد میں متعیّن کر لیا جائے۔ دونوں فریق آدھا آدھا بیج فراہم کریں۔ پیداوار میں دونوں کے حصّے ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کی نسبتوں کے مطابق ہوں۔ ہر ایک کا فراہم کردہ سرمایہ وہ رقم ہے جو اس کی فراہم کردہ زمین، آلات اور محنت یا ان میں سے بعض کے معاوضہ کے طور پر متعیّن کی گئی ہو۔ یہ جائز نہیں کہ پیداوار میں دونوں فریق کے حصّوں کی نسبتیں ان کے فراہم کردہ عوامل پیداوار کی قیمتوں کی نسبتوں سے مختلف ہوں[1]۔

اس صراحت کی روشنی میں بآسانی یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ مذکورہ بالا شکلوں میں سے تیسری اور پانچویں شکل اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ پیداوار میں دونوں فریقوں کے حصّے ان کے فراہم کردہ سرمایوں کی نسبت سے ہوں۔ اور دوسری شکل اس شرط کے علاوہ یہ ترمیم بھی چاہتی ہے کہ کاشت کار بھی آدھا بیج فراہم کرے۔ بعض مالکی فقہا کے نزدیک یہ ترمیم بھی ضروری نہیں ہے، پہلی شرط کی پابندی کافی ہے[2]۔ مالک کے فراہم کردہ بیج کی قیمت اس کے لگائے ہوئے سرمایہ کے اندر شامل کر لی جائے گی۔

امام شافعی اور شافعی فقہا کے نزدیک مزارعت کی صرف وہ شکل جائز ہے جو مساقات کے تحت آتی ہو۔ یعنی کسی باغ کا مالک اپنے باغ کی سینچائی اور دیکھ بھال کا کام کسی فرد کے ذمّہ اس شرط پر کرے کہ وہ باغ کے پھلوں میں سے ایک حصّہ کا حق دار ہوگا۔ اسی فرد کے ساتھ اس باغ میں درختوں کے درمیان جو خالی زمین ہو اس پر کاشت کے سلسلہ میں مزارعت کا معاملہ بھی کیا جا سکتا ہے[3]۔

---

[1] : الفقہ علی المذاہب الاربعہ : جلد ۳، صفحہ ۴ - ۵، احمد الدردیر : الشرح الصغیر صفحہ ۱۶۵ - ۱۶۶ اور المدونۃ الکبریٰ، جلد ۴ صفحہ ۴۹

[2] : احمد الدردیر : الشرح الصغیر جلد ۲ صفحہ ۱۶۶

[3] : امام شافعی کے نزدیک یہ معاملہ صرف کھجور اور انگور کے سلسلہ میں جائز ہے اور امام مالک کے نزدیک ہر باغ کے سلسلہ میں (بدایۃ المجتہد جلد ۲ صفحہ ۲۴۵)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مزارعت کی تمام جائز شکلوں میں یہ ضروری ہے کہ زمین زراعت کے قابل ہو، اس کا رقبہ متعین اور حدود زمین اور اس کا محلِ وقوع معلوم ہو، اور کاشت کار کے لیے اس پر بلا روک ٹوک محنت کرنا ممکن ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مزارعت کا معاملہ ایک متعین مدت کے لیے کیا جائے جو کم سے کم اتنی طویل ہو کہ ایک فصل تیار کر کے کاٹی جا سکے، اور اتنی زیادہ طویل نہ ہو کہ اس عرصہ میں کسی ایک فریق کی مدتِ عمر ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ البتہ اگر یہ امر معروف ہو کہ یہ معاملہ ہر فصل کے لیے الگ الگ کیا جاتا ہے تو بغیر تعیینِ مدت کے بھی معاملہ کیا جا سکتا ہے۔[۱]

یہاں ہم ان شرعی اور عقلی دلائل پر بحث نہیں کریں گے جن کی بنا پر مختلف فقہاء نے مزارعت کی مختلف شکلوں کو جائز یا ناجائز قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کے جائزہ سے ظاہر ہے، ہر مکتبِ فقہ میں یہ بات کسی نہ کسی شکل میں ضرور جائز ہے کہ زمین کا مالک اپنی زمین کسی دوسرے آدمی کو کاشت کے لیے دے اور پیداوار میں ایک طے شدہ حصہ کے مطابق شریک ہو۔ اس کتاب کے موضوع کی مناسبت سے ہم صرف اس اصول کی حد تک گفتگو کریں گے اور یہ واضح کریں گے کہ اپنی ملکیت کے ذریعہ نفع کمانے کی یہ شکل کیوں جائز رکھی گئی ہے۔

مزارعت کی مختلف شکلوں پر الگ الگ گفتگو کرنے کے بجائے ہم یہاں اس کی سب سے سادہ شکل پر گفتگو کریں گے، یعنی وہ شکل جس میں مالک صرف زمین فراہم کرتا ہے اور اس کے عوض کاشت کار سے زمین کی پیداوار میں ایک متعین نسبت کے مطابق شریک ہونے کا معاہدہ کرتا ہے۔

اصولی طور پر مزارعت کی یہ شکل مضاربت، یعنی نقد سرمایہ کو نفع میں شرکت کے اصول پر کاروبار کے لیے دینے کی شکل سے ملتی جلتی ہے۔ ان دونوں معاملوں میں بعض پہلوؤں کے اعتبار سے مماثلت ہے اور بعض پہلوؤں کے اعتبار سے یہ ایک دوسرے سے مختلف بھی واقع ہوئے ہیں۔

---

[۱] : الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۳ صفحہ ۸

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس طرح کاروبار بغیر سرمایہ کے نہیں کیا جا سکتا اسی طرح کھیتی بغیر زمین کے ممکن نہیں۔ جس طرح سرمایہ کو کاروبار میں لگانے کے لیے دوسرے آدمی کے ہاتھ میں دے کر سرمایہ دار نقصان کا خطرہ برداشت کرتا ہے اور اس خطرانگیزی کے عوض نفع میں ایک حصہ کا حق دار بن جاتا ہے اسی طرح زمین کے مالک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زرعی زمین کو دوسرے کے حوالہ کردے اور اس پیداوار کی مقدار کو اس آدمی کی محنت کے بھروسہ چھوڑنے کے عوض پیداوار میں ایک حصہ کا طالب بن جائے۔

اوپر ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ مزارعت کا معاملہ انہی زمینوں کے سلسلہ میں کیا جا سکتا ہے جو زراعت کے قابل ہوں اور پیداوار کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ پیدا آوری زرعی زمینوں کی ایک یقینی صفت ہے جس کے عملی ظہور کا انحصار کاشتکار کی محنت اور قدرتی حالات پر ہے۔ اس کے برعکس نفع آوری سرمایہ کی یقینی صفت نہیں بلکہ اس کا تمام تر انحصار کاروباری فریق کی جدّوجہد اور صلاحیتوں نیز بازار کے حالات پر ہے، جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے[1]۔ زراعت میں پیداوار سے یکسر محرومی ایک قلیل الوقوع امر ہے۔ کیونکہ زمین پر محنت کرنے کے بعد اس سے پیداوار حاصل ہونے کا انحصار جن قدرتی حالات پر ہے وہ نسبتًا کم تغیّر پذیر ہیں۔ بمقابلہ بازار کے ان حالات کے جن پر کاروباری فریق کی محنت کے بعد سرمایہ سے نفع حاصل ہونے کا انحصار ہے۔ کاروبار میں نفع نہ ہونا یا خسارہ ہونا ایک کثیرالوقوع امر ہے۔

مزارعت اور مضاربت کے درمیان ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ زمین خود کبھی نہیں ضائع ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ آفاتِ ناگہانی کے سبب اس کی پیداوار یا پیداوار کا ایک حصہ ضائع ہو جائے۔ یا کاشتکار کی کوتاہی کے سبب پیداوار اتنی مقدار میں نہ ہو سکے جتنی مقدار میں اس زمین کی زرخیزی کے پیشِ نظر ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس کاروبار میں خسارہ کی شکل میں سرمایہ خود بھی کلّی یا جزئی طور پر ضائع ہو سکتا ہے۔

اسی وجہ سے مزارعت اور مضاربت کے معاملوں میں دونوں فریقوں کے نفع نقصان کے درمیان بھی فرق ہے۔ مزارعت میں زمین کے مالک کو زمین کے ضائع جانے کا خطرہ

---

[1] : صفحہ ۱۷۳

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں مول لینا پڑتا، صرف اس کی صلاحیت پیداوار کے نتائج سے محرومی کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ جبکہ مضاربت میں سرمایہ کے مالک کو سرمایہ کے ضائع ہوجانے کا خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے۔ کاشت کار کو مزارعت میں صرف اسی بات کا خطرہ نہیں مول لینا پڑتا کہ وہ اپنی محنت کا کوئی ثمرہ نہ حاصل کر سکے، بلکہ پیداوار بالکل نہ ہونے، یا آفاتِ سماوی کے نتیجہ میں فصل کے برباد ہوجانے کی شکل میں اس کا وہ سرمایہ بھی ضائع ہوجاتا ہے جو وہ بیج اور آلاتِ زراعت (کے کرایہ) پر لگاتا ہے۔

امکانات کے اعتبار سے دونوں فریقوں کے حق میں مزارعت اور مضاربت کے درمیان اس فرق کا سبب زمین اور سرمایہ کے درمیان اور زرعی پیداوار اور کاروباری نفع کے وقوع کی کیفیت کے درمیان وہ فرق ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اسی فرق کی وجہ سے ان معاملات کے دائرے سے باہر بھی زمین کو، ایک ذریعہ آمدنی کی حیثیت سے، سرمایہ پر یک گونہ فوقیت حاصل ہے۔ زمین کے مالک کو اپنی زمین کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے کا ایک یقینی ذریعہ بھی میسر ہے، جبکہ سرمایہ کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے۔ شریعت نے زمین کو ایک متعین کرایہ پر دینے کی اجازت دی ہے جبکہ سرمایہ کو کرایہ (یا سود) پر نہیں دیا جاسکتا۔ زرعی زمین کا مالک جب اپنی زمین کو کرایہ پر دینے کے بجائے مزارعت کے اصول پر دیتا ہے تو وہ ایک متعین، یقینی نفع کو چھوڑ کر ایک ایسے نفع کو ترجیح دیتا ہے جس کا ملنا بھی غیر یقینی ہے اور مقدار بھی غیر متعین ہے۔ ایسا کرکے وہ اپنی زمین کے ذریعہ آمدنی سے یکسر محروم ہونے کا، یا ہونے والی آمدنی کے اُس کرایہ سے کم ہونے کا خطرہ مول لیتا ہے جو اُسے مل سکتا تھا۔ اس کے برعکس جب سرمایہ کا مالک اپنے سرمایہ کو مضاربت کے اصول پر کاروبار کے لیے دیتا ہے تو وہ کسی یقینی اور متعین نفع سے دست بردار نہیں ہوتا۔ سرمایہ سے نفع کا حاصل ہونا بہر صورت غیر یقینی ہے، اور اس کا نفع ہر حال میں غیر متعین ہے۔

اب اس معاملہ پر کاشت کار کے نقطۂ نظر سے غور کیجیے۔ جن قدرتی حالات پر پیداوار کی مقدار کا کسی حد تک انحصار ہے ان سے زراعت میں کہیں مفر نہیں۔ اگر کاشتکار زمین کو کرایہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر لے کر کاشت کرنا تو بھی اُسے ان غیر متعین حالات — موسم، آفاتِ ناگہانی — سے سابقہ پڑتا۔ اس کے لیے اس "خطرہ" سے بچنے کی صرف یہ شکل ممکن ہے کہ وہ اُجرت پر کام کرے۔ اگر اس نے اپنی محنت کو ایک متعین شرحِ اُجرت کے عوض فروخت کرنے پر مزارعت کے معاملہ کو ترجیح دی ہے تو اسی اُمید پر کہ ان خطرات کا مقابلہ کر کے وہ اُجرت سے زیادہ آمدنی حاصل کر سکے گا۔

کاشتکار بیج اور آلاتِ زراعت (کے کرایہ) کی شکل میں جو سرمایہ لگاتا ہے اس کے لیے بھی خطرہ برداشت کیے بغیر نفع یا پیداوار حاصل کرنے کی کوئی شکل ممکن نہیں ہے۔ اگر مزارعت کے معاملہ میں وہ پیداوار کی شکل میں نفع کی اُمید پر یہ خطرہ مول لیتا ہے تو عین مناسب ہے، اور بعض اوقات ان خطرات کے عملاً واقع ہو جانے اور سرمایہ کے ضائع چلے جانے کی وجہ یہ نہیں کہ مزارعت کا معاملہ غیر منصفانہ ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ کو ان خطرات سے مفر نہیں۔ ان خطرات کو مول لینے میں اگر اس بات کا امکان ہے کہ معتد بہ مقدار میں نفع ہو تو اس بات کا بھی امکان ہے کہ خسارہ ہو جائے۔ جب بھی زراعت میں سرمایہ لگایا جائے گا اس خطرہ کو مول لینا پڑے گا، یہاں تک کہ جو شخص اپنی مملوکہ زمین میں کاشت کرتا ہے اور بیج، آلاتِ پیداوار، سینچائی کے مصارف وغیرہ کی شکل میں سرمایہ لگاتا ہے اُسے بھی یہ خطرہ مول لینا پڑتا ہے — مزارعت میں اس خطرہ کا پایا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مزارعت کی دوسری جائز شکلوں میں زمیندار زمین کے علاوہ اس سرمایہ کا بھی ایک حصہ فراہم کرتا ہے جو بیج اور آلاتِ زراعت (کے کرایہ) کی شکل میں لگایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے پیداوار نہ ہونے یا کم ہونے کی صورت میں زمین کے مالک کے نقصان کا پلہ پہلی شکل کے مقابلہ میں بھاری، اور کاشتکار کے نقصان کا پلہ پہلی شکل کے مقابلہ میں ہلکا ہو جاتا ہے۔ جن فقہاء نے مزارعت کی مذکورہ بالا پہلی شکل کو ناجائز قرار دیا ہے اور صرف ایسی شکلوں کو جائز قرار دیا ہے جن میں زمین کا مالک بھی سرمایہ کی فراہمی میں شریک ہوتا ہے۔ ان کی نظر غالباً اس حقیقت پر بھی رہی ہے کہ مزارعت کی یہ شکلیں پہلی شکل کے مقابلہ میں کاشتکار کے حقوق کی زیادہ محافظت کرنے والی اور اس کے مفاد کے زیادہ موافق ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن معاشی تجربہ کی روشنی میں یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ مزارعت کی ان مختلف شکلوں میں مالک اور مزارع کے درمیان ذمہ داریوں کی تقسیم میں فرق کا اثر پیداوار میں شرکت کی ان نسبتوں پر پڑے گا جو وہ باہمی رضامندی سے طے کرتے ہیں۔ ایک ایسی معیشت میں جس میں یہ مختلف شکلیں پہلو بہ پہلو رائج ہوں، ایک ہی معیار کی زرخیز زمینوں پر پہلی شکل میں کاشت کار پیداوار کا نسبتاً زیادہ حصہ وصول کرسکے گا، دوسری اور تیسری شکل میں اس سے کم اور چوتھی شکل میں سب سے کم۔ کاشت کار کے نزدیک نقصان کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی تلافی پیداوار میں بڑھتے ہوئے حصّہ سے ہو جائے گی۔ اگر کاشت کاروں اور زمینداروں کو مزارعت کی ان جائز شکلوں میں سے کسی بھی شکل پر معاہدہ کرنے کی آزادی دے دی جائے تو رفتہ رفتہ رواج کے ذریعہ ان مختلف شکلوں میں حصّوں کی تقسیم کی ایسی نسبتیں طے ہو جائیں گی جو ہر شکل کے اندر ذمہ داریوں کی تقسیم کے مطابق ہوں، اور مختلف افتادِ طبع رکھنے والے اور مختلف درجہ میں وسائل رکھنے والے افراد کے لیے اپنے حسبِ حال شکل کا انتخاب ممکن ہوگا۔

مگر یہ تجزیہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان معاملہ مسابقت تام (PERFECT COMPETITION) کے حالات میں طے پاتا ہے۔ زراعت میں صورتِ واقعہ اکثر اس کے برعکس ہوتی ہے، بالخصوص کم ترقی یافتہ ممالک میں جہاں کاشتکار زیادہ اور زمین کم ہوتی ہے ایسی صورت میں اجتماعی طور پر اس بات کی نگرانی کا اہتمام ضروری ہے کہ مزارعت کے معاہدے عدل و انصاف پر مبنی ہوں اور ان میں کمزور فریق یعنی کاشتکار کے مفاد کی پوری رعایت ملحوظ رکھی جائے۔ ریاست مزارعت کی مختلف شکلوں میں کاشتکار کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے اس کو ملنے والے حصۂ پیداوار کو از روئے قانون متعین بھی کرسکتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس کتاب میں ہمارا منشاء اس موضوع پر مفصل بحث نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ شریعت نے مزارعت کی منصفانہ شکلوں کو جائز رکھا ہے جن میں زمین کے مالک اور کاشتکار دونوں کے مصالح کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، اور اس طرح زمین کے مالک کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی ملکیت کے ذریعہ نفع کمانے کا یہ طریقہ اختیار کرسکے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ج) انتقالِ ملکیّت کا حق

ہر مالک کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی ملکیّت کسی دوسرے کو منتقل کر دے۔ یہ انتقالِ ملکیت کسی دوسری ملکیّت (مثلاً نقد سرمایہ یا جائداد وغیرہ) کے عوض بھی ہو سکتا ہے اور بلا عوض بھی ملکیت کو منتقل کر سکنے کا اختیار حقِ ملکیت کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ حق اس مقصد سے بھی ہم آہنگ ہے جس کے لیے انسانوں کو مالکانہ حقوق عطا کیے گئے ہیں۔ اس حق کے استعمال سے ملکیت کے فوائد مالک سے کسی ایسے فرد یا ادارے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جسے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود مالک کو اس کا معاوضہ، یا اس کے بلا عوض دینے کی شکل میں اس سے حاصل ہونے والا اخروی ثواب یا دوسرے دُنیوی فوائد اس ملکیت سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ حقِ ملکیّت کا منشا ان اغراض کی تکمیل ہے جو زندگی کو قائم رکھنے اور اسے بہتر بنانے کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ منشا انتقالِ ملکیت کے حق کے بغیر نہیں پورا ہو سکتا۔

کسی چیز کی فروخت (بیع) یا ہبہ، یا وصیّت کے ذریعہ اس کو دوسرے کی طرف منتقل کرنے کی شکل میں اصل چیز کی ملکیّت دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس کرایہ پر دینے، عاریت کے طور پر دینے، اور ایک اعتبار سے وقف کی شکل میں اصل چیز کی ملکیت منتقل نہیں ہوتی بلکہ اس چیز کے فوائدِ استعمال دوسرے کی ملک بن جاتے ہیں۔ کرایہ پر دینے اور عاریت کی شکل میں عارضی طور پر، اور وقف میں مستقل طور پر۔ ان شکلوں کو ہم ملکیّت کے جزئی انتقال سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جزئی انتقالِ ملکیّت کو ایسی شرائط کا پابند نہیں بنایا جا سکتا جو منتقل کردہ فوائدِ ملکیت کی نفی کے ہم معنی ہوں، مثلاً مکان کرایہ پہ دیا جائے اور یہ شرط لگادی جائے کہ کرایہ پر لینے والا اس میں نہ رہ سکے گا۔ وغیرہ۔

بلا عوض انتقالِ ملکیّت یعنی ہبہ سے عموماً اہم انسانی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسلام نے کمزوروں کی مدد اور سماجی اغراض کی تکمیل کے لیے ایسا کرنے کی ترغیب دی ہے۔ لیکن یہ حق بسترِ مرگ پر ساقط ہو جاتا ہے[1]۔ کسی انسان کی موت کا قریب آجانا اس کی ملکیّت کی حیثیت میں ایک بنیادی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے، کیونکہ موت کے بعد اس کی ملکیّت اس کی مرضی کے

---

[1] ہدایۃ المجتہد جلد ۲، صفحہ ۳۲۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطابق نہیں بلکہ ضابطہ میراث کے مطابق تقسیم ہوگی۔ لہذا بستر مرگ پر کیے ہوئے ہبہ کو وصیت قرار دے کر اسے ایک تہائی ترکہ پر نافذ کیا جائے گا۔

ہبہ کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ جس شخص کے حق میں ہبہ کیا گیا ہو وہ اسے قبول بھی کرے[۱]۔

وصیت کے ذریعہ مالک اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس کی وفات کے بعد اس کے ترکہ کا ایک حصہ متعین فرد یا افراد کی ملکیت ہو جائے گا۔ وصیت صرف ترکہ کے ایک تہائی حصہ کی حد تک کی جا سکتی ہے۔ بقیہ املاک کی تقسیم ضابطہ میراث کے مطابق عمل میں لائی جائے گی۔ اس تحدید کے مصالح تیسرے باب میں واضح کیے جا چکے ہیں۔ یہ تحدید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک واضح ارشاد سے ثابت ہے اور تمام مکاتب فقہ کے درمیان متفق علیہ ہے :

عن سعد ابن ابی وقاص قال جاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعودنی وانا بمکۃ وھو یکرہ ان یموت بالارض التی ھاجر منھا فقال یرحم اللہ ابن عفراء۔ قلت یا رسول اللہ اوصی بمالی کلہ قال لا قلت فالشطر قال لا قلت فالثلث قال الثلث والثلث کثیر انک ان تدع ورثتک اغنیاء خیرا من ان تدعھم عالۃ یتکففون الناس[۲]......

سعد ابن وقاص سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ انہیں (سعد بن وقاص کو) یہ بات ناپسند تھی کہ وہ اس جگہ وفات پائیں جہاں سے انہوں نے ہجرت کی تھی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اللہ ابن عفراء پر رحم فرمائے۔ میں نے عرض کیا میں اپنے سارے مال کے سلسلہ میں وصیت کر جاؤں؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پھر نصف مال کی حد تک؟ آپ نے فرمایا

---

[۱] : بدایۃ المجتہد، جلد ۲، صفحہ ۳۲۹

[۲] : بخاری : کتاب الوصایا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پھر ایک تہائی مال کی ؟ آپ نے فرمایا ہاں، ایک تہائی کی حد تک، اور ایک تہائی بھی بہت ہے۔ تو اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ جائے یہ بات اس سے بہتر ہے کہ انھیں محتاج چھوڑے کہ وہ لوگوں سے مانگتے پھریں ..."

اسلام نے ایک تہائی ترکہ کی حد تک وصیت کا حق دے کر اہم انسانی مفادات کا تحفظ کیا ہے۔ مثلاً بعض اوقات مالک کا کوئی رشتہ دار دوسرے قریبی ورثاء کے موجود ہونے کے سبب ترکہ میں حق دار نہیں ہوتا، حالانکہ وہ ناداری کے باعث اس کا مستحق ہوتا ہے، یا اس سے تعلق یا کسی اور مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ترکہ میں اسے بھی کچھ حصہ ملے۔ حقِ وصیت کے ذریعہ مالک کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ ایسے رشتہ داروں کے حق میں بھی کچھ مال چھوڑ جائے۔ اسی طرح اس حق سے کسی محسن کے احسان کا بدلہ دینے، کسی کمزور کو سہارا دینے اور رفاہِ عامہ یا دینی امور کے نگران کسی ادارہ کی مدد کرنے کے بھی مواقع ملتے ہیں۔ وصیت کے محرکات زیادہ تر یہی ہیں، اور عملاً ان اغراض کے علاوہ کسی اور غرض کے لیے اس حق کو بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔

اگر کسی فرد کا کوئی وارث نہ ہو تو احناف کے نزدیک وہ اپنے پورے ترکہ پر وصیت کا حق استعمال کر سکتا ہے[۱] ۔ کیونکہ اس حق کی تحدید کا اصل مقصد ورثاء کے حق کا تحفظ ہے۔ لیکن امام مالک اور امام شافعی اس شکل میں بھی تہائی ترکہ سے زیادہ کی وصیت کو درست نہیں سمجھتے کیونکہ "جب کوئی متعین فرد اس کا وارث نہیں تو مسلمانوں کی جماعت اس کی وارث ہوگی، اور اس شخص کو ان لوگوں کا حق کالعدم کرنے کا اختیار نہیں[۲] "

وصیت کا حق ورثاء کے علاوہ دوسروں کو مال منتقل کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ کسی ایسے شخص کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی جو وارث کی حیثیت سے ترکہ کے ایک حصہ کا حق دار ہو۔ وارث کے حق میں وصیت عملاً اس تناسب میں ترمیم کر دیتی ہے جس کے مطابق مال کو شرعاً تقسیم ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وارث کے حق میں وصیت کی ممانعت

---

[۱] : بدائع الصنائع جلد ۴ صفحہ ۱۷۰، بدایۃ المجتہد جلد ۲ صفحہ ۳۳۶

[۲] : بدائع الصنائع۔ جلد ۴۔ صفحہ ۱۷۰

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے وقت اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے :

عن شرجیل بن مسلم قال سمعت ابا امامۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول "ان اللہ قد اعطی کل ذی حق حقہ ، فلا وصیۃ لوارث[1] "

شرجیل بن مسلم سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا : میں نے ابو امامہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "اللہ نے ہر حق دار کے لیے اس کا حق مقرر کر دیا ہے لہٰذا کسی وارث کے حق میں وصیت نہ کی جائے۔"

جمہور فقہاء کے نزدیک اگر تمام ورثاء اس پر رضامندی کا اظہار کریں تو کسی وارث کے حق میں بھی وصیت کی جاسکتی ہے۔ ان کے نزدیک ایک وارث کے حق میں وصیت سے ممانعت کا مقصد دوسرے ورثاء کے حق کا تحفظ ہے۔ اگر وہ بخوشی رضامندی اپنے حق کے ایک حصہ سے دوسرے وارث کے حق دستبردار ہونے کو تیار ہوں تو اس کی ممانعت کی کوئی وجہ نہیں باقی رہتی۔[2]

انتقالِ ملکیت کا حق وہی مالک استعمال کر سکتا ہے جو شریعت کی نگاہ میں اس کا اہل ہو۔ اہلیت کی اوّلین شرط "رشد" یعنی سمجھ دار ہونا ہے۔ بے عقل یا پاگل آدمی کو اپنے املاک پر حقِ انتقال نہیں حاصل ہوتا[3]۔ نابالغ بچوں کو بھی بطورِ خود انتقالِ ملکیت کا اختیار نہیں[4]۔ اہلیت کی ایک عام شرط یہ بھی ہے کہ مالک پر کسی دوسری وجہ سے عارضی طور پر قانونی پابندیاں نہ عائد کی جاچکی ہوں۔ مالک کے مقروض ہونے متعلقہ ملکیت کے رہن ہونے اور ملکیت کے استعمال میں مسلسل سوءِ تدبیر اور اسراف و تبذیر کے مظاہرہ کی صورتوں میں مالک پر ایسی قانونی پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں جو اسے انتقالِ ملکیت سے روک دیں[5]

---

[1] : ابوداؤد : کتاب الوصایا ، باب ما جاء فی الوصیۃ لوارث ۔

[2] : بدایۃ المجتہد ، جلد ۲ ، صفحہ ۳۴۳

[3] : بدایۃ المجتہد ، جلد ۲ ، کتاب الحجر ، بدائع الصنائع جلد ۷ ، کتاب الحجر ، اور الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۲ ، مباحث الحجر ۔

[4] : ایضاً

[5] اسراف و تبذیر اور سوءِ تدبیر کی بنیاد پر حجر کے مسئلہ پر تفصیلی بحث بارھویں باب میں کی گئی ہے ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(د) حقِ تحفظ

ہر مالک کو اپنی املاک کی حفاظت کرنے اور دوسروں کو ان پر دست اندازی سے روکنے کا حق حاصل ہے۔ یہ حق ملکیت کے حق کے اوّلین لوازم میں سے ہے۔ حقِ ملکیت کو مؤثر اور حقیقی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مالک کو اس بات کا اختیار حاصل ہو کہ وہ دوسرے افراد کو بغیر کسی حق کے اس میں مداخلت کرنے سے روک سکے۔ البتہ جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے، اس حق کا استعمال اس حد تک مناسب ہے جس حد تک اپنی ملک سے خود استفادہ کرتے رہنے کے لیے ضروری ہو۔ صرف مالکانہ ذہنیت، خود غرضی اور مردم بیزاری یا مردم آزاری کے جذبہ کے تحت ایسا کرنا ایک غیر معقول بات ہے۔

ملکیت کے جن اہم مقاصد کا مطالعہ ہم نے پہلے باب میں کیا ہے ان کے پیش نظر یہ بات چنداں قابلِ تعجب نہیں ہونی چاہیے کہ اسلام نے مالک کے حقِ تحفظ کو واضح الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس حق کے استعمال کو بعض حالات میں ضروری قرار دیا گیا ہے، تاکہ وہ اہم مقاصد اور مصالح ضائع نہ ہو جائیں جو ملکیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اپنی ملکیت کی حفاظت کے لیے انسان اپنی جان تک دے سکتا ہے، جو خود اللہ کی ایک مقدس امانت ہے۔ اپنی ملکیت کی حفاظت میں مارا جانے والا شہادت کا درجہ پاتا ہے:

عن عبد اللہ بن عمرو قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: "من قتل دون مالہ فھو شھید"[ا]

عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے۔"

عن ابی ھریرۃ قال جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ ارأیت ان جاء رجل یرید اخذ مالی قال فلا

[ا] بخاری: ابواب المظالم والقصاص۔ باب من قتل دون مالہ، مسلم: کتاب الایمان

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعطه مالک قال ارأیت ان قاتلنی قال قاتله - قال ارأیت ان قتلنی قال فانت شهید قال ارأیت ان قتلته ، قال هو فی النار۔[1]

ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول آپ کی کیا رائے ہے اگر میرے پاس کوئی آدمی میرا مال چھیننے کے ارادہ سے آئے ؟ آپؐ نے فرمایا: تو تم اس کو اپنا مال نہ دو۔ اس نے کہا اگر وہ مجھ سے لڑائی کرے تو آپؐ کا کیا خیال ہے ؟ آپؐ نے فرمایا تم بھی اس سے لڑائی کرو۔ اس نے کہا: اگر وہ مجھے قتل کر دے تو ؟ آپؐ نے فرمایا تو تم شہید ہو گے۔ اس نے کہا کہ اگر میں اس کو قتل کر دوں تو آپ کی کیا رائے ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گا۔"

جب کسی ملک سے دوسرے کا حق بھی متعلق ہو تو اس کا تحفظ صرف ایک حق نہیں بلکہ ذمہ داری بھی ہے "جو شخص کسی چیز کے فوائد استعمال کا مالک ہو اس پر خود اس چیز کی حفاظت واجب ہے جس سے وہ انتفاع کر رہا ہو"[2] یہ صورت عاریتہً لی ہوئی چیز اور کرایہ پر لیے ہوئے سامان یا مکان کے سلسلہ میں پیش آتی ہے۔

نیز "مال کی مدافعت واجب ہے جبکہ وہ ذی روح ہو، یعنی جمادات سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ یا مدافعت کرنے والے کے ہاتھ میں اصلاً دوسرے کا مال ہو۔ مثلاً کسی محجور علیہ کا مال بطور وقف یا امانتاً دیا ہوا سامان۔ یا اسی شخص کی ملکیت ہو لیکن اس سے دوسروں کا حق بھی وابستہ ہو۔ جیسے رہن رکھی ہوئی یا کرایہ پر لی ہوئی چیز۔"[3]

مال کو جمع کرنے کا حق:

بعض غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ بات بھی واضح

---

[1] : مسلم: کتاب الایمان۔ باب الدلیل علی من قصد اخذ مال غیرہ بغیر حق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

[2] : محمد قدری پاشا: مرشد الحیران دفعہ ۱۰۸ - بولاق، مصر ۱۸۹۱ء

[3] : عبد القادر عودہ: التشریع الجنائی الاسلامی۔ صفحہ ۴۷۵

دار نشر الثقافۃ، اسکندریہ۔ ۱۹۴۹ء بحوالہ: اسنی المطالب جلد ۴ صفحہ ۱۶۸

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دی جائے کہ جس طرح مالک کو اپنے مال کی حفاظت کرنے کا اختیار ہے اسی طرح اسے اپنے مال کو جمع کر رکھنے کا بھی اختیار ہے۔ بعض لوگ نقد سرمایہ کی بڑی مقداریں جمع کر رکھنے کو ہر صورت میں اسلام کے منشا کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنا اسی صورت میں ناپسندیدہ ہے جب اس کا باعث محض بخل ہو۔ اپنی اور اپنے متعلقین کی آئندہ ضروریات کے لیے، دوسرے اچھے مقاصد کے لیے، اور اپنے ورثا کے لیے ترکہ چھوڑ جانے کی غرض سے مال جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں، خواہ اسے غیر منقولہ جائدادوں کی شکل میں جمع کیا جائے یا نقد سرمایہ کی شکل میں۔

اوپر ہم امام بخاری کی روایت کردہ حدیث نقل کر چکے ہیں جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کا اعلان کیا ہے کہ اپنے اہل وعیال کے لیے مال چھوڑ کر مرنا اس سے بہتر ہے کہ آدمی ان کو مفلس اور بے سہارا چھوڑ کر مرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ورثا کے لیے ترکہ چھوڑ جانا ایک اچھی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بات کو مقصد بنا کر مال جمع کرنا بُرا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اپنی اور اپنے متعلقین کی آئندہ ضروریات کے لیے بھی مال جمع کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ذیل کے آثار سے معلوم ہوتا ہے:

عن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یبیع نخل بنی النضیر ویحبس لاھلہ قوت سنتھم۔[1]

عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے کھجور کے درختوں (کے پھل) کو فروخت کر کے اپنے گھر والوں کے لیے سال بھر کی خوراک محفوظ کر لیتے تھے۔

قال کعب ابن مالک قلت یا رسول اللہ ان من توبتی ان انخلع من مالی صدقۃ الی اللہ ورسولہ قال امسک علیک بعض مالک فھو خیر لک، قلت فانی امسک سھمی الذی بخیبر۔[2]

کعب ابن مالک کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میں نے توبہ کرتے

---

[1] بخاری: کتاب النفقات۔ باب حبس الرجل قوت سنۃ علی اہلہ ......

[2] بخاری: کتاب الزکوٰۃ۔ باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنی.......

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وقت یہ بھی طے کیا ہے کہ میں اپنے (سارے) مال سے اللہ اور اس کے رسول کے لیے صدقہ کے طور پر دستبردار ہو جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اپنے مال کا ایک حصہ اپنے پاس روک لو کیونکہ یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔ میں نے کہا کہ مجھے خیبر میں جو حصہ ملا ہے اسے میں روک لیتا ہوں۔

عن جابرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امسکوا علیکم اموالکم ولا تفسدوھا فانہ من اعمر عمریٰ فھی للذی اعمر حیًّا ومیتًا ولعقبہٖ[۵]۔

جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اپنے مال اپنے پاس رکھو، ان کو برباد نہ کرو۔ آگاہ کہ جس نے "تا مدتِ عمر" عطا کیا وہ چیز اس شخص کی ملکیت ہو گئی جسے وہ اس طور پر دی گئی ہے، زندگی میں بھی اور مرنے پر بھی، اور اس شخص کے بعد وہ اس کے ورثا کا حق ہو جائے گا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ایک عارضی قیام گاہ ہونے کے صحیح تصوّر کے تحت بعض افراد میں مال جمع کرنے کے خلاف انتہا پسندانہ رجحانات پیدا ہو گئے تھے تو ان کو اعتدال کی تلقین کی گئی۔

ہم سے ابو نعیم نے حدیث بیان کی ہے کہ ہم سے حنش بن الحارث نے اپنے والد کے واسطہ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ ہم میں سے بعض کا حال یہ تھا کہ اس کی گھوڑی بچہ دیتی تھی تو وہ اس بچہ کو ذبح کر دیتا تھا اور کہتا تھا کہ بھلا کیا میں اتنے عرصہ زندہ رہوں گا کہ (یہ بچہ بڑا ہو اور میں) اس پر سواری کروں؟ تو ہمارے پاس حضرت عمرؓ کا خط آیا کہ اللہ نے تمہیں جو کچھ عطا کیا ہوا ہے اسے سنبھال کر رکھو کیونکہ (زندگی کا) یہ معاملہ کافی (مدت کی) گنجائش رکھتا ہے[۶]۔

---

[۵]: مسلم: کتاب الہبات۔ باب العُمریٰ۔

[۶] بخاری: الادب المفرد صفحہ ۶۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رفقاء کے طرز عمل سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے کہ ان میں سے جو مال دار تھے وہ نیک کاموں پر خوب خرچ بھی کرتے تھے اور فاضل مال کو جمع بھی کرتے تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ نے مختلف مواقع پر ضرورت مندوں کی امداد، جہاد فی سبیل اللہ، اور قحط کی مصیبت میں عام امداد کے لیے بہت زیادہ مال صدقہ کیا ہے۔ جس کی بنا پر امت آپ کو "عثمان غنی" کے نام سے یاد کرتی ہے۔ لیکن اپنی وفات پر آپ نے بہت زیادہ مال چھوڑا تھا، جو بغیر جمع کیے ممکن نہ ہوتا۔[۵۱] اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف[۵۲] اور حضرت عبداللہ ابن زبیر[۵۳] وغیرہ نے بھی اپنی وفات پر بہت زیادہ مال چھوڑا تھا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ناقص ملکیت:

اوپر ملکیت کے جن حقوق کا مطالعہ کیا گیا ہے ملکیتِ تام یا مکمل حقِ ملکیت سے وابستہ ہیں۔ ناقص ملکیت سے مراد ایسی ملکیت ہے جس میں مالک کو اصل شے کی ملکیت حاصل ہو لیکن اس کے فوائدِ استعمال کی ملکیت نہ حاصل ہو ——— یا ——— فوائدِ استعمال کی ملکیت حاصل ہو لیکن اصل شے کی ملکیت نہ حاصل ہو۔

ناقص ملکیت بالعموم جزوی انتقالِ ملکیت سے پیدا ہوتی ہے جس کی مختلف شکلوں کا جائزہ اوپر لیا جا چکا ہے، یعنی اجارہ، عاریت اور صرف فوائدِ استعمال یا صرف اصل شے کا ہبہ۔ ان تمام صورتوں میں دو ناقص ملکیتیں وجود میں آ جاتی ہیں۔

وقف بھی ناقص ملکیت کی ایک شکل ہے۔ لیکن اس میں اصل شے کا مالک کوئی متعین فرد یا افراد نہیں ہوتے۔ فوائدِ استعمال اس شخص کو حاصل ہوتے ہیں جس کے حق میں وقف کیا گیا ہو۔ اگر اس شخص کو وقف کرنے والے نے صرف فائدہ اٹھانے (انتفاع) کا حق دیا ہو۔ ان فوائد

---

۵۱ : ابنِ کثیر: البدایہ والنہایہ۔ جلد ۷۔ صفحہ ۱۸۹ (۳۵ھ)

۵۲ : ابنِ کثیر: بحوالۂ بالا صفحہ ۱۶۳ (۳۲ھ)

۵۳ : ابنِ کثیر: بحوالۂ بالا صفحہ ۱۹۸ (۳۶ھ)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استعمال (منفعت) کا مالک نہ بنایا ہو تو وہ ان فوائدِ استعمال کو دوسروں کی طرف نہیں منتقل کر سکتا[51]

وصیت کے ذریعہ بھی ناقص ملکیت وجود میں آسکتی ہے۔ ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب مرنے والے نے اصل وصیت کے ذریعہ اصل شے کسی فرد کو منتقل کی ہو اور اس کے فوائدِ استعمال، یا اس سے حقِ انتفاع، دوسرے فرد کو منتقل کیا ہو[52]۔

ناقص ملکیت رکھنے والے کا حقِ استعمال و تصرف اس کی ملکیت کی نوعیت کے لحاظ سے محدود ہوتا ہے۔ فوائدِ استعمال کا مالک، یا حقِ انتفاع رکھنے والا، وہ تمام تصرفات کر سکتا ہے جس کا اصل چیز پر کوئی مضر اثر نہ پڑے۔ صرف اصل شے کا مالک حقِ استعمال سے محروم ہوتا ہے، اور اپنی ملکیت میں کوئی ایسا تصرف نہیں کر سکتا جو فوائدِ استعمال کے مالک کو ان فوائد سے محروم کر دے۔

اس کا حقِ انتقالِ ملکیت اسی جزو تک محدود ہوتا ہے جس کا وہ مالک ہو، اور اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب اس سے دوسرے جزو کے مالک کا نقصان نہ ہوتا ہو۔ اس اجمال کی تفصیل فقہ کی کتابوں سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ ذیل میں ہم صرف مثال کے طور پر چند شکلوں کا ذکر کریں گے۔

مکان کا مالک، جو اسے کسی دوسرے فرد کو ایک متعینہ مدت کے لیے کرایہ پر دے چکا ہے، اپنے مکان کو فروخت کر سکتا ہے، یا اس کا ہبہ کر سکتا ہے، لیکن اس مدت کے اندر کسی دوسرے فرد کو کرایہ پر یا عاریتاً نہیں دے سکتا[53]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مدت کے اندر وہ مکان کا مالک ہے لیکن اس کے فوائدِ استعمال کا مالک نہیں ہے۔

کرایہ دار اس مکان کو کسی دوسرے آدمی کو کرایہ پر یا عاریتاً دے سکتا ہے۔ لیکن خود

---

[51]: منفعت کی ملکیت اور حقِ انتفاع کے درمیان فرق سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو:
قرافی: الفروق۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۸۷ (فرق نمبر ۳۰)

[52]: قدری پاشا: مرشد الحیران۔ دفعہ ۱۸

[53]: بدائع الصنائع۔ جلد ۴۔ صفحہ ۱۸۲

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مکان کو فروخت نہیں کر سکتا[۱۵] - کیونکہ وہ اس مکان کے فوائدِ استعمال کا مالک ہے، مکان کا مالک نہیں ہے -

جس شخص نے کوئی چیز عاریت کے طور پر حاصل کی ہو وہ اس چیز کو عاریت کے طور پر دوسرے شخص کو دے سکتا ہے - وہ اسے نہ فروخت کر سکتا ہے نہ کرایہ پر دے سکتا ہے[۱۶]

ناقص ملکیت رکھنے والے کے حقِ انتقالِ ملکیت کے یہ حدودِ ملکیت کے نفع اور استعمال کے حق کو بھی محدود بنا دیتے ہیں - کیونکہ اس حق کا استعمال انتقالِ ملکیت کا محتاج ہے - یہ بات اوپر کی مثالوں سے بھی واضح ہے -

جہاں تک ملکیت کے تحفظ کے حق کا تعلق ہے وہ ہر طرح کے مالکوں کو حاصل ہے - اصل چیز کا مالک اور فوائدِ استعمال کا مالک، دونوں اصل چیز کی محافظت کا حق رکھتے ہیں، اور کسی تیسرے فرد کو اس پر دست اندازی سے روک سکتے ہیں - جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، فوائدِ استعمال کے مالک کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصل چیز کی حفاظت کی معروف کے مطابق پوری کوشش کرے - اگر وہ اس میں کوتاہی کرے گا تو اسے اصل چیز کو پہنچنے والے نقصانات کا ذمہ دار (ضامن) قرار دیا جا سکتا ہے -

---

۱۵ : بدائع الصنائع، جلد ۴ - صفحہ ۱۸۲، قرائی بحوالۂ بالا - صفحہ ۱۸۷

۱۶ ایضاً صفحہ ۲۱۵، مرشد الحیران دفعہ ۳۰

آخر کی دو مثالیں اس مفروضہ کے تحت دی گئی ہیں کہ کرایہ پر دینے والے یا عاریتاً دینے والے شخص نے لینے والے سے کوئی ایسی شرط نہیں طے کر لی ہے جو مؤخر الذکر کے محدود حق انتقال میں مانع ہو، اگر کسی جگہ کا عرفِ عام یہ ہو کہ کرایہ یا عاریت کے ہر معاہدہ میں اس طرح کی کوئی شرط مسمجھی جائے گی تو اس کا اثر بھی وہی ہو گا جو باقاعدہ شرط کا ہوتا -

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پانچواں باب

انفرادی حقوقِ ملکیت کے حدود

مالکانہ حقوق کے قدرے تفصیلی مطالعہ کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام نے ان حقوق کے استعمال کو کن حدود کا پابند بنایا ہے۔ جیسا کہ ان حدود کے مطالعہ سے واضح ہوگا ان کا منشاء خود مالک کے حقیقی مفادات اور پھر پورے سماج کے مفادات کا تحفظ ہے۔ اگر حقوقِ ملکیت پر یہ حدود نہ عائد کیے جاتے تو اندیشہ تھا کہ یہ حقوق اپنے اصل مقاصد سے ہٹ کر دوسرے مقاصد کے لیے استعمال ہونے لگتے۔ یہی حدود اس بات کی بھی ضمانت دے سکتے ہیں کہ ایک مالک اپنی ملکیت کو اس طرح نہیں استعمال کرے گا کہ وہ دوسرے افراد کے لیے مضرت کا باعث بن جائے۔ اصولی اعتبار سے یہ حدود حقِ ملکیت کی نیابتی اور آزمائشی نوعیت سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ انفرادی ملکیت چونکہ بندہ کے ہاتھ میں آقا کا بطورِ امانت دیا ہوا مال ہے۔ لہٰذا بندگی کا تقاضا ہے کہ اسے ان حدود کے اندر استعمال کیا جائے جو اصل مالک نے مقرر کر دی ہیں۔ انسان دنیا کی زندگی میں اپنی آزمائش سے پوری طرح اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب وہ ان حدود کی پوری پوری پابندی کر دکھائے۔

یہاں صرف ان اصولی حدود کے مطالعہ پر اکتفا کیا گیا ہے جو قرآن و سنت میں صراحت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ مذکور ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انفرادی ملکیت پر شریعتِ اسلامی صرف یہی حدود عائد کرتی ہے۔ حقوقِ ملکیت اور ان کا استعمال انسانی زندگی کے ان مسائل میں سے ہے جن کی تفصیلات وقت، مقام اور حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ قرآن و سنت نے اس طرح کے تمام مسائل میں صرف اصولی رہنمائی پر اکتفا کیا ہے۔ ان مسائل میں تفصیلی ضابطہ بندی ہر دَور کی اسلامی ریاست کا کام ہے۔ البتہ جیسا کہ پہلے باب میں واضح کیا جا چکا ہے۔ یہ ضابطہ بندی انہی خطوط پر ہونی چاہیے جو اسلام نے تفصیلی قانون سازی کے لیے متعین کر دیے ہیں جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے، اجماع اور قیاس کے علاوہ استحسان اور استصلاح (مصالح مرسلہ) کے تحت کی جانے والی قانون سازی بھی شرعی حیثیت رکھتی ہے۔ شریعتِ اسلامی قرآن و سنت کے منصوص احکام اور مذکورہ بالا دینی مآخذ سے مستنبط کیے ہوئے قوانین، دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہاں ہم اس بات پر اس لیے زور دے رہے ہیں تاکہ آئندہ ایسی تفصیلات کا مطالعہ ان کی اصولی اور بنیادی حیثیت کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔ اور یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حقوقِ ملکیت کی تحدید کے سلسلہ میں صرف یہی قوانین دیے گئے ہیں اور بس۔ ہمیں ان اصولوں کی روشنی میں اُس مزاج کو پہچاننے کی کوشش کرنی چاہیے جو حقِ ملکیت کی تحدید کے سلسلہ میں قرآن و سنت ہمیں دیتے ہیں۔ بعض ایسے حدود بھی سامنے آئیں گے جو قانون سازی کے دائرہ سے بڑی حد تک باہر ہیں، جن کا نفاذ بیشتر افراد کے ضمیر اور سماج کے اخلاقی شعور پر منحصر ہے۔ یقیناً اس افراد کی ذمہ داری ہے کہ اسلام کی ان ہدایات کی وقت اور سماجی حالات کی مناسبت سے مذکورہ بالا مزاج کی روشنی میں مناسب تعبیر کریں اور اس کے تقاضے پورے کریں۔

(الف) حقِ استعمال و تصرّف کے حُدود

حقِ استعمال و تصرف کو اسلام نے جن حدود کا پابند قرار دیا ہے ان کو اس طرح گنایا جا سکتا ہے:۔

۱۔ مال کو ضائع کرنے کی ممانعت۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔غیر شرعی مصارف پر مال صرف کرنے کی ممانعت۔
۳۔اسراف اور بے اعتدالی کی ممانعت۔
۴۔عیش کوشی اور تنعّم کی ممانعت۔
۵۔ملکیت کے ایسے استعمال کی ممانعت جو دوسروں کے لیے مضرّت رساں ہو۔
۶۔ذی روح املاک کے استعمال میں ان کی قوتِ برداشت کا لحاظ اور ان کے حقوق کی ادائیگی۔

۱۔مال کو ضائع کرنے کی ممانعت:

اسلامی تصوّرِ ملکیت کا اوّلین تقاضا ہے کہ فرد کو اپنی ملکیت کے ضائع کرنے کا اختیار نہ دیا جائے۔ملکیت مالکِ حقیقی کی امانت ہے، اور امین کو امانت کے ضائع کر دینے کا حق نہیں۔

پھر انسان کو حقِ ملکیت دینے کا منشا یہ ہے کہ وہ اسے اپنے مقاصدِ حیات کے حصول کا ذریعہ بنائے۔اضاعتِ مال اس منشار کے منافی ہے، لہٰذا پروردگارِ عالم نے انسان کو ایسا کرنے کا حق نہیں دیا ہے۔

قرآن کریم نے مال تلف کرنے کو فساد سے تعبیر کیا ہے، اور فساد پیدا کرنے کو حرام قرار دیا ہے:

وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ،
وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۔ (البقرہ:۲۰۵)

اور جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین میں اس لیے دوڑ دھوپ کرتا پھرتا ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسلِ انسانی کو تباہ کرے ــــ حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا۔ (الاعراف:۸۵)

اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صراحت فرمادی ہے کہ مال کو ضائع کرنا ممنوع ہے :

قال، وکان ینھی عن قیل وقال، وکثرۃ السوال واضاعۃ المال ومنع وھات، وعقوق الامھات ووأد البنات[۱]

(راوی) نے کہا کہ آپؐ قیل وقال کرنے، بہت زیادہ سوالات دریافت کرنے،[۲] مال کو ضائع کرنے، خود نہ دینے اور دوسروں سے مانگنے، ماں کی نافرمانی کرنے، اور بچیوں کو زندہ دفن کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔

سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان اللہ کرہ لکم ثلاثا: قیل وقال، واضاعۃ المال، وکثرۃ السوال[۳]

(مغیرہ بن شعبہ نے کہا) میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ "اللہ نے تمہارے لیے تین چیزوں کو ناپسند فرمایا ہے: قیل وقال کرنا، مال ضائع کرنا اور کثرت سے سوال کرنا۔

بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ یہی روایت مؤطا امام مالک اور مسند دارمی میں بھی آئی ہے۔ صحیح مسلم میں یہی مضمون ایک دوسری مفصل حدیث میں بھی آیا ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں[۴]

"اضاعتِ مال سے مراد مال کو غیر شرعی طور پر صرف کرنا اور تلف بے جا کے حوالے کرنا ہے۔ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ (معاشرہ میں) بگاڑ پیدا کرنے کے ہم معنیٰ ہے اور اللہ فساد پیدا کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ جب کوئی شخص اپنا

---

[۱] : بخاری: کتاب الرقاق، عن المغیرہ، اور بخاری: الادب المفرد۔ صفحہ ۵۴

[۲] : کثرۃ السوال کے معنے "زیادہ مانگنے" یعنی مال مانگنے کے بھی ہوسکتے ہیں۔ بعض شارحین نے یہ معنی بھی لیے ہیں، اور دونوں صحیح ہیں۔ ملاحظہ ہو ابن حجر عسقلانی: فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۲ - ۲۶۳ - مطبع امیریہ۔ بولاق ۱۳۰۱ھ

[۳] : بخاری: کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ تعالیٰ لا یسئلون الناس الحافاً ... عن مغیرہ بن شعبہ۔ مسلم: کتاب الاقضیہ

[۴] : نووی: شرح مسلم، کتاب الاقضیہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مال ضائع کر دے گا تو کسی دوسرے کے مال پر قبضہ کرنے کی فکر میں لگ جائے گا۔"

امام نووی کی اس تشریح سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ قرآن کریم میں فساد (بگاڑ) پیدا کرنے کی جو ممانعت آئی ہے اس میں تلفِ مال کی ممانعت خود بخود شامل ہے۔ کیونکہ تلفِ مال فساد پیدا کرنے کی ایک شکل ہے۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مال و املاک انسانی زندگی کا سہارا ہیں۔ اس سہارے کو غلط طریقہ سے ضائع کرنا پوری انسانیت کی حق تلفی اور اس پر ظلم کے مترادف ہے۔ مفید اشیاء کی تباہی انسانیت کا مشترکہ نقصان ہے۔ اسی وجہ سے حالتِ جنگ میں بھی تلفِ مال سے حتی الامکان پرہیز کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب شام کی طرف فوجیں روانہ کیں تو ان کے سپہ سالار یزید بن ابی سفیان کو ہدایت فرمائی کہ[1]:

انی موصیک بعشر: لا تقتلن امرأة و لا صبیا و لا کبیرا هرما، و لا تقطعن شجرا مثمرا و لا تخربن عامرا و لا تعقرن شاة و لا بعیرا الا لمأکلة و لا تحرقن نحلا و لا تغرقنه، و لا تغلل و لا تجبن۔

میں تمہیں دس باتوں کی تلقین کرتا ہوں۔ کسی عورت، بچے یا بہت بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کسی پھلدار درخت کو نہ کاٹنا، کسی آباد زمین کو ویران نہ کرنا، کسی بکری یا اونٹ کو بجز غذائی ضروریات کے ذبح نہ کرنا، شہد کی مکھیوں کو نہ جلانا۔ اور نہ انہیں منتشر کرنا۔ مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرنا اور بزدلی نہ دکھانا۔

البتہ حالتِ جنگ میں اگر دشمن کی طاقت توڑنے کیلئے مال تلف کرنا ناگزیر ہو جائے تو اس کی اجازت دی گئی ہے، جیسا کہ سورۂ حشر سے صراحتہً معلوم ہوتا ہے[2]۔

اسلام میں تلفِ مال کی ممانعت ایک ثابت شدہ اصول ہے۔ اس کے بدلے بل

---

[1]: مؤطا امام مالکؒ: کتاب الخلافہ۔ باب النہی عن الغلول والغدر۔۔۔۔۔۔ (نسخ مطبوعہ دار احیاء الکتب العربی۔ ۱۹۵۱ء) جلد ۲ صفحہ ۴۴۸۔ تصحیح فواد عبدالباقی۔ مؤطا کے بعض دوسرے نسخوں میں روایت کے بعض الفاظ مختلف ہیں۔ [2]: نیز ملاحظہ ہو بخاری: کتاب الجہاد۔ باب حرق الدور والنخیل۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملکیت کا مطلق تصور حقِ ملکیت پر اس طرح کی قیود سے ناآشنا ہے۔ مطلق تصورِ ملکیت کا تقاضا ہے کہ فرد کے لیے اپنے مال کو ضائع کر دینے کا حق بھی تسلیم کیا جائے۔ مشہور مغربی عالم قانون، جان آسٹن لکھتا ہے:

"غیر منقول املاک یا مویشی وغیرہ میں مطلق ملکیت کی رو سے اپنی ملکیت کے تباہ کرنے یا ضائع کر دینے کا حق حاصل ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس تباہی میں کسی دوسرے فرد پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے[1]۔"

"اگر میں اپنے مکان کا مالک ہوں تو میں چاہوں تو اسے تباہ کر سکتا ہوں مگر مجھے اس کو اس طرح ہرگز تباہ نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے میرے پڑوسیوں کو نقصان پہنچے[2]۔"

بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ یہ بحث سراسر لاطائل ہے کیونکہ جب تک کسی کا دماغ نہ خراب ہو جائے وہ اپنی ملکیت کو ضائع نہیں کر سکتا۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں، اور سرمایہ دارانہ ممالک میں اموالِ تجارت یا صنعتی اور زرعی پیداوار کو ضائع کر دینا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ جب کاروباری یہ دیکھتا ہے کہ مال کے ایک حصّہ کو تلف کر دینے سے بقیہ مال کی قیمت چڑھ جائے گی اور مجموعی نفع میں اضافہ ہو جائے گا تو اس کی خودغرضی اسے مال کو تلف کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ یہ بات تھوڑی سی وضاحت سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایسے حالات کا پیش آنا عین ممکن ہے۔ آزاد معیشت میں اشیاء کی قیمتوں کا انحصار رسد و طلب کے توازن پر ہوتا ہے۔ کسی مخصوص قیمت پر ایک چیز کی ایک مقدار طلب کی جاتی ہے، اس سے زیادہ قیمت پر اس سے کم مقدار اور کم تر قیمت پر زیادہ مقدار طلب کی جاتی ہے۔ فرض کیجیے کہ آج ایک خاص نرخ پر ایک چیز کی ایک خاص مقدار طلب کی جا رہی ہے۔ اب اگر اس شے کی رسد میں اضافہ ہو جائے تو یہ اضافہ شدہ مقدار اسی وقت فروخت ہو سکے گی جبکہ نرخ کچھ کم کر دیا جائے۔ جوں جوں رسد بڑھے گی نرخ گرتا جائے گا کیونکہ حالاتِ طلب برقرار ہیں۔ اگر کاروباری لوگ قیمت کم نہ کریں تو اس کے نتیجہ میں مال کا ایک حصّہ فروخت ہونے سے رہ

[1]: JOHN AUSTIN: LECTURES ON JURISPRUDENCE VOL II, P. 795.

[2]: IBID; P. 798.

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے گا۔ آزاد معیشت میں یہ صورتِ حال عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔ جن تاجروں کا مال نہیں فروخت ہو رہا ہے وہ نرخ کم کر کے اسے فروخت کرنے کی کوشش کریں گے اور بالآخر بڑھتی ہوئی رسد کا اثر قیمت میں کمی کی شکل میں ظاہر ہو گا۔

کاروباری فرد کا منافع قیمت اور لاگت کے درمیانی فرق کا نام ہے۔ اسی لیے جب تک مال کی لاگت میں بھی اسی تناسب سے، بلکہ اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی رہے جس تناسب سے کہ قیمت کم ہو رہی ہے تب تک کاروباری فرد کو قیمت کا گرنا سخت ناپسند ہوتا ہے۔ اس وجہ سے قطع نظر، نرخ کا گرنا کاروباری افراد کو اس لیے بھی ناپسند ہوتا ہے کہ بازار کا نرخ جتنی آسانی سے گر سکتا ہے اتنی آسانی سے دوبارہ اپنی پرانی سطح پر نہیں لایا جا سکتا۔

اب فرض کیجیے کہ کسی شے کی رسد غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے، مگر اس کے حالاتِ طلب برقرار رہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں قیمت بھی غیر معمولی طور پر کم ہو جائے گی۔ عام طور پر لاگت میں غیر معمولی کمی کا امکان کم ہوتا ہے، لہٰذا کاروباری لوگوں کا منافع گھٹے گا۔ عین ممکن ہے کہ اس شے کی کم مقدار کو اونچے داموں فروخت کرنے سے کاروباریوں کا مجموعی نفع کم داموں پر زیادہ مقدار فروخت کرنے کی شکل کے بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ گیہوں کی پیدائش کی لاگت سولہ روپے فی من ہے تو کاروباریوں کو:

۲۰ روپے فی من پر ۱۲ ہزار من گیہوں فروخت کرنے میں ۴۸ ہزار روپے کا نفع ہو گا۔

مگر ۱۷ روپے فی من پر ۱۴ ہزار من گیہوں فروخت کرنے میں ۱۴ ہزار روپے کا نفع ہو گا۔

اور ۱۶ روپے فی من پر ۱۵ ہزار من گیہوں فروخت کرنے میں کوئی نفع نہیں ہو گا۔

مذکورہ بالا مثال میں پہلے نرخ پر ہونے والا نفع پیداوار اور اس کی رسد میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ رسد میں اضافہ کے نتیجہ میں نرخ گر جاتا ہے اور نفع کم ہو جاتا ہے، پھر رسد میں مزید اضافہ سے نفع بالکل غائب ہو جاتا ہے، جیسا کہ تیسری شکل سے ظاہر ہے۔ اب اگر دوسری شکل میں کاروباری افراد دو ہزار من گیہوں ضائع کر دیں تو رسد ۱۴ ہزار من سے کم ہو کر ۱۲ ہزار من رہ جائے گی اور نرخ ۱۷ روپے فی من سے پھر ۲۰ روپے فی من ہو جائے گا۔ ۳۲ ہزار روپے کی لاگت کا گیہوں ضائع کر دینے کے باوجود مجموعی نفع ۱۶ ہزار روپے ہو گا جو دوسری

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شکل میں ہونے والے نفع سے زیادہ ہے۔[1]

عام طور پر مال ضائع کرنے کی نوبت نہیں آتی کیونکہ رسد کا فاضل حصہ آئندہ کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے، یا بیرونی ممالک میں سستے داموں کھپا دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اشیاء اس قابل نہیں ہوتیں کہ انہیں زیادہ عرصہ محفوظ رکھا جا سکے۔ مثلاً پھل، ترکاری وغیرہ۔ اور بعض اشیا کا ذخیرہ رکھنے میں اتنے زیادہ اخراجات ہوتے ہیں کہ ان کو گوارا کرنا نفع بخش نہیں ہوتا۔ زیادہ تر انہی اشیاء کے ساتھ پیداوار میں یکایک کثیر اضافہ کی صورت پیش آتی ہے۔ ایسے حالات میں پیداوار کے ایک حصہ کو تلف کر دینا کاروباری اغراض کے لیے زیادہ نفع بخش ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر دی ہوئی مثال سے ظاہر ہے۔

سرمایہ دار ممالک میں مفید اشیاء کی بڑی مقداروں کے مذکورہ بالا محرک کے تحت تلف کر دیے جانے کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ برازیل میں کافی (قہوہ) کی بھاری مقداروں کو جلا کر یا سمندر میں غرق کر کے تلف کر دینے کی مثال خاصی مشہور ہے[2]۔ کیلیفورنیا میں سنتروں اور بعض منڈیوں میں کیلوں کی ایک بڑی مقدار مختلف طریقوں سے تلف کر دی جاتی ہے تاکہ ان کا بازار نرخ ایک خاص سطح سے نیچے نہ گرنے پائے۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جاپان میں سات لاکھ بیس ہزار (۷۲۰۰۰۰) بہترین موتی صرف اس لیے آتش دان کی نذر کر دیے گئے تھے کہ رسد میں اضافہ کے سبب قیمت گرتی چلی جا رہی تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں موتیوں کو تلف کرنے سے قیمت میں یکایک ۳۰ فی صدی کا اضافہ ہو گیا۔[3]

---

[1] : ۱۶ روپے فی من کے حساب سے ۱۴ ہزار من گیہوں کی لاگت = ۲۲۴ ہزار روپے

۲۰ روپے فی من کے حساب سے ۱۲ ہزار من گیہوں کی قیمت فروخت = ۲۴۰ ہزار روپے

مجموعی نفع = قیمت فروخت — لاگت = ۱۶ ہزار روپے

[2] : ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۳ء کے درمیان برازیل میں بیس لاکھ ٹن (یعنی پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ من) کافی تلف کی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو: (Benham : Economics, Ch : 7)

[3] : مذکورہ بالا تینوں مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو: (باقی حاشیہ صفحہ ۲۱۳ پر ملاحظہ ہو)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری معلومات کی حد تک، سرمایہ دارانہ ممالک کے موجودہ قوانین اس طرح کے تلف مال کو جرم نہیں قرار دیتے۔ اسلام میں تلف مال کی ممانعت کے پیشِ نظر اسلامی معاشرہ میں کسی کاروباری کو قیمت چڑھانے کے لیے پیداوار کا ایک حصّہ تلف کرنے کی اجازت نہ ہوگی، بلکہ ایسا کرنے کو ایک قابلِ تعزیر جرم سمجھا جائے گا، کیونکہ یہ پورے سماج پر ایک ظلم ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ رسد میں غیر معمولی اضافہ کے سبب قیمتوں میں کمی کا رجحان اتنا شدید ہو سکتا ہے کہ کاروباریوں کو خسارہ کا اندیشہ ہو۔ معاشی تجزیہ بتاتا ہے کہ ایسا بہت استثنائی حالات میں پیش آتا ہے، مگر فرض کیجیے کہ ایسی صورتِ حال پیش آ جاتی ہے تو تلف مال کی قانونی ممانعت کاروباریوں کو مجبور کرے گی کہ وہ خسارہ سے بچنے کی کوئی راہ نکالیں۔ اس کی ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ باہمی معاہدہ سے یا ریاست کی مداخلت کے ذریعہ اس چیز کا ایک ایسا نرخ مقرر کر دیا جائے جس پر ہونے والی مجموعی فروخت سے کاروباریوں کو اپنی مجموعی پیداوار کی لاگت حاصل ہو جانے کے علاوہ کچھ منافع بھی بچ رہے۔ پیداوار کا جو حصّہ متعیّنہ قیمت پر نہ فروخت ہو سکے اسے کاروباری لوگ ریاست یا رفاہِ عامہ کے اداروں کے حوالے کر دیں جو اُسے اہلِ حاجت کے درمیان اس طرح تقسیم کر دیں، یا بیرونِ ممالک میں اس طرح فروخت کر دیں کہ اس سے ملک کے اندر بازار میں طلب پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔ یہ شکل صرف مثال کے طور پر تجویز کی گئی ہے۔ اگر تلف مال کا دروازہ بند ہو تو باہمی تعاون اور ریاست کی مدد سے ایسی صورتیں نکالی جا سکتی ہیں جو ایک طرف تو قدرت کی نعمتوں کو ضائع ہونے سے بچا لیں اور دوسری طرف کاروباریوں کے ناگزیر مفادات کا بھی تحفظ کریں۔

مال کو ضائع کرنے کی بعض شکلیں غیر کاروباری اور انفرادی بھی ہیں۔ ان میں سے بعض اسراف کے تحت آ جاتی ہیں اور بعض "غیر شرعی مصارف" سے متعلق ہیں جن پر اب گفتگو کی جائے گی۔

(بقیہ صفحہ ۲۱۲)
John Russell Smith ; The Devil of the Machine Age.— pp. 4, 17, and 18. Harcourt Brace & Co., New York, 1941)

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ غیر شرعی مصارف پر مال صرف کرنے کی ممانعت :

حقِ استعمال و تصرّف کی تعریف کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ استعمال ایسے اغراض کے لیے ہونا چاہیے جن کو شریعت نے ناجائز نہ قرار دیا ہو۔ شراب، زنا کاری، اور دوسرے محرّمات پر صرفِ مال ممنوع ہے۔ اپنی ملکیت کو جوئے بازی، یا حرام سٹہ بازی میں لگانا بھی ممنوع ہے۔ محض اظہارِ ثروت اور دکھاوے کے لیے مال صرف کرنا، جیسا کہ تقریبات میں آتشبازی وغیرہ کے سلسلہ میں ہوتا ہے، اسی ذیل میں آتا ہے۔ ملکیت کو ان تمام اغراض کے لیے استعمال کرنا ممنوع ہے جو بذاتِ خود ممنوع ہیں۔ اس میں اور تلفِ مال میں فرق یہ ہے کہ تلفِ مال استعمالِ ملکیت کی نفی ہے، اور اس شکل میں ملکیت استعمال تو کی جاتی ہے مگر ایسے مقصد کے لیے جس کے لیے مالکِ حقیقی نے اسے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں ایسے صرفِ مال کو "تبذیر" کہا گیا ہے۔ یہ شکل "اسراف" سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے مگر دونوں کے درمیان فرق ہے۔ اسراف کا اطلاق عموماً ایسے صرفِ مال پر ہوتا ہے جو جائز مقصد کے لیے ہو مگر حدِ اعتدال سے متجاوز ہو۔ تبذیر غیر شرعی اغراض سے متعلق صرفِ مال، اور اس طرح خدا کی نافرمانی کے ہم معنی ہے[1]۔

تبذیر حرام ہے :

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۔ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ

---

[1] "کہا گیا ہے کہ تبذیر مال کو گناہ کے کاموں پر صرف کرنے کا نام ہے ..... ہمارے استاد نے ائمۂ اشتقاق سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ تبذیر زمین میں بیج پھینکنے کو کہتے ہیں۔ اور اس سے تبذیر کے یہ معنی نکلے ہیں کہ ایسے مصرف میں مال صرف کرنا جو درست نہ ہو۔ ..... اور یہ رائے بھی پیش کی گئی ہے کہ تبذیر اس بارے میں تجاوز کا نام ہے کہ کونسا مصرف درست ہے۔ گویا یہ کیفیت سے جہل ہوا۔ اور اسراف کمیت کے معاملہ میں تجاوز کا نام ہے جو مقدارِ مناسب سے جہل کے ہم معنی ہے۔"

(تاج العروس شرح قاموس : تشریح مادہ ب ذ ر)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الشَّیٰطِیْنِ ۔ (الاسراء : ۲۵-۲۶)

اور مال کو ادھر ادھر نہ پھینکتے پھرو ۔ درحقیقت فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں ۔

عن ابی العبیدین قال سألت عبد اللہ عن المبذرین قال الذین ینفقون فی غیر حق ۔[1]

ابو العبیدین سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عبداللہ (ابن عباس) سے مبذرین کے معنی دریافت کیے تو آپ نے فرمایا کہ (مبذرین سے مراد) وہ لوگ ہیں جو ناحق مصارف میں خرچ کرتے ہیں ۔

باطل افکار وخیالات کی اشاعت ، یا فحش باتوں کی اشاعت حرام ہے اور ان کے لیے مال صرف کرنا تبذیر میں داخل ہے ۔ یہی حال دوسرے حرام کاموں کا ہے ۔ چونکہ زیادہ تر غیر شرعی مصارفِ مال کی تعیین ممکن ہے اور انہیں خارجی معیاروں پر پرکھ کر پہچانا بھی جا سکتا ہے لہٰذا اس سلسلہ میں ریاست قانونی اقدامات کر سکتی ہے ۔

۲ - اسراف کی ممانعت :

اسراف قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے ، اس کا اطلاق ہر ایسے طرزِ عمل پر ہوتا ہے جو صحیح انسانی اور اسلامی طرزِ عمل سے ہٹا ہوا ہو ۔ لیکن صرفِ مال اور استعمالِ ملکیت کے سلسلہ میں اس کے معنی کچھ محدود ہیں ۔ جس غرض کی تکمیل مال و املاک کی ایک مخصوص مقدار صرف کر کے کی جا سکتی ہے اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدہ کے زائد مقدار میں صرف کرنا اسراف ہے ۔[2]

---

[1] : بخاری : الادب المفرد ۔ صفحہ ۶۵

[2] : قدرے تفصیلی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو :

(Lane : Arabic English Lexicon : p. 1351)

تحت (س ، ر ، ف)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صرف مال سے آدمی کی غرض ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔ سہولت اور آرام وسکون کی خاطر بھی مال صرف کیا جاتا ہے، اور مال واملاک کے بعض استعمال زینت اور آرائش کے لیے بھی کیے جاتے ہیں جن سے انسان کے ذوقِ جمال کی تسکین ہوتی ہے۔ یہ تینوں قسم کے اغراض اسلام کی نظر میں بجا اور مناسب ہیں بشرطیکہ اعتدال اور اخلاقی حدود کو ملحوظ رکھا جائے، اور جو فائدہ مطلوب ہے اس کے لیے اتنا ہی مال صرف کیا جائے جو کافی ہو۔

ضرورت سے زیادہ مقدار میں مال صرف کرنے کے مختلف محرکات ہو سکتے ہیں۔ نام و نمود اور اظہارِ ثروت وغیرہ غیر شرعی محرکات کے تحت ضرورت سے زیادہ مال صرف کرنا تبذیر میں داخل ہے، لیکن حدِّ ضرورت سے زیادہ مال صرف کرنے کی دوسری صورتیں بھی ممکن ہیں۔ مثلاً ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ مالک کے پاس مال واملاک کی بہتات ہو اور یہ افراط اسے قدرِ اعتدال کو ملحوظ رکھنے سے غافل کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وسائل کے محدود ہونے کے باوجود مالک ان کے استعمال میں دور بینی، عاقبت اندیشی اور ذمہ داری کا رویہ نہ اختیار کرے اور لاپرواہی برتنے۔

جو بات مقدار کے سلسلہ میں کہی گئی ہے وہی اگر اشیائے استعمال کے وصفی معیار کے بارے میں بھی سامنے رکھی جائے تو اسراف کا ایک دوسرا پہلو واضح ہوتا ہے۔ ایک حاجت کی تشفی اگر ایک مخصوص معیار کے حامل سامان سے اتنی ہی ہو سکتی ہے جتنی کہ اس سے برتر معیار سے تو اس حاجت کی تشفی کے لیے مطلوبہ سامان برتر معیار کی طلب ایک مسرفانہ طلب قرار دی جا سکتی ہے، الّا یہ کہ بہتر چیز کو زینت اور حسن وجمال کی خاطر پسند کیا گیا ہو۔

اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسراف نام ہے ضروریات کی تکمیل کے لیے مقدار یا معیار کے اعتبار سے زائد از ضرورت مال صرف کرنے کا۔ یہاں ضرورت کو ایک وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے نہ کہ ناگزیر حاجات کے معنی میں۔ احتیاجات کا تعلق ناگزیر ضروریات، سہولت و آرائش کا ذریعہ بننے والی اشیاء، اور زیب وزینت کے سامانوں سب سے ہو سکتا ہے۔ سہولت اور آرام یا زیب وزینت کے لیے مال صرف کرنا اسراف نہیں بشرطیکہ اعتدال

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملحوظ رکھا جائے۔

اسراف کا یہ مجرد نظری تجزیہ بات کو پوری طرح واضح نہیں کر سکتا۔ اب ہم چند ایسی آیات اور احادیث کا مطالعہ کریں گے جو اسراف کی ممانعت ثابت کرنے کے ساتھ اس کے تصور کی بھی وضاحت کرتی ہیں:

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ۔ (اعراف: ۳۱)

کھاؤ پیو، اور اسراف نہ کرو۔ بلاشبہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا۔ (الفرقان: ۶۷)

(اللہ کے بندے وہ ہیں) جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال کی روش اختیار کرتے ہیں۔

وقال النبي صلى الله عليه وسلم: كلوا واشربوا والبسوا وتصدقوا من غير اسراف ولا مخيلة۔ وقال ابن عباس كل ما شئت والبس ما شئت ما اخطأتك اثنتان، سرف او مخيلة۔[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کھاؤ، پیو، پہنو اور صدقہ کرو مگر اس میں اسراف یا گھمنڈ نہ ہو۔ اور ابنِ عباس نے کہا ہے اسراف اور گھمنڈ سے بچتے ہوئے جو جی چاہے کھاؤ اور جو چاہو پہنو۔

عن انس ابن مالك رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان من السرف ان تأكل كل ما اشتهيت۔[2]

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بات بھی اسراف میں داخل ہے کہ جس چیز کی بھی خواہش ہو اسے کھا ہی لیا جائے۔

---

[1] بخاری: کتاب اللباس۔ پہلا باب۔ نیز ملاحظہ ہو ابن ماجہ: ابواب اللباس باب البس ما شئت ما اخطأك سرف او مخيلة۔

[2] ابن ماجہ: ابواب الاطعمہ۔ باب من الاسراف ان تأكل كل ما اشتهيت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عن ابن عمرؓ نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ھاتین اللبستین المرتفعة والمدون[1] ۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں قسم کے لباسوں، بہت قیمتی اور بہت گھٹیا لباس، کو استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے ۔

عن انس رضی اللہ عنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومًا ونحن معہ فرأی قبّة مشرفة، فقال ما ھٰذہ قیل لفلان، رجل من الانصار۔ فسکت وحملھا فی نفسہ حتّی جاء صاحبہ فسلّم علیہ فی النّاس فاعرض عنہ۔ فصنع ذٰلک مرارًا حتی عرف الرّجل الغضب فیہ والاعراض عنہ۔ فشکی ذٰلک الی اصحابہ فقال واللہ انّی لانکر نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما ادری ما حدث فیّ۔ فقالوا خرج فرأی قبّتک فقال لمن ھٰذہ فاخبرناہ۔ فرجع الرّجل الی قبّتہ فھدمھا حتّی سوّاھا بالارض۔ فخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومًا فلم یرھا فقال: ما فعلت قبّة فحدّثوہ بما کان من صاحبھا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما ان کلّ بناءٍ وبالٌ علی صاحبہ الّا ما لا ــــ یعنی ما لابدّ منہ[2]۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے، ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ تھے، تو آپ نے ایک بلند گنبد نما مکان دیکھا۔ آپ نے دریافت کیا "یہ کیا ہے؟" بتلایا گیا کہ یہ انصار میں سے فلاں آدمی کا ہے۔ اس پر آپ خاموش رہے اور یہ بات اپنے دل ہی میں رکھی

---

[1]: تلخیص الصحاح ۔ کتاب اللبّاس ۔ اخرجہ رزین ۔

[2]: ابو داؤد: کتاب الادب ۔ بابٌ فی البناء ۔ نیز ملاحظہ ہو ابن ماجہ: ابواب الزہد ۔ بابٌ فی البناء والخراب

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تا آنکہ وہ آدمی آپؐ کے پاس آیا اور بھری مجلس میں آپؐ کو سلام کیا۔ آپ نے اس کو نظر انداز کر دیا۔ آپؐ نے کئی بار ایسا ہی کیا یہاں تک کہ وہ شخص بھانپ گیا کہ آپؐ اس سے خفا ہیں اور قصداً اعراض کر رہے ہیں۔ اس نے اپنے دوستوں سے شکوہ کیا اور کہا کہ خدا کی قسم مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خفا نظر آتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے اندر کیا تبدیلی ہو گئی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ آپؐ باہر نکلے تھے تو آپؐ نے تیرا قبہ دیکھا تھا اور دریافت کیا تھا کہ یہ کس کا ہے؟ تو ہم نے آپؐ کو بتا دیا تھا۔ یہ بات سُن کر یہ آدمی لوٹ آیا اور آکر اپنے قبہ کو ڈھا دیا اور زمین کے برابر کر دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن باہر تشریف لے گئے تو اسے نہیں دیکھا، اور دریافت کیا کہ وہ قبہ کیا ہو گیا۔ لوگوں نے اس کے مالک کا حال بیان کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آگاہ رہو کہ ہر عمارت اپنے مالک کے لیے وبال ثابت ہو گی بجز اس کے جو ناگزیر ہو۔

حدّثنا ابراھیم ابن المنذر ...... عن ابی ھریرۃ عن النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم قال لا تقوم الساعۃ حتّٰی یبنی النّاس بیوتًا یشبھونھا بالمراحل۔

قال ابراھیم یعنی الثیاب المخططۃ۔[1]

ہم سے ابراہیم ابن المنذر نے حدیث بیان کی ہے کہ ..... حضرت ابوہریرہؓ نبی صلی اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک لوگ ایسے مکان نہ بنانے لگیں جن کو وہ منقش کپڑوں کے مثل (آراستہ) کریں گے۔

ابراہیم نے کہا کہ (مراحل کے) معنی ہیں نقش دار کپڑے۔

.... انّ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب کتب الی عمالہ ان لا تطیلوا بنائکم فانہ من شرّ ایامکم۔[2]

.... امیر المؤمنین عمر ابن خطاب نے اپنے عمال کو لکھا تھا کہ بلند و بالا عمارتیں

---

[1]: بخاری: الادب المفرد۔ صفحہ ۶۷

[2]: ایضاً صفحہ ۶۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ تعبیر کردہ۔ کیونکہ یہ طرزِ عمل بدترین زمانہ کی نشانی ہے۔

ان آیات اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسراف کی ممانعت کا مقصد انسان کو صرف مال میں ایک معتدل اور متوازن روش پر قائم رکھنا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اشیاء صرف یا سامانِ استعمال کو مقدار اور وصف دونوں کے اعتبار سے ضرورت کے تابع رکھا جائے غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے، یا دولت کے نشہ میں چور ہو کر، یا غیر اسلامی محرکات کے تحت بلا لحاظِ ضرورت و افادیت زیادہ مقداروں یا برتر اوصاف کی حامل اشیاء کے صرف سے پرہیز ضروری ہے۔ تبذیر و اسراف کی ممانعت کا مقصد یہی ہے۔

اسراف کے متعلق ان تشریحات پر غور کرنے سے دو اور حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی مخصوص فرد کے لیے اسراف کیا ہے اس کی تعیین میں اس فرد کے معاشی حالات اور مالی حیثیت کو بھی دخل ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی مخصوص زمانہ میں کن مصارف کو اسراف میں داخل سمجھنا چاہیے اس کی تعیین سماج کے عام معاشی حالات، سماج میں اہلِ حاجت کی قلت یا کثرت، اور ملک کے عام معیارِ زندگی کی روشنی میں کی جانی چاہیے۔

عقلِ عام اور اخلاقی قدروں کی مدد سے ایسے اصول وضع کیے جا سکتے ہیں جو ہمیں بتائیں کہ ضروریاتِ زندگی میں اہمیت کے اعتبار سے ایک ترتیب پائی جاتی ہے، اور بنیادی ضروریات کی تکمیل کو سہولت اور آرام کی خاطر کیے جانے والے مصارف پر، اور ان دونوں قسم کے مصارف کو، عام طور پر زیب و زینت سے متعلق مصارف پر مقدم رکھنا چاہیے۔ یہ مناسب نہیں کہ آدمی ضروریاتِ زندگی کو پس پشت ڈال کر زیب و زینت پہ مال صرف کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو معقول انسانی زندگی گذارنے اور زندگی کے انسانی مقاصد کے حصول سے عاجز رہ جائے گا۔ قرآن و سنت سے بھی اس بارے میں ہمیں یہی رہنمائی ملتی ہے کہ ہر فرد کو اپنے مختلف اخراجات میں مختلف ضرورتوں کی اضافی اہمیتوں کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہیے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں فرد آزاد ہے۔ وہ اپنے وسائل و ذرائع کو مباح اور جائز ضرورتوں اور کاموں پر جس طرح چاہے صرف کرے۔ مثلاً اگرچہ علاج اور علم بنیادی ضرورتیں ہیں مگر فرد انھیں نظر انداز کر کے اپنا مال اپنے گھر کی زینت

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

و آرائش پر صرف کرنے کا پورا حق رکھتا ہے۔ لیکن یہ طرزِ عمل اسلامی طریقۂ زندگی سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اسلام انسانی زندگی کو ایک بامقصد کام سمجھتا ہے اور مقصدی زندگی کا تقاضا ہے کہ ضرورتوں کو زیب و زینت پر ترجیح دی جائے۔ اسلامی فقہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ بنیادی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے زینت سے متعلق امور پر مال صرف کرنا اسراف میں داخل ہے۔ اسلام نے بنیادی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کو ضروری قرار دیا ہے[۵]۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان ضروریات کی موجودگی میں فرد کو اپنا مال غیر ضروری مصارف پر خرچ کرنے کا حق نہیں حاصل ہے۔ ایسا کرنا اسراف سمجھا جائے گا۔ "فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے[۶]۔"

اب دوسری بات کو لیجیے۔ ایک فرد کے پاس دولت کی بہتات ہے مگر سماج کی معاشی حالت خراب ہے۔ اس میں ایسے اہلِ حاجت موجود ہیں جو بمشکل اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ بہت سے اہم سماجی امور مثلاً تعلیم اور حفظانِ صحت وغیرہ کے لیے اجتماعی اداروں کو کافی مال کی ضرورت ہے۔

کیا ایسے حالات میں اس دولت مند فرد کے لیے یہ مناسب ہو گا کہ وہ جائز عیش و آرام کی آخری حدود تک پہنچنے کے لیے ہر سہولت کی فراہمی اور زیب و زینت سے متعلق ہر سامان کے حصول کی کوشش کرے اور ان سماجی حالات کی رعایت نہ ملحوظ رکھے۔ ان وسائل کا ایک فرد کے آرام و آسائش اور اس کی زیب و زینت پر صرف ہونا پورے سماج کے نقطۂ نظر سے کھلا ہوا اسراف ہے۔ دوسری اہم تر سماجی اور انفرادی ضروریات اس بات کی زیادہ مستحق ہیں کہ یہ وسائل ان کی تکمیل پر صرف کیے جائیں۔ ہر خدا ترس اور ذمہ دار فرد کو اس طرح کے اسراف سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اوپر اسراف کے چار مختلف پہلو واضح کیے گئے ہیں۔ مقدار یا وصف کے اعتبار سے حدِ اعتدال سے تجاوز، اہم تر ضروریات کو نظر انداز کر کے غیر اہم امور پر مال صرف کرنا،

۵: ملاحظہ ہو، شاطبی: الموافقات۔ جلد ۲ صفحات ۱۷۶ - ۱۷۷، اور ۱۸۱

۶: سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی، جلد ۶، صفحہ ۱۷۶۔ مطبع معارف۔ اعظم گڑھ ۱۹۳۸ء۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اجتماع کے عام معاشی حالات کے لحاظ سے فضول اخراجات۔ اسلام میں اسراف کی ممانعت ان چاروں قسموں کے اسراف کی ممانعت کے ہم معنیٰ ہے۔ ہر ذمہ دار مالک کا فرض ہے کہ وہ ہر طرح کے اسراف سے پرہیز کرے اور اپنی ملکیت کے استعمال اور مال کے صرف میں اعتدال کی روش اختیار کرے۔

اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ کیا تلفِ مال اور تبذیر پر قانونی پابندی کی طرح اسراف پر بھی قانونی بندشیں عائد کی جاسکتی ہیں۔ اس کا جواب اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب مسئلۂ اسراف کی شخصی اور اضافی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ قانون کی بنیاد خارجی پیمانے رکھنے والے متعین اصولوں پر ہوتی ہے۔ اس طرح کے شخصی اور اضافی امور کو قانون کے دائرہ میں لانا بہت مشکل ہے۔ مقدار اور وصف کے بارے میں اسراف ایک شخصی اور اضافی معاملہ ہے جس کی تعیین کے لیے خارجی اور معروضی اصول نہیں مل سکتے۔ اس طرح کے اسراف کی روک تھام کے لیے ہمیں زیادہ تر افراد کی اخلاقی تربیت اور رائے عامہ کے دباؤ پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ قانون کی مشینری اسی وقت حرکت میں لانی چاہیے جب حدِ اعتدال سے تجاوز اتنا نمایاں ہو جائے کہ خارجی معیاروں پر اسراف کا پہچاننا ممکن ہو جائے جیسا کہ آگے بتایا جائے گا، ایسے حالات میں قانونی پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں۔

اسراف کی وہ شکل جو اہم اور غیر اہم کی ترتیب نہ ملحوظ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے نسبتاً زیادہ متعین اور واضح ہے، لیکن اس کی نوعیت بھی اضافی ہے۔ اس سلسلہ میں بھی قانونی مداخلت اسی وقت کی جانی چاہیے جب مالک کی مسرفانہ بے تدبیری اور ناعاقبت اندیشی اتنی نمایاں ہو جائے کہ اسے خارجی پیمانوں سے ناپا جاسکے۔

اسراف کی چوتھی قسم کو بھی لگے بندھے ضابطوں کے تحت لانا مشکل ہے۔ اسلام ملکیت کے استعمال اور مال کے صرف کے بارے میں کامل مساوات کا قائل نہیں کہ سماج کے عام معیارِ زندگی سے بلند تر معیار اختیار کرنے کی گنجائش نہ باقی رکھے۔ اگر کسی فرد کا معیارِ زندگی سماج کے عام معیار سے بلند ہے تو اسے ہر حالت میں اسراف نہیں قرار دیا جاسکتا۔ البتہ اگر سماج کے بہت سے افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بھی نہ پوری ہو رہی ہوں اور دولتمند

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہ اس صورتِ حال کے علم کے باوجود اپنے آرام و آسائش اور زیب و زینت پر مال صرف کرنا چلا جائے تو اسے اسراف قرار دیا جائے گا۔ ایسی حالت میں ریاست کو مزید محاصل عائد کرنا چاہیے تاکہ فاضل دولت میں کمی کے باعث اس طرح کے اسراف کے مواقع کم ہو جائیں۔

اسراف کی پہلی تین شکلوں میں بھی ریاست قانونی اقدامات کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ اسراف بہت نمایاں اور متعین ہو۔ ریاست کی مداخلت کی ایک شکل "حجر" یعنی مالک کے حقِ استعمال و تصرف کو معطل کر دینے یا اسے بعض متعین حدود کا پابند بنا دینے کی شکل ہے۔ فقہ اسلامی کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کسی فرد کو اسراف یا بے تدبیری اور ناعاقبت اندیشی کی بنا پر "محجور علیہ" قرار دینا کن حالات میں مناسب ہوتا ہے۔ اس موضوع پر قدرے تفصیلی بحث بارھویں باب میں کی جائے گی۔

۴۔ تنعّم اور عیش کوشی کی ممانعت:

اشیاء صرف و استعمال پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ ایسی اشیاء بہت کم ہیں جن کا صرف یا استعمال اسلام نے ہر حال میں ممنوع قرار دے دیا ہو۔ شاید ایسی اشیا کا تناسب ایک فی لاکھ بھی نہ ہو گا۔ جب مباحات کا دائرہ اتنا وسیع ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک صاحبِ ثروت کو ان نعمتوں سے لطف اندوز ہونے میں کسی حد کا پابند کیا گیا ہے یا وہ بالکل آزاد ہے کہ اپنی ساری دولت ان جائز نعمتوں سے لطف اندوز ہونے میں صرف کر دے اور جتنا زیادہ عیش و آرام اٹھا سکتا ہو اٹھائے۔ عقلِ عام بھی اسی بات پر گواہی دیتی ہے کہ ایک بامقصد اور ذمہ دار زندگی میں اس طرزِ عمل کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ حدِ اعتدال سے تجاوز کے بعد عیش و آرام اور اس کی خاطر کسبِ مال ہی عملاً زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ مال و دولت قیامِ حیات کے لیے ہیں مگر خود قیامِ حیات کے بھی کچھ مقاصد ہیں۔ قیامِ حیات کے ضروری اہتمام کے بعد فرد کو ان بلند تر مقاصد کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اور فاضل مال و املاک کو ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہیے۔ نہ یہ کہ اسے عیش کوشی اور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لذت اندوزی اور تنعم کی نذر کردے اسی لیے اسلام نے لذاتِ دنیا میں انہماک، مبالغہ کی حد تک آرام و سہولت کی طلب اور عیش و عشرت میں غرق ہو جانے والی زندگی کو از حد ناپسندیدہ قرار دے کر اس سے اجتناب کی تاکید کی ہے۔

عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم لما بعث بہ الی الیمن قال ایاك و التنعم فان عباد اللہ لیسوا بالمتنعمین[1]۔

معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جب انہیں یمن بھیجا تو فرمایا کہ: خبردار! عیش کوشی سے اجتناب کرنا کیونکہ اللہ کے (اچھے) بندے عیش کوش نہیں ہوتے۔

ابو عثمان روایت کرتے ہیں کہ ہم آذربیجان میں تھے تو وہاں کے والی کے نام (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ خط آیا:

یا عتبۃ بن فرقد - ایاکم و التنعم، و زیّ اھل الشرک، و لبوس الحریر ...[2]۔

عتبہ بن فرقد، خبردار! عیش کوشی سے اجتناب کرنا، اور اہلِ شرک کی پوشاک سے اور ریشم کا لباس پہننے سے .....

عن سعید بن ھند قال قال ابو ھریرۃ قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تکون ابل للشیاطین و بیوت للشیاطین فاما ابل الشیاطین فقد رأیتھا، یخرج احدکم بجنیباتٍ معہ قد اسمنھا فلا یعلو بعیرًا منھا و یمرّ باخیہ قد انقطع بہ فلا یحملہ - اما بیوت الشیاطین

---

[1] : مشکوٰۃ المصابیح - باب فضل الفقراء۔

[2] : جمال الدین ابو الفرج ابن الجوزی: سیرۃ عمر ابن خطاب صفحہ ۱۳۰، مطبع دار السعادۃ ... مصر ۱۹۲۴ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ندمراءها۔

كان سعيد يقول لا أراها إلا هذه الأقفاص التي نستر الناس بالديباج۔[۵۱]

سعید بن ہند سے روایت ہے کہ ابوہریرہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطانوں کے کچھ اونٹ ہوتے ہیں اور بعض مکان بھی شیطانوں کے ہوتے ہیں۔ شیطانوں کے اونٹوں کو تو میں نے دیکھا ہے کہ تم میں سے ایک آدمی چند بے سواری کے جانور لے کر نکلتا ہے جن کو اس نے کھلا کھلا کر موٹا کر دیا ہوتا اور ان میں سے کسی اونٹ پر نہ خود سوار ہوتا ہے نہ اپنے اس کمزور اور سواری نہ رکھنے والے بھائی کو سوار کرتا ہے جو اسے راستہ میں ملتا ہے۔ البتہ شیطانوں کے گھر میں نے نہیں دیکھے ہیں۔

سعید کہا کرتے تھے کہ میرا خیال ہے کہ وہ (شیطانوں کے گھر) یہ ہودج ہیں جن پر لوگ دیباج کے غلاف ڈالتے ہیں۔

اس حدیث سے یہ بات مستنبط کی جا سکتی ہے کہ رہائشی مکانوں کی زیب و زینت کے لیے قیمتی پردے استعمال کرنا اسراف میں داخل ہے۔ یہ مضمون ایک دوسری حدیث میں صراحتہً بھی آیا ہے۔ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ان کے کمرہ میں دیواروں پر پردے لٹکائے گئے ہیں۔ آپ نے ان کو اتار دیا اور فرمایا:

ان الله لم يأمرنا ان نكسو الحجارة والطين[۵۲]

اللہ نے ہمیں پتھر اور مٹی کو کپڑے پہنانے کا حکم نہیں دیا ہے۔

قرآن حکیم دنیا پرستانہ طرز زندگی کا بیان ان الفاظ میں کرتا ہے:

۵۱: ابوداؤد: کتاب الجہاد۔ باب فی الجنائب۔

۵۲: مسلم: کتاب اللباس والزینۃ۔ باب لا تدخل الملائکۃ بیتاً فیہا کلب ولا صورۃ۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابوداؤد: کتاب اللباس۔ باب فی اتخاذ الستور۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَہْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۔

(الحدید : ۲۰)

آگاہ رہو کہ دنیا (پرستی) کی زندگی لہو و لعب (ریبے جا) زینت و آرائش، باہمی مفاخرت، اور مال و اولاد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کا نام ہے۔

دنیا کی لذتوں میں انہماک انسان کو آخرت سے غافل اور اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کی طرف سے لاپروا بنا دیتا ہے۔ جو انسان عیش کوشی میں محو ہو جاتا ہے وہ صالح مقاصدِ زندگی کے لیے اپنا مال اور وقت صرف کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اسلام ایک جُداگانہ طرزِ زندگی کا طالب ہے۔ اس زندگی میں بھی ہر نعمت اور ہر لذت کی گنجائش ہے۔ مگر اسی حد تک جس حد تک کہ وہ انسان کو اس کی اُخروی اور دُنیوی ذمہ داریوں سے غافل نہ بنا دے، بلکہ ان مقاصد کے تابع رہے اور ان کے حصول میں مددگار ثابت ہو۔ آرام و آسائش، جمال آفرینی اور تزئین و آرائش انسان کی کارکردگی، اس کے مزاج اور اس کے اخلاق و عادات پر اچھا اثر بھی ڈال سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان امور میں اعتدال برتا جائے۔ اسی لیے اسلام نے اس بات کی ہدایت کی ہے کہ ہر فرد کو اپنی وسعت کے مطابق ان امور کا اہتمام کرنا چاہیے۔

عن ابی الاحوص عن ابیہ قال اتیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ثوب دون۔ فقال أ لک مالٌ، قال نعم، قال من ای المال، قال قد آتانی اللہ من الابل والغنم والخیل والرقیق، قال فاذا اتاک اللہ نعمۃ فلیر اثر نعمتہٖ علیک وکرامتہٖ۔[1]

ابوالاحوص نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ

[1]: ابوداؤد: کتاب اللباس۔ باب فی الخلقان وفی غسل الثوب۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گھٹیا کپڑے پہنے ہوئے حاضر ہوا۔ آپ نے دریافت کیا کہ کیا تمہارے پاس دولت ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ آپ نے پوچھا کس قسم کی؟ میں نے کہا اللہ نے مجھے اونٹ، بکریاں، گھوڑے اور غلام عطا کیے ہیں۔ فرمایا:
"جب اللہ تمہیں کوئی نعمت عطا فرمائے تو چاہیے کہ تمہاری ذات پر اس کے فضل وکرم کا اثر دیکھا جا سکے۔"

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من سعادۃ المرء المسکن الواسع والجار الصالح والمرکب الھنیئ۔ [۱]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا وسیع مکان، نیک پڑوسی اور عمدہ سواری آدمی کی بہبود میں داخل ہیں۔

ان آثار کے مطالعہ سے واضح ہے کہ اسلام ہم سے ترک لذات کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اعتدال اور توازن چاہتا ہے۔ فرد کو اپنے آرام و آسائش کے اہتمام اور زندگی کے بلند تر مقاصد کے حصول کی جدوجہد کے درمیان یک گونہ توازن برقرار رکھنا چاہیے۔
اگر ایک فرد سماج کے عام معاشی حالات سے بے نیاز ہو کر اپنے آرام و آسائش کا اہتمام کرے گا تو سماجی حالات اور انفرادی حالات کا توازن بگڑ جائے گا، اور سماج میں احساسِ محرومی، احساسِ کمتری اور حرص و ہوس کے مہلک امراض جڑ پکڑنے لگیں گے۔
تنعم اور عیش کوشی کیا ہے؟ اس کا انحصار ایک طرف تو فرد کی نفسیاتی کیفیت اور اس کی نیت پر ہے اور دوسری طرف سماج کے حالات پر۔ صحابہ کرامؓ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ سماج کے عام معیارِ زندگی سے بہت بلند معیارِ زندگی اختیار کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔
اب رہا یہ سوال کہ تنعم اور عیش کوشی کی ممانعت میں قانون کو کیا دخل ہو سکتا ہے تو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر اسراف کے سلسلہ میں دیا جا چکا ہے۔ قانون صرف وہیں حرکت میں آ سکتا ہے جہاں کسی فرد یا طبقہ میں تنعم اور عیش کوشی کا رجحان اتنا زیادہ نمایاں ہو جائے

---

[۱]: بخاری: الادب المفرد۔ صفحہ ۷۶۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ اسے خارجی پیمانوں سے ناپا جا سکے۔ اگر ایک فرد اپنی خدمت کے لیے پچاسوں ملازم رکھے اپنی سواری کے لیے درجنوں کاریں ضروری سمجھے، مکان کی آرائش و زیبائش پر لاکھوں روپے صرف کرے تو بلا شبہ یہ اسراف اور عیش کوشی کی ایسی نمایاں شکلیں ہوں گی کہ ان پر قانونی گرفت ہونی چاہیے۔ اگر فرد کا اپنا ضمیر اور رائے عامہ کا دباؤ اسے اس روش سے نہ روک سکے تو اسلامی ریاست کو مداخلت کرنی چاہیے۔ سماج کے مال دار طبقہ میں تنعّم اور عیش کوشی کے رجحان کو دبانے کی عمومی تدابیر میں سامانِ تعیّش پر محاصل عائد کرنا، یا ان کی پیداوار کو بعض حدود کا پابند بنا دینا شامل ہے۔

اوپر کی بحث عیش و آرام کے ان سامانوں سے متعلق ہے جن کا استعمال فی نفسہٖ جائز رکھا گیا ہے۔ بعض سامانِ تعیّش ایسے ہیں جن کا استعمال اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے۔ مردوں کے لیے ریشم کے کپڑوں اور سونے کے زیورات کا استعمال حرام ہے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے سونے یا چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع ہے۔ یہ ان سامانوں کا ذکر ہے جن میں بظاہر تخریبِ اخلاق کا کوئی پہلو نہیں نظر آتا۔ مخربِ اخلاق سامانِ تعیّش مثلاً شراب، شہوانی موسیقی یا رقّاصہ کی خدمات وغیرہ کی حرمت اس کے علاوہ ہے۔ ریشمی لباس کے علاوہ مردوں کے لیے شوخ رنگین اور بھڑکدار کپڑوں کا استعمال بھی ممنوع ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

حرّم لباس الحریر والذّهب علیٰ ذکور امّتی واحلّ لاناثهم[۵۱]

میری امّت کے مردوں پر ریشمی لباس اور سونے کا استعمال حرام کر دیا گیا ہے اور عورتوں کے لیے جائز رکھا گیا ہے۔

عن علی ابن ابی طالب کرم الله وجهه انّ رسول الله صلّی الله علیه وسلّم نهی عن لبس القسیّ وعن لبس المعصفر وعن تختّم الذهب[۵۲]

حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ

---

[۵۱] : ترمذی: ابواب اللباس - باب ما جاء فی الحریر والذهب للرّجال

[۵۲] : مسلم: کتاب اللباس والزینۃ - ابو داؤد: کتاب اللباس۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علیہ وسلم نے قسّی[1]، اور شوخ زعفرانی رنگ کے کپڑے پہننے اور سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع کیا ہے۔

لا تلبسوا الحریر ولا الدیباج ولا تشربوا فی آنیۃ الذھب والفضۃ ولا تأکلوا فی صحافھا فانھا لھم فی الدنیا۔

و فی روایۃ و لکم فی الآخرۃ۔[2]

ریشم اور دیباج کے کپڑے نہ پہنو۔ سونے اور چاندی کے برتنوں میں پانی نہ پیو۔ نہ ان سے بنے ہوئے بڑے بڑے پیالوں میں کھانا کھاؤ۔ یہ سب دنیا کی زندگی میں ان (دنیا پرستوں) کے لیے ہیں۔

ایک دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "اور آخرت میں تمہارے لیے ہیں"۔

ان عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ قال وجد عمر بن خطاب حُلّۃً من استبرق تباع بالسوق فاخذھا فاتی بھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فقال یا رسول اللہ ابتع ھذہ فتجمّل بھا للعید والوفد۔ فقال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم: ان ھذہ لباس من لا خلاق لہ۔[3]

عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عمر بن الخطابؓ نے ایک بار استبرق کا ایک جامہ فروخت ہوتے دیکھا۔ آپ نے اسے لے لیا اور رسول اللہ کی خدمت میں لے آئے۔ اور کہا اے اللہ کے رسول اسے خرید لیجیے اور عید کے موقع پر اور (باہر سے آنے والے) وفود سے ملاقات کرتے وقت اسے پہن کر زینت حاصل کیا کیجیے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ان لوگوں کا لباس

---

[1]: قسّی ایک سُوتی کپڑے کا نام ہے جس پر ابریسم کے نقش و نگار بنے ہوتے ہیں۔ یہ کپڑا اس زمانہ میں عرب میں مصر سے درآمد کیا جاتا تھا۔

[2]: مسلم، کتاب اللباس والزینۃ۔ نیز بخاری۔ ابوداؤد و ترمذی۔ نسائی۔

[3]: ایضاً: بخاری، کتاب الادب۔ نیز ابوداؤد و نسائی، ابن ماجہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے جن کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں (یعنی کافروں کا)

ان احادیث و آثار سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عیش و عشرت کی بعض نمایاں ترین شکلوں کو اسلام نے یکسر ممنوع قرار دے دیا ہے۔ فرد کے معاشی حالات اور سماج کے عام حالات سے قطع نظر، ان شکلوں کا اختیار کرنا ہر حالت میں ممنوع ہے۔

۵۔ مضرّت رساں استعمالِ ملکیّت کی ممانعت:

انفرادی ملکیّت کے استعمال پر سب سے بڑی پابندی یہ ہے کہ فرد کو اپنی ملکیّت اس طرح نہیں استعمال کرنی چاہیے کہ اس سے دوسرے افراد یا بحیثیتِ مجموعی پورے سماج کو نقصان پہنچے۔ یہاں صرف دانستہ نقصان پہنچانے کا ذکر نہیں بلکہ فرد کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس کے استعمالِ ملکیّت کے نتیجہ میں دوسروں پر مضر اثرات نہ پڑنے پائیں۔ وہ خود اگر مضرت رسانی کا کوئی ارادہ نہ رکھتا ہو تو بھی اگر اس کے کسی مالکانہ تصرّف سے دوسروں پر مضر اثرات مرتّب ہوتے ہوں تو اس کی ذمّہ داری ہے کہ اپنے تصرّف میں اس طرح ترمیم عمل میں لائے کہ دوسروں پر بُرا اثر نہ پڑے۔

قرآن و سنّت میں ضرر کے ازالہ کو بہت اہمیّت دی گئی ہے، اور مختلف معاملات کا ذکر کرتے ہوئے مضرّت رسانی سے اجتناب کی تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً:

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۔ (البقرہ: ۲۳۳)

نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچّہ اس کا ہے نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچّہ اس کا ہے۔

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (قصص: ۳۷)

ظلم کرنے والے فلاح نہیں پائیں گے۔

نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے:

لا ضرر فی الاسلام[۱] ۔ اسلام میں مضرّت رسانی جائز نہیں ہے۔

---

[۱] یحییٰ ابن آدم القرشی: کتاب الخراج ۔ صفحہ ۶۸

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عن عبادة بن الصامت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی ان "لا ضرر ولا ضرار"[1]

عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ مضرت رسانی جائز نہیں ہے۔ نہ ابتداً نہ جواباً۔

لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام[2]

اسلام میں مضرت رسانی کی گنجائش نہیں۔ نہ ابتداً نہ جوابی کارروائی کے طور پر۔

"من ضار ضار اللہ بہ ومن شاق شق اللہ علیہ"[3]

جو کسی دوسرے کو نقصان پہنچائے گا، اس کو اللہ نقصان پہنچائے گا، اور جو کسی دوسرے کو تکلیف دے گا، اس کو اللہ تکلیف میں مبتلا کرے گا۔

عن ابی بکر الصدیق قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ملعون۔ من ضار مؤمنا او مکر بہ"[4]۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"جو کسی مومن کو نقصان پہنچائے یا اس کو فریب دے اس پر لعنت ہے"

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یدخل الجنۃ من لا یأمن جارہ بوائقہ[5]

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص جنت میں نہ داخل ہو سکے گا جس کے پڑوسی اس کی چیرہ دستیوں سے نہ محفوظ ہوں۔

---

[1]: ابن ماجہ: کتاب الاحکام باب من بنی فی حقہ ما یضر بجارہ۔ نیز موطا امام مالک۔ کتاب الاقضیہ

[2]: یحییٰ ابن آدم: کتاب الخراج۔ صفحہ ۹۸

[3]: ترمذی۔ ابواب البر والصلہ۔ باب ماجاء فی الخیانت والغش

[4]: ایضاً

[5]: مسلم: کتاب الایمان۔ باب تحریم ایذاء الجار

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ایسا شخص مومن نہیں ہے[1]۔ مضرت رسانی غیر منقولہ املاک کے استعمال سے بھی واقع ہوسکتی ہے۔ نقد سرمایہ کے استعمال سے بھی اور عام اشیاء استعمال میں تصرف سے بھی۔ مثال کے طور پر مالک کے ذاتی مکان کو لے لیجیے۔ اُسے اپنے مکان کی تعمیر یا اس کے استعمال میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ پڑوسیوں کو تکلیف نہ پہنچے۔ حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ :

قلنا یا رسول اللہ ما حق الجار ؟ قال : ان استقرضك اقرضته، وان استعانك اعنته، وان احتاج اعطيته، وان مرض عدته وان مات تبعت جنازته وان اصابه خير سرك وهنيته - وان اصابته مصيبة سأتك وعزيته ولا تؤذه بقتار قدرك الا ان تغرف له منها، ولا تستطيل عليه بالبناء لتشرف عليه، ولا تسد عليه الريح الا باذنه، وان اشتريت فاكهة اهد ينله منها والا فادخله سرا لا يخرج ولدك بشئ منه يغيظون به ولده وهل تفقهون ما اقول لكم ؟ لن يؤدي حق الجار الا القليل من رحم الله[2]

ہم نے دریافت کیا، اے اللہ کے رسول پڑوسی کا کیا حق ہے ؟ فرمایا" اگر وہ تم سے قرض مانگے تو اُسے قرض دو، تم سے مدد چاہے تو اس کی مدد کرو، ضرورت مند ہو تو اسے کچھ دو۔ بیمار پڑجائے تو اس کی عیادت کرو، مرجائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ جاؤ۔ اگر اسے کوئی فائدہ ہو تو تمہیں بھی خوشی ہو اور تم اسے مبارک باد دو، اس پر کوئی مصیبت آپڑے تو تمہیں بھی دکھ ہو اور تم اس کی تعزیت کرو۔ اسے اپنی ہانڈی کی خوشبو سے پریشان نہ کرو، الا یہ کہ اس کو اس میں سے اس کے بیبے

---

[1] : مشکوٰۃ : باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق ۔ متفق علیہ

[2] : ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی : الجامع الاحکام القرآن ۔ جلد ۵ ۔ صفحہ ۱۸۸ ۔ قاہرہ مطبعۃ دار الکتب المصریہ ۱۹۵۲ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصّہ نکالو، اپنی عمارت اس کے مقابلہ میں اتنی اونچی نہ اُٹھاؤ کہ اس کے گھر میں جھانک سکو۔ نہ اپنی عمارت سے اس کے گھر کی ہوا روکو۔ الاّ یہ کہ تم نے اس کی اجازت حاصل کر لی ہو۔ اگر تم نے پھل خریدا ہو تو اس میں سے اس کو بھی تحفہ بھیجو۔ ورنہ چھپا کر لاؤ، ایسا نہ ہو کہ اس میں سے تمہارے بچے کچھ لے کر باہر نکلیں اور اس کے بچوں کو (احساسِ محرومی کی وجہ سے) غم و غصّہ میں مبتلا کریں۔ میں جو بات کہہ رہا ہوں کیا اسے تم پوری طرح سمجھ رہے ہو؟ پڑوسی کا حق بس تھوڑے ہی لوگ ادا کر سکیں گے جن پر اللہ نے رحم فرمایا ہو۔"

اس جامع حدیث سے جہاں یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام پڑوسیوں کے درمیان کس قسم کے تعلقات چاہتا ہے، وہاں استعمالِ ملکیت کے بارے میں اس نکتہ کی بھی وضاحت ہوتی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ فقہائے اسلام نے اس اصول کو قانونی شکل میں بھی بیان کیا ہے۔

"مالک کو اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ اپنی ایسی املاک میں حسبِ منشا تصرّف کرے جن میں کسی دوسرے کا حق نہ ہو۔ وہ اپنی دیواریں بلند کر سکتا ہے اور جس طرح چاہے، تعمیر کر سکتا ہے، البتہ اس کے تصرّفات کو اس کے پڑوسی کے لیے اتنا مضر نہ ہونا چاہیے کہ مضرت ضررِ فاحش تک پہنچ جائے۔"[۱]

ضررِ فاحش کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"ایسا تصرّف جو (پڑوسی کے) مکان کو کمزور کرنے یا منہدم کر دینے کا سبب بن جائے اور اس کی بنیادی ضرورتوں میں رکاوٹ ڈالے۔ یعنی ایسی ضرورتیں جو مکان سے مقصود ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ رہے ایسے تصرّفات جو ان فوائد میں حارج ہوتے ہوں جو مکان کے مقاصدِ اصلیہ میں نہیں شامل ہیں، تو اسے ضررِ فاحش نہیں سمجھا جائے گا۔"[۲]

---

۱ ؎ : قدری پاشا : مرشد الحیران ۔ دفعہ ۵۷

۲ ؎ : ایضاً دفعہ ۵۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام فخرالدین زیلعی (م ۷۴۳ھ) لکھتے ہیں :

"واضح رہے کہ ہر آدمی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اپنی ملکیت میں حسب منشاء تصرف کرے ، جب تک کہ اس سے دوسروں کو کھلا ہوا نقصان نہ پہنچ رہا ہو ۔ چنانچہ اس کے لیے جائز ہے کہ اپنے گھر میں حمام تعمیر کرے کیونکہ اس سے پڑوسیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا . . . . .

"اگر وہ اپنے گھر میں روٹی تیار کرنے کے لیے اس طرح کا تنور گاڑنے کا ارادہ کرے جیسا کہ دوکانوں میں ہوتا ہے ، یا آٹا پیسنے کی چکی لگائے ، یا دھوبیوں کے لیے گھاٹ بنائے ، تو ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا کیونکہ اس سے پڑوسیوں کو کھلا ہوا نقصان (ضرراً ظاہراً فاحشاً) پہنچے گا ۔ قیاس چاہتا ہے کہ ایسا کرنا بھی جائز ہو ، کیونکہ یہ سب مالکانہ تصرف میں داخل ہے ، لیکن اس معاملہ میں مصالح کی رعایت سے استحسان کے طور پر قیاس کو ترک کر دیا گیا ہے[1]"

یہی رائے ابنِ ہمام نے بھی ظاہر کی ہے اور اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں[2] ۔ فقہ حنفی میں فتویٰ اسی رائے کے مطابق ہے ، اور اسی کو ابن عابدین شامی نے بھی اختیار کیا ہے[3] ۔

اس کتاب میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں کیونکہ ہمارا مقصد تفصیلی ضوابط کا مطالعہ نہیں بلکہ اصولوں کی تعیین ہے ۔ تفصیلی ضوابط وقت ، مقام اور حالات کے اعتبار سے بدلتے رہیں گے ۔ مثال کے طور پر ضررِ فاحش کیا ہے اس کی تعیین کسی دَور کی اسلامی حکومت اور اس کی مجالسِ قانون ساز اور عدالتیں ہی کر سکتی ہیں ۔ کسی خاص تعریف کو حرفِ آخر کی حیثیت نہیں دی جا سکتی ۔ اصول یہ ہے کہ غیر منقولہ املاک پر مالک کا حقِ تصرف محدود

---

[1] : فخرالدین عثمان بن علی الزیلعی الحنفی : تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۔ جلد ۴ صفحہ ۱۹۶ مطبع امیریہ ۔ بولاق ۔ ۱۳۱۴ھ

[2] : ابنِ ہمام : فتح القدیر ۔ جلد ۵ صفحہ ۵۰۶

[3] : ابنِ عابدین : ردّ المحتار علی الدّر المختار ۔ جلد ۴ ۔ صفحہ ۳۷۶ ۔ ۳۷۷ ۔ اختلافی رائے کے لیے ملاحظہ ہو : سرخسی : المبسوط جلد ۱۵ صفحہ ۲۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے ، اور اس حق کی تحدید کرنے والی سب سے اہم بات یہ ہے کہ پڑوسیوں کو کوئی قابلِ لحاظ نقصان نہیں ہونا چاہیے ۔ دورِ جدید میں جبکہ کئی کئی منزلوں کی وسیع و عریض عمارتوں میں ہزاروں افراد ایک ساتھ رہتے ہیں ان ضوابط کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے ۔ ان ضوابط کی ترتیب میں ایک طرف تو مالک یا مکان میں رہنے والے کی ضرورتوں کا لحاظ رکھنا ہوگا اور دوسری طرف اس کے پڑوسیوں کی ضرورتوں کا ۔

نقدِ سرمایہ کے مضرت رساں استعمال کا مطلب یہ ہے کہ مالک اپنے سرمایہ سے فائدہ اُٹھا کر دوسروں کا استحصالِ بے جا کرے ، اور ایسے طریقے اختیار کرے جن سے دوسرے کاروباریوں یا صارفین کو تکلیف پہنچے ۔ چونکہ اس تشکل کا تعلق سرمایہ کے نفع آور استعمال کے حق سے ہے لہٰذا اس کا مطالعہ علیحدہ سے کیا جائے گا ۔

۶ ۔ ذی رُوح املاک پر تصرّف کے حُدُود :

انسان کی املاک میں مویشی اور محنت کرنے والے جانور بھی شامل ہیں ۔ مالک کو ان سے استفادہ کا حق حاصل ہے مگر ان سے اتنا کام نہ لینا چاہیے جو ان کی طاقت سے باہر ہو ۔ یا جس کو انجام دیتے ہوئے وہ اپنی عمرِ طبیعی تک نہ پہنچ سکتے ہوں ۔ ساتھ ہی ان کی ذمہ داری ہے کہ ان جانوروں کی خوراک کا مناسب انتظام کرے ۔ اس بارے میں اگر مالک کوتاہی کرے تو محتسب اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکے گا[۱] ۔ دورِ جدید میں جانوروں کے ساتھ بے رحمی کے سلوک کے خلاف قوانین کا منشا حیوانات کے انہی حقوق کا تحفظ ہے ۔ اسلامی ہدایات بھی اس سلسلہ میں مناسب قانون سازی کا تقاضا کرتی ہیں ۔

عن سہیل بن الحنظلیہ قال مرّ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ببعیرٍ قد لحق ظھرہ ببطنہٖ ۔ قال اتقوا اللہ فی ھٰذہ البھائم ثم

---

[۱] : ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری الماوردی : الاحکام السلطانیہ ۔ صفحہ ۲۱۴ المطبعۃ المحمودیہ ۔ مصر (سنِ طبع درج نہیں ہے)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

المعجمه نار کبوھا صالحۃً و کلوھا صالحۃً ۔[1]

سہیل بن حنظلیہؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک ایسے اونٹ کے پاس سے ہوا جس کی پیٹھ اس کے پیٹ سے آلگی تھی ۔ آپ نے فرمایا کہ ان بے زبان جانوروں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، جب تک یہ سواری کے قابل ہوں ان پر سواری کرو اور ان کو اچھی حالت ہی میں اپنی خوراک بنالو۔

جانوروں کو انہی اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہیے جن کے لیے قدرت نے ان کو پیدا کیا ہے، یعنی سواری اور بار برداری یا زرعی اور صنعتی محنت کے کاموں کے لیے جانوروں کو باہم لڑا کر تماشا دیکھنا ناجائز ہے[2] ۔ چاندماری یا تیراندازی کی مشق میں ان کو نشانہ کے طور پر استعمال کرنا بھی ممنوع ہے ۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن من اتخذ شیئًا فیہ الروح غرضًا ۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر لعنت بھیجی ہے جو کسی ذی روح چیز کو (مشق کی خاطر) ہدف بنائے ۔

متعدد احادیث میں جانوروں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرنے کی تلقین کی گئی ہے[4] ، یہاں تک کہ غذائی اغراض کے لیے جانوروں کو ذبح کرتے وقت بھی ایسا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو کم سے کم تکلیف دہ ہو۔

---

[1] : ابوداؤد: کتاب الجھاد۔ باب مایؤمر بہ من القیام علی الدواب والبھائم۔

[2] : ابوداؤد: کتاب الجھاد۔ باب التحریش بین البھائم

[3] : مسلم: کتاب الصید والذبائح۔ باب النھی عن صبر البھائم۔ نیز بخاری۔

[4] : ملاحظہ ہو: سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی جلد ۶ صفحات ۲۳۹ - ۲۴۴ - جانوروں کے حقوق۔ مطبع معارف، اعظم گڑھ - ۱۹۳۸ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ب) نفع آور کاروبار کے حُدود

سرمایہ کے نفع آور استعمال کا حق بھی چند حدُود کا پابند ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں حدّیں ضرر رسانی اور استحصالِ بے جا سے اجتناب کی پابندیاں ہیں۔ یہ پابندی اتنے وسیع معانی کی حامل ہے کہ اس کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ایک علیحدہ تصنیف درکار ہے۔ یہاں ہم صرف چند اصولی حدُود کے ذکر اکتفا کریں گے۔

ان حدود میں سے بعض وہ ہیں جو کاروبار میں اخلاقی اصول کے منافی طریق کار اختیار کرنے سے روکتے ہیں۔ کچھ دوسرے حدود ہیں جو ان جائز افعال سے بھی روکتے ہیں جو کسی مخصوص حالت میں ایسے نتائج سامنے لا رہے ہوں جن میں پورے سماج یا افراد کے کسی گروہ کا نقصان مضمر ہو، اگرچہ بعض اوقات ان جائز افعال کے پیچھے ارادہ اور نیّت کی معصومیّت بھی موجود ہوتی ہے، اور ضرر رسانی بالکل مقصود نہیں ہوتی، لیکن چونکہ نادانستہ ہی سہی، نتیجہ ضرر رسانی ہی ہوتا ہے لہٰذا ان کو بھی غلط قرار دے دیا گیا ہے۔

۱ - کاروبار میں جن منافیِ اخلاق حرکتوں کے ذریعہ نفع کا حصول چاہا جاتا ہے ان میں دھوکا فریب اور غلط بیانی بہت نمایاں چیزیں ہیں۔ کاروباری دنیا میں یہ چیز غلط اور مبالغہ آمیز اشتہار بازی، عیوب دار مال کو اچھا بنا کر پیش کرنے، گھٹیا مال کو بظاہر بلند معیار بنا کر سامنے لانے، یا قیمتِ خرید کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے کر خریدار کو زیادہ قیمت دینے پر آمادہ کرنے کی شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ اسلام نے ان ساری حرکتوں کو ممنوع اور قانوناً قابلِ گرفت قرار دیا ہے۔

۲ - ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ناپ تول کے پیمانے بالکل درست اور معیار کے مطابق ہوں۔ اس سلسلہ میں ہر کوتاہی کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیا گیا ہے۔

۳ - اشیاءِ خوراک اور اس قبیل کی دوسری چیزوں میں ملاوٹ کرنے اور اس طرح خریداروں کو دھوکا دینے کو جرم قرار دیا گیا ہے۔

۴ - مال کو مہنگا کرنے کے لیے ذخیرہ اندوزی (احتکار) کرنا، اور اس طرح اس کی رسد میں

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصنوعی طور پر کمی کر کے قیمت میں اضافہ چاہنا ممنوع ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"من احتکر یرید ان یتغالی بھا علی المسلمین فھو خاطئ و قد برئت منہ ذمۃ اللہ"[1]

"جو مسلمانوں کے لیے نرخ گراں کرنے کی غرض سے ذخیرہ اندوزی کرے وہ غلط کار ہے اور اللہ اس سے بری الذمہ ہے۔"

اشیائے تجارت کی گرانی کے لیے کوشش کرنا بہت بُرا کام ہے:

"...... فقال معقل ابن یسار، سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: من دخل فی شیئ من اسعار المسلمین لیغلیہ علیھم کان حقا علی اللہ تبارک و تعالیٰ ان یقذفہ فی معظم النار یوم القیامۃ۔"[2]

معقل ابن یسار نے کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جو شخص مسلمانوں کے بازار کے نرخ میں اس لیے دخل دے کہ اسے گراں کر دے تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن اسے زبردست آگ میں جھونک دے۔"

احتکار، اور اشیائے تجارت کے نرخ گراں کرنے کی دوسری سماج دشمن کوششوں کی روک تھام کے لیے اسلامی حکومت قانونی اقدامات کرے گی۔

۵۔ معاملاتِ تجارت میں طرفین کی کامل رضامندی شرط ہے اور کسی معاملہ میں جبر و اکراہ کو دخل نہیں ہونا چاہیے۔

مذکورہ بالا پابندیاں ان امور سے متعلق ہیں جن کا اخلاقی اصول کے منافی ہونا ظاہر ہے۔ بعض ایسی مضرت رساں شکلیں بھی ممنوع قرار دی گئی ہیں جو بظاہر معصوم

---

[1]: حاکم: مستدرک۔ جلد ۲ صفحہ ۱۲۔ طبع حیدر آباد، ۱۳۴۰ھ

[2]: مسند ابوداؤد الطیالسی۔ اسند عن معقل ابن یسار صفحہ ۲، طبع حیدر آباد نیز حاکم: مستدرک جلد ۲ صفحہ ۱۲

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معلوم ہوتی ہیں۔

۶۔ فروخت کرنے والے کا فرض ہے کہ اگر اس کے مال میں کوئی عیب ہے، تو خریدار کو اس سے مطلع کر دے، خواہ وہ اس سے ایسا کرنے کا مطالبہ کرے یا نہ کرے۔ مالِ تجارت کے عیب پر اپنی خاموشی کے ذریعہ پردہ ڈال دینا بجائے خود ایک ممنوع فعل ہے۔ خریدار کو ہر اس عیب سے باخبر کر دینا ضروری ہے جس کے علم میں آنے کے بعد اس کے خریداری کے ارادہ میں تبدیلی کا امکان ہو۔[1]

عن عقبه بن عامر الجهني قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: المسلم اخو المسلم، ولا يحل لمسلم ان باع من اخيه بيعًا فيه عيب ان لا يبينه له۔[2]

عقبہ بن عامر جہنی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس نے اپنے بھائی کے ہاتھ کوئی ایسی چیز فروخت کی ہو جس میں کوئی نقص ہو اور وہ اس کو اس نقص سے آگاہ نہ کرے۔"

۷۔ خریدار کی شدتِ احتیاج اور اضطراری کیفیت سے بیجا فائدہ اٹھا کر اس سے زیادہ دام وصول کرنا یا فروخت کرنے والے کی شدتِ احتیاج سے بیجا فائدہ اٹھا کر اسے کم دام دینا غلط ہے ایسا ہر معاہدہ بیع فاسد سمجھا جائے گا

"مضطر کی خرید و فروخت فاسد ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ آدمی کو کھانے پینے یا لباس وغیرہ (ضروریات سے متعلق) اشیاء کی شدید ضرورت ہو اور فروخت کرنے والا بازار بھاؤ سے زیادہ قیمت وصول کرنے پر اصرار کرے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ (فروخت کرنے والا فروخت کرنے پر مجبور ہو اور) خریدنے والا بازار بھاؤ سے بہت کم دام پر سودا چکانا چاہے۔"[3]

---

[1]: عبدالرزاق السنہوری: مصادر الحق فی الشرع الاسلامی۔ جلد ۲ صفحہ ۱۸۴ طبع قاہرہ۔ ۱۹۱۴ء

[2]: حاکم: مستدرک۔ جلد ۲ صفحہ ۸۔ وقال ہذا حدیث صحیح علی شرط الشیخان ولم یخرجاہ

[3]: ابن عابدین: فتاویٰ جلد ۴ صفحہ ۴۴۔ بحوالہ عبدالرزاق السنہوری: مصادر الحق فی الشرع الاسلامی جلد ۲ صفحہ ۱۸۴

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۸ - بعض اوقات کسی ایک کاروباری، یا چند کاروباری افراد کو، بازار کی قوتوں پر غیر معمولی قابو حاصل ہو جاتا ہے - اگر یہ قابو غلط طریقہ سے حاصل کیا گیا ہو تو اس کا حکم واضح ہے۔ لیکن جہاں اس طرح کی طاقت قدرتی عوامل کے نتیجہ میں حاصل ہو جائے وہاں بھی کاروباریوں کو یہ حق نہیں کہ اس طاقت کو اشیاء کے گراں کرنے، یا بے جا نفع اندوزی اور دوسروں کے استحصال کا ذریعہ بنائیں - لاگت سے بہت زیادہ دام لینا، اشیاء کا معیار گرا دینا، صرف نفع اندوزی کی خاطر سماجی ضرورت سے کم مقدار میں مال تیار کرنا، اس قسم کی چند مضرت رساں پالیسیاں ہیں جو عموماً اجارہ داری کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ قانون کی مداخلت سے قطع نظر فرد کی اسلامی ذمہ داریوں اور اس کے مقام بندگی کا تقاضا ہے کہ اپنی کاروباری زندگی میں ہر ایسی پالیسی سے اجتناب کرے جس سے پورے سماج یا اس کے افراد کی ایک معتد بہ تعداد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اگر کسی کاروباری فیصلے کے مضرت رساں اثرات صرف افراد کے ایک گروہ تک محدود ہوں تو کاروباری فرد کو حتی الامکان اپنے فیصلے میں ایسی ترمیم کرنی چاہیے کہ وہ مضر اثرات نہ مرتب کرے - اگر مضرت رساں پہلو کا تعلق پورے سماج یا اس کے افراد کی اکثریت سے ہو تو اسے لازماً ایسے فیصلے سے اجتناب کرنا چاہیے "کیونکہ شریعت ایسے مسائل میں عامۃ الناس کی مصلحت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتی ہے۔ اور مصلحت کا تقاضا ہے کہ فرد واحد (کے مفاد) پر جماعت (کے مفاد) کو ترجیح دی جائے"[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک نظیر اس اصول کی بہت واضح ترجمانی کرتی ہے کہ اگر فرد کے کسی جائز کاروباری عمل سے پورے سماج یا اس کے افراد کی ایک معتد بہ تعداد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اسے ایسے عمل سے بھی باز رہنا چاہیے - ایک تاجر نے مدینہ میں

---

[1] : امام نووی : شرح مسلم - کتاب البیوع - باب تحریم تلقی الجلب - نیز ملاحظہ ہو : الموافقات للشاطبی - جلد ۲ صفحات ۳۴۹ تا ۳۶۳

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہت سے گھوڑے رکھنے شروع کیے۔ حضرت عمرؓ نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ لوگوں نے اس کی سفارش کی تو آپؓ نے فرمایا کہ میں صرف اس شرط پر اسے کاروبار کی اجازت دے سکتا ہوں کہ اپنے گھوڑوں کے لیے چارا مدینہ کے باہر سے حاصل کرے۔ چنانچہ اس شخص نے یمن سے چارہ منگوانے کا اہتمام کیا۔[۵] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے جائز کاروباری عمل میں جو مداخلت کی اس کا منشا غالباً یہ تھا کہ مدینہ کے بازار سے اگر یہ شخص بڑی مقداروں میں چارہ خریدے گا تو اس کا نرخ چڑھ جائے گا اور مجاہدین اور عام افراد کو تکلیف پہنچے گی۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ اسلام کے اس اصول کے مطابق ہے کہ اجتماع کے مصالح کو فرد کے مصالح پر ترجیح دی جانی چاہیے اور اجتماع کو انفرادی اعمال کے مضرت رساں اثرات سے بچانے کے لیے انفرادی اعمال کو مناسب حدود کا پابند بنانا چاہیے۔ آج کے صنعتی دور میں اس اہم اصول کے تقاضے بہت دُوررس ہیں۔ بعض اوقات کسی کاروباری کو ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں جن سے ہزاروں مزدوروں کی یکایک بے روزگاری لازم آتی ہے۔ بعض فیصلے عام صارفین کے مفاد کو مجروح کرتے ہیں اور بعض کا اثر دوسرے کاروباری افراد پر بُرا پڑتا ہے۔ ایک مسلمان کاروباری کو حتی الامکان اس طرح کے مضرت رساں فیصلوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اگر اس طرح کے بعض مضر اثرات اس کے کاروبار اور ملک کی عام معاشی سرگرمیوں کی بقا اور ترقی کے لیے ناگزیر ہوں تو اُسے دوسرے افراد، سماجی اداروں اور ریاست سے تعاون کرتے ہوئے ان اثرات کی تلافی کی تدابیر کرنی چاہییں۔ اس وقت ہمارے حدودِ بحث اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کر سکیں۔

ہم صرف اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ مال و املاک کے نفع آور استعمال کا حق دینے کے ساتھ ہی اسلام نفع آور کاروبار کو ایسے حدود کا پابند بناتا ہے جو دوسرے افراد اور اجتماع کے مفادات کا تحفظ عمل میں لائیں۔ اس سلسلہ میں بعض متعلق ضوابط فقہ کی کتابوں میں مل سکتے ہیں۔ لیکن دورِ جدید کی ضروریات کے پیشِ نظر تفصیلی ضابطہ بندی کے لیے قرآن و سنت

---

[۵]: تاریخ طبری۔ حوادث ۲۳ھ۔ صفحہ ۲۷۵۰-۲۷۵۶۔ مطبع بریل لندن۔ ۱۸۹۳ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے دیے ہوئے اصولوں، خلافتِ راشدہ کی نظیروں اور فقہائے اسلام کی رایوں کی مدد سے از سرِ نو قانون سازی ناگزیر ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مقصد ــــ ازالۂ ضرر ــــ اسی حد تک حاصل کیا جا سکتا ہے جس حد تک کہ انسان کی سماجی زندگی میں اس کا حصول ممکن ہو۔ بعض کاروباری اعمال بعض مضر اثرات کے پہلو بہ پہلو بہت سے مفید اثرات بھی مرتب کرتے ہیں۔ کسی متعین صورتِ حال میں کوئی قطعی رائے مفاسد اور مصالح کا باہم موازنہ کرنے کے بعد ہی قائم کی جا سکتی ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ حتی الامکان مفاسد کا ازالہ کیا جائے۔ ایسا کرنے کے لیے انفرادی یا ضمنی مصالح کی قربانی گوارا کی جائے۔ البتہ جہاں بڑے بڑے مصالح کا سوال درپیش ہو وہاں چھوٹے چھوٹے مفاسد کو گوارا ہی کرنا ہوگا۔

(ج) حقِّ انتقالِ ملکیّت کے حدود

انتقالِ ملکیت کے حق پر بھی وہی عمومی پابندیاں عائد کی گئی ہیں جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ انتقالِ ملکیت کا منشا کسی دوسرے فرد کو نقصان پہنچانا نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی ملکیت کے انتقال میں ایسی بے تدبیری اور ناعاقبت اندیشی نہ برتنی چاہیے جو اسراف اور تبذیر کے ہم معنی ہو۔ اگر کوئی مالک انتقالِ ملکیت میں مسلسل سوءِ تدبیر اور ناعاقبت اندیشی کا مظاہرہ کرے تو اسے "سفیہ" (نادان) قرار دے کر اس کے حقِ انتقالِ ملکیت پر پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔[۵]

حقِ انتقالِ ملکیت کے مضرت رساں استعمال سے تحفظ کے لیے اسلام نے شریکِ جائداد اور پڑوسی کو شفعہ کا حق دیا ہے۔ اس حق کی رُو سے شریک یا پڑوسی زیرِ فروخت جائداد کو خریدنے کا اوّلین مستحق قرار پاتا ہے۔ وہ اپنے اس حق کو استعمال کر کے اپنے پڑوس میں ناپسندیدہ افراد کے آباد ہونے کی بلا سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ کسی فرد کو اپنی

۵: ملاحظہ ہو بارھویں باب میں حجر کی بحث۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائداد سے متصل قطعہ جائداد حاصل کر لینے سے بہت سے ایسے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو اُسے کسی دوسری جائداد سے نہیں حاصل ہو سکتے۔ یہ متصل جائداد اس فرد کے لیے جتنی افادیت کی حامل ہوتی ہے، دوسرے افراد کے لیے اتنی مفید نہیں ہوتی۔ اُس فرد کو خریداری میں ترجیح دے کر اسلام نے اس کے انفرادی مفاد کے تحفظ کے ساتھ سماج کو حاصل ہونے والے مجموعی مفاد میں بھی اضافہ چاہا ہے۔

اوپر ہم یہ بتا چکے ہیں کہ حقِ وصیت کو ترکے کے تہائی حصّہ تک محدود کر دینے کی بڑی غرض یہ ہے کہ مالک دانستہ اپنے جائز ورثاء کی حق تلفی نہ کر سکے۔ اسی قسم کی مضرّت کا سدِّ باب کرنے کے لیے مالک کو بسترِ مرگ پر ہبتہ کرنے یا برائے نام معاوضہ پر انتقالِ ملکیت کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ بسترِ مرگ پر کیا جانے والا ہبتہ وصیت قرار پائے گا اور صرف ایک تہائی ترکہ پر نافذ ہو سکے گا۔

(د) حقِ تحفّظ کے حدود

حقوقِ ملکیت میں سے آخری حق ملکیت کے تحفّظ، اور دوسروں کو اس میں مداخلت سے روکنے کا حق ہے۔ لیکن مالک کو یہ حق نہیں حاصل ہے کہ جن لوگوں کو جس حد تک اس کی ملکیت سے استفادہ کا حق شرعًا حاصل ہے ان کو بھی وہ مداخلت سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ کسی فرد کی ملکیت میں دوسرے افراد اور اداروں کو بہت سے اخلاقی اور قانونی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ مالک کو چاہیے کہ ان حقوق کو حسبِ مراتب راضی خوشی ادا کرے۔ حقِ تحفّظ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مالک ٹیکس وصول کرنے والوں، حقِ انتفاق رکھنے والوں، یا دوسرے حق داروں کو اپنا حق حاصل کرنے سے روکے۔

ہر مالک کو اپنے اور اپنے متعلّقین کی آئندہ ضروریات کے لیے، اور اپنے ورثاء کی خاطر، مال جمع کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن یہ حق بھی حدِّ اعتدال کے اندر ہی استعمال کیا جانا چاہیے۔ اسلام کسی مالک کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اپنی دولت کو خزانوں کی شکل میں جمع کر کے گردش سے روک دے، اور اسے اپنی اور دوسرے افرادِ اجتماع کی ضروریات پر

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خرچ کرنے سے گریز کرے۔

اسلام کی نظر میں بخل اسراف سے کم بُرا نہیں۔ بلکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرض زیادہ گہرا ہے اور انسان میں بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ بے رحمی، بے مروّتی، کم ظرفی، اور بدسلوکی ایک بخیل طبیعت سے اسی طرح وابستہ رہتی ہے جس طرح کہ حرص و طمع، تنگ نظری اور کم ہمتی وغیرہ۔ بخل کی روش ایک طرف تو فرد کے اپنے مادّی اور اخلاقی اور رُوحانی مفادات کو مجروح کرتی ہے اور دوسری طرف افراد اور اجتماع کو کتنے ہی فوائد سے محروم رکھتی ہے۔ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ سماج میں صرف کا رجحان کم ہونے سے زر کی گردش اور اشیا کی پیدائش پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ رجحان صرف کی کمی بالآخر قومی آمدنی کی سطح، روزگار، اور پورے نظام معیشت پر بُرا اثر مرتّب کرتی ہے۔

جس طرح اسراف و تبذیر بے موقع خرچ کرنے اور موقع اور حیثیت سے زیادہ خرچ کرنے کا نام ہے اسی طرح بخل موقع پر نہ خرچ کرنے اور موقع اور حیثیت کے تقاضے سے کم خرچ کرنے کا نام ہے۔ خرچ کے مناسب مواقع میں جس طرح ذاتی ضروریات اور متعلقین کی ضروریات، اور ضروریات کے ماسوا اعتدال کے ساتھ سہولت و آرام اور جمال آفرینی اور زینت کا اہتمام شامل ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر فی سبیل اللہ کاموں میں مال کا انفاق، اہلِ حاجت کی حاجت روائی اور اجتماعی فلاح و بہبود کے مختلف کاموں پر مال صرف کرنا بھی شامل ہے۔ مال رکھتے ہوئے صرفِ مال کے ان مواقع پر خرچ نہ کرنا بخل ہے جو اسلام کو سخت ناپسند ہے۔ اگلے باب میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ انفاقِ مال اور اہلِ حاجت کی حاجت روائی کے سلسلہ میں مالک کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ جو لوگ اپنے طبعی بخل کے سبب ان ذمہ داریوں سے کتراتے ہیں وہ خدا کی دی ہوئی برکتوں سے خود بھی محروم رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی محروم کرتے ہیں۔ یہ انتہائی بُرے لوگ ہیں۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لَّهُمْ - بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ - سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (آل عمران : ۱۸۰)

وہ لوگ جو ان چیزوں میں (سے خرچ کرنے میں) بخل سے کام لیتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کی ہیں یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ ایسا کرنا ان کے حق میں اچھا ہو گا ، بلکہ یہ بات ان کے لیے بہت بری ہے - قیامت کے دن وہ چیزیں جن (کے خرچ کرنے) میں یہ بخل سے کام لیتے ہیں طوق بنا کر انہیں پہنا دی جائیں گی -

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ - (الحدید : ۲۴)

اللہ گھمنڈی شیخی بگھارنے والوں کو پسند نہیں کرتا - جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کرنے کی تلقین کرتے ہیں -

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا - (الاسراء : ۲۹)

نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ -

مومن بخیل نہیں ہو سکتا :

عن ابی سعید الخدری عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : خصلتان لا یجتمعان فی مؤمن ، البخل وسوء الخلق ۔[1]

ابو سعید خدری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا : " دو خصلتیں ایسی ہیں جو مرد مومن میں کبھی جمع نہیں ہو سکتیں : بخل اور بد خلقی "

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ کسی بندہ کے دل میں بخل اور ایمان دونوں ایک ساتھ نہیں پائے جا سکتے - مال بلا ضرورت جمع کرنے کے لیے نہیں دیا گیا ہے ، اچھا مالدار وہ ہے جو اپنے مال کو اچھے کاموں پر صرف کرے -

---

[1] : بخاری : الادب المفرد - صفحہ ۴۳

[2] : ایضاً

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عن ابن مسعود قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا حسد الا فی اثنتین : رجل اتاہ اللہ مالاً فسلّط علی ھلکتہ فی الحق و رجل اتاہ اللہ حکمۃً فھو یقضی بھا و یعلّمھا۔[1]

ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی سے رشک کرنا ٹھیک نہیں، بجز دو آدمیوں کے، ایک وہ جسے اللہ نے مال عطا کیا اور اس مال کو حق کے مطابق خرچ کرنے کی توفیق دی، اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے حکمت سکھائی تو وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔"

ذاتی صرف کے باب میں اسراف اور تبذیر سے ضرور بچنا چاہیے لیکن دوسری انتہا پر پہنچ کر خود کو اللہ کی دی ہوئی پاکیزہ چیزوں سے محروم کر لینا بھی درست نہیں۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ (الاعراف : ۳۲)

پوچھیے کہ اللہ کی اس زینت کو جسے اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا، اور پاکیزہ روزی کو کس نے حرام قرار دیا۔

جس کو اللہ نے مال دیا ہوا سے اپنے رہن سہن، پوشاک اور غذا میں فراخ دستی سے کام لینا چاہیے، کیونکہ:

ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ۔[2]

اللہ چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر دیکھا جا سکے۔

اس مضمون کی تائید سورۂ اسراء کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جو ہم اوپر نقل کر چکے

---

[1]: بخاری: کتاب الزکوٰۃ۔ باب انفاق المال فی حقہ نیز کتاب الاحکام۔ باب اجر من قضی بالحکمۃ۔ اس دوسری روایت میں اثنین کی جگہ اثنتین کا لفظ آیا ہے یعنی صرف دو خصلتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں رشک کرنا ٹھیک ہے۔

[2]: مسند امام احمد جلد ۱، حدیث نمبر ۶۷۰۸ مرتبہ احمد محمد شاکر۔ نیز ترمذی: کتاب الاستئذان و الآداب باب ما جاء ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ۔ و قال ھذا حدیث حسن

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ نیز یہ بات کہ ہر فرد کو اپنی مالی حیثیت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے، ذیل کی آیت سے بھی سامنے آتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذَالِكَ قَوَامًا۔ (الفرقان: ۶۷)

(اللہ کے بندے وہ ہیں) جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کی روش اختیار کرتے ہیں نہ بخل کی، بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل روش اختیار کرتے ہیں۔

روزمرہ اخراجات میں بخل سے کام لینے اور فلاح وبہبود کے کاموں پر مال خرچ کرنے سے گریز کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کیا جائے۔ یہ رجحان اسلام کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے کہ مال کے بڑے بڑے خزانے جمع کیے جائیں، نہ تو انہیں کسی کاروبار میں لگایا جائے نہ اپنے صرف میں لایا جائے اور نہ اہل حاجت کی مدد اور دوسرے فی سبیل اللہ کاموں میں صرف کیا جائے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ نِ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ، يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهٗ أَخْلَدَهٗ۔ (الھمزہ)

تباہی ہے ہر عیب جُو، نکتہ چیں کے لیے جو اپنا مال جمع کرتا اور اسے گن گن کر رکھتا ہے ــــــ گمان کرتا ہے کہ یہ مال اُسے (یعنی اس کے نام کو) سدا زندہ رکھے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ۔ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ۔ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ، فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۔ (توبہ: ۳۵)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کو اس دن کے دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے، جو سونے چاندی کو خزانوں کی شکل میں جمع رکھتے ہیں اور اُسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، جس دن کہ یہ سونا چاندی جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی پیشانیاں اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ (مال و زر) جسے تم نے اپنی ذات کے لیے خزانہ بنا کر رکھا تھا، تو اب خود اسے جمع کر رکھنے کا مزا چکھ لو۔

مختصر یہ کہ مالک کو اپنے مال و املاک کے تحفظ، اور انہیں جمع کر رکھنے کا حق حاصل ہے، لیکن نہ تو تحفظ کے یہ معنی ہیں کہ حقداروں کو اس مال میں سے اپنا حق حاصل کرنے سے روکا جائے، اور نہ جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سماج کو خدا داد نعمتوں سے محروم کیا جائے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھٹا باب

مالک کی ذمّہ داریاں

حقوقِ ملکیّت کے جن حدُود کا مطالعہ گذشتہ باب میں کیا گیا ہے ان کی نوعیّت زیادہ تر سلبی ہے۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ مالک کو اپنی ملکیّت سے استفادہ میں کن حدُود کے اندر رہنا چاہیے۔ ان کا منشا یہ ہے کہ خود مالک کے حقیقی مفادات اور پھر پورے سماج کے مفادات کو انفرادی حقوقِ ملکیّت کے غیر معتدل استعمال سے مجروح ہونے سے بچایا جائے۔ ان حدود کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ حقوقِ ملکیت اپنے اصل کے تابع رہیں، ان سے ہٹ کر دوسرے اغراض کے تابع نہ ہو جائیں لیکن سماجی مصالح کا تحفّظ اور مقاصدِ ملکیّت کا حصول صرف حدود و قیود عائد کرنے سے نہیں ہو سکتا، ضروری ہے کہ مالک پر اس سلسلہ میں کچھ مثبت ذمّہ داریاں بھی عائد کی جائیں۔ اس باب میں ہم ان ذمّہ داریوں کا مطالعہ کریں گے جو اسلام نے ہر مالک پر اس کے ذاتی مال و املاک کے سلسلہ میں عائد کی ہیں۔ اس مطالعہ کے دوران وہ اصول سامنے رکھنے چاہئیں جن کا ذکر ہم نے اسلامی فلسفۂ شریعت پر بحث کرتے وقت حقوق اور فرائض کے باہمی تعلّق کے ضمن میں کیا ہے۔

یہ ذمّہ داریاں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو اپنی ملک سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلق رکھتی ہیں۔ دوسری طرح کی ذمہ داریاں وہ ہیں جو مالک کی اپنی ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس پر لازم ہے کہ اپنی ملکیت سے استفادہ کرتے ہُوئے اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرے۔ اور زندگی کے صالح مقاصد کا حصول عمل میں لائے۔ مالک کی ذمہ داریوں کے اس پہلو کی طرف گذشتہ مباحث میں اشارے کیے جا چکے ہیں۔ مزید تفصیل غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ خود انسانی طبیعت میں اس طرف شدید میلان پایا جاتا ہے۔ شریعت نے ان اُمُور کی طرف تفصیلی توجہ نہیں کی ہے۔ جن کی انجام دہی کے بہت قوی محرّکات خود انسانی طبیعت میں موجود ہیں۔ تاریخِ انسانی یہ بتاتی ہے کہ مال و املاک رکھنے والوں کو خود اپنی اغراض کی تکمیل کی خاطر اپنی ملکیّت کے استعمال پر آمادہ کرنے کے لیے کسی خارجی دباؤ یا حکم کی ضرورت نہیں۔

خدا نے مختلف انسانوں کو مختلف صلاحیتوں کا حامل بنایا ہے۔ استعداد کے اس اختلاف کے پہلو بہ پہلو سماجی زندگی میں مختلف افراد کو سعی و عمل کے جو مواقع ملتے ہیں وُہ بھی یکساں نہیں ہوتے۔ نہ صرف یہ کہ افراد جسمانی قوّت، ذہنی استعداد، اور شخصیت کے دوسرے ظاہری اور باطنی اوصاف کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں بلکہ دولت کمانے کے سلسلہ میں ہر ایک کو ایک مختلف نقطۂ آغاز بھی ملتا ہے۔ اس صورتِ حال کے لازمی نتیجہ کے طور پر سماج کے افراد میں مال و املاک کے اعتبار سے کامل مساوات کبھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ استعداد اور مواقع میں عظیم تفاوت ملکیّت کے باب میں بھی زبردست تفاوت پیدا کرتا ہے۔ کچھ لوگ پیدائشی معذور ہوتے ہیں، اور عین ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ مفلس و محتاج رہیں۔ کچھ دوسرے افراد اتنی کم صلاحیتیں رکھتے ہیں کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق مال نہیں کما سکتے۔ اسی طرح مواقع کا اختلاف اور حالات کا ردّ و بدل لوگوں کو عارضی یا مستقل احتیاج و تنگ دستی میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔ پس سماج میں اہلِ حاجت کا وجود ایک ناقابلِ انکار دائمی حقیقت ہے۔ ان کی حاجت روائی کی عملی شکل یہ ہے کہ اصحابِ استطاعت اپنے ذاتی مال کا ایک حصّہ ان افراد کے حوالہ کر دیں یا ایسے سماجی اداروں کے سپرد کر دیں جو ان افراد کی حاجت روائی کا اہتمام کریں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہلِ حاجت کی حاجت روائی کے علاوہ اجتماعی فلاح و بہبود کے بہت سے دوسرے کام بھی ہیں جو سارے افراد سے کم و بیش یکساں تعلق رکھتے ہیں لیکن کسی ایک فرد سے براہِ راست ایسا تعلق نہیں رکھتے کہ وہ ان کا اہتمام کرے اور متعلقہ مصارف کو خود برداشت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اکثر اجتماعی کاموں کے مالی تقاضے اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا کسی ایک فرد کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ یہ اجتماعی امور اسی وقت انجام پا سکتے ہیں جب افراد اپنے مال کا ایک حصّہ ان کاموں کے لیے وقف کر دیں۔

پہلے باب میں اسلام کے نظریۂ کائنات و حیات اور نظریۂ اجتماع سے تصورِ ملکیت کے بارے میں جو کلیّات اخذ کیے گئے ہیں ان کی رُو سے افراد کے لیے ایسا کرنا لازمی ہے۔ مالکانہ حقوق کا اصل منشا خاندانِ انسانی کی کفالت ہے۔ کسی مالک کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ میرا مال صرف میرا مال ہے۔ میں اس میں کسی دوسرے کا کوئی حق نہیں تسلیم کرتا۔ اسلام کے نزدیک ان معنی میں کوئی مال "میرا مال" نہیں قرار پا سکتا۔

اس اصولی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر مالک کیلئے جو اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے بعد بھی صاحب مال و املاک باقی رہے، دوسرے افراد کی حاجات کی تکمیل اور اجتماعی کاموں کی انجام دہی کے لیے اپنے مال کا ایک حصّہ خرچ کرنا ضروری ہے۔ اب ہم قرآن و سنت کے نصوص کی روشنی میں مالک کی اس ذمہ داری کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

قرآن کریم مسلمان کی ایک لازمی صفت یہ بیان کرتا ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (المعارج: ۲۴-۲۵)

اور وہ لوگ جن کے اموال میں سائل اور محتاج کے لیے ایک مقررہ حق ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (ذاریات: ۱۹)

اور ان کے اموال میں سائل اور محتاج کا ایک حق ہے۔

مالکِ حقیقی نے ہر مالک کو حکم دیا ہے کہ:

اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ۔ (الحدید: ۷)

جس مال میں سے کچھ (خدا کی راہ میں) خرچ کرو جو اس نے تمہارے ہاتھ میں (اپنا)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نائب بنا کر دیا ہے۔

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ (انعام: ۱۴۱)

جب وہ پھل لائے تو اس کا پھل کھاؤ، اور فصل کٹنے کے دن اس کا حق ادا کر دو۔

وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (توبہ: ۴۱)

اپنے مال اور جان کے ذریعہ خدا کی راہ میں جدّوجہد کرو۔

ان آیات سے واضح طور پر یہ اصول متعیّن ہوتا ہے کہ ہر مالک کے مال میں دوسرے افراد کا بھی کچھ حق ہے، اور یہ کہ ہر مالک کو اپنے مال میں سے ایک حصّہ خدا کی راہ میں بھی خرچ کرنا چاہیے۔ یہ ایک عام اصول ہے جس کے تحت شریعت نے بعض متعیّن ضابطے بھی دیے ہیں۔ ذیل میں ہم ان ضابطوں کا مطالعہ اہمیّتوں کی ترتیب کے لحاظ سے کریں گے۔ یہ متعیّن ذمّہ داریاں یہ ہیں:

ا۔ نفقاتِ واجبہ۔

ب۔ فریضۂ زکوٰۃ۔

ج۔ مزید انفاقِ مال کی ذمّہ داری، بالخصوص مضطرّ سائل اور مہمان کا حق۔

د۔ قرض و عاریت۔

ھ۔ حقوقِ انفاق۔

ا۔ نفقاتِ واجبہ

اسلامی معاشرت میں خاندان کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کا ذکر وراثت کی بحث میں کیا جاچکا ہے۔ فطری طور پر اپنی ذات کے بعد فرد پر جن اہلِ حاجت کی حاجت روائی کی ذمّہ داری عائد ہوتی ہے وہ اس کے اہلِ خاندان ہیں۔ سماج کے عام اہلِ حاجت کی بہ نسبت ان افراد کا حق زیادہ واضح اور متعیّن ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے کہ خود ہر فرد اپنے خاندان والوں سے مختلف فائدے اُٹھاتا ہے۔ اس کے والدین بچپن میں اس کی کفالت اور پرورش کرتے ہیں۔ اولاد ضعیفی میں سہارا دیتی ہے۔ دوسرے اعزہ وقت ضرورت پر اس کی مدد کرتے ہیں، اُن پر اس کی حاجت روائی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور ضابطۂ میراث اسے ان سب کے، یا ان میں سے بعض سے ورثہ پانے کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اسی لیے شریعت نے ہر فرد پر "نفقاتِ واجبہ" کی شکل میں حاجت مند افراد خاندان کی حاجت روائی، اور کچھ اہلِ خاندان کی ہر حالت میں کفالت کی قانونی ذمہ داریاں عائد کی ہیں جن کو ہم ذیل میں مختصراً بیان کریں گے۔

اس اصول کی صراحت ذیل کی آیات و احادیث میں کی گئی ہے:

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ (البقرہ: ۲۳۳)

جو ماں باپ، چاہتے ہوں کہ اُن کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے، نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ اور یہی ذمہ داری وارث پر بھی عائد ہوتی ہے۔

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (اسراء: ۲۳)

تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۔ (لقمان: ۱۵)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے ۔۔۔۔۔۔ اور دنیا میں ان دونوں کے ساتھ معروف کے مطابق بھلا برتاؤ کرو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من اطیب ما اکل الرجل من کسبه و ولده من کسبه ۔[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدمی کے لیے سب سے اچھی خوراک اپنی کمائی میں سے کھانا ہے اور اس کا بیٹا اس کی کمائی میں داخل ہے۔

عن عائشة عن النبی صلی اللہ علیه وسلم انه قال: ولد الرجل من کسبه من اطیب کسبه فکلوا من اموالهم ۔[۲]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا: آدمی کی اولاد اس کی کمائی میں داخل ہے، اور اس کا شمار اس کی سب سے پاکیزہ کمائی میں ہے لہذا تم ان (اولاد) کے مال میں سے کھاؤ۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان رجلا اتی النبی صلی اللہ علیه وسلم فقال یا رسول اللہ ان لی مالا و ولدا و ان والدی یحتاج مالی قال انت و مالك لوالدك ان اولادکم من اطیب کسبکم فکلوا من کسب اولادکم ۔[۳]

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے یہ کہا کہ اے اللہ کے رسول میرے پاس کچھ مال ہے اور میرے اولاد بھی ہے، اور میرے باپ کو میرے مال کی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لیے ہے۔ تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ ترین کمائی میں داخل ہے لہذا تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھا سکتے ہو۔

---

[۱] : ابوداؤد: کتاب البیوع : باب الرجل یاکل من مال ولده ۔ عن عائشہ رض۔

[۲] : ایضاً

[۳] : ابوداؤد: کتاب البیوع : باب الرجل یاکل من مال ولده

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عن عائشة ان هند بن عتبه قالت یا رسول الله ان ابا سفیان رجل شحیح ولیس یعطینی ما یکفینی و ولدی الا ما اخذت منه وهو لا یعلم فقال خذی ما یکفیك وولدك بالمعروف[1]۔

حضرت عائشہ رضی سے مروی ہے کہ ہند بن عتبہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول (میرا شوہر) ابوسفیان بخیل آدمی ہے وہ مجھے میرے اور میرے بچوں کے لیے بقدرِ کفایت مال نہیں دیتا، الا یہ کہ میں اس کے جانے بغیر اس (کے مال) میں سے نکال لوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ معروف کے مطابق اتنا نکال لیا کرو جو تیرے اور تیرے بچوں کے لیے کافی ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ بھی فرمایا تھا کہ:

فاتقوا الله فی نساءکم فانکم اخذتموهن بامان الله واستحللتم فروجهن بکلمة الله .... ولهن علیکم رزقهن وکسوتهن بالمعروف[2]۔

پس اپنی عورتوں (کے ساتھ برتاؤ) کے سلسلہ میں اللہ سے ڈرو کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امان کے تحت لیا ہے، اور اللہ کے فرمان کے تحت ان کی شرمگاہوں کو اپنے لیے حلال کیا ہے ...... اور تم پر معروف کے مطابق ان کو کھلانا اور پہنانا فرض ہے۔

پہلی آیت سے یہ حکم نکلتا ہے کہ شوہر پر اپنی بیوی کو عرفِ عام کے مطابق کھلانا پلانا اور پہنانا فرض ہے۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ باپ پر اپنے بچوں کی کفالت فرض ہے کیونکہ بیوی کا نفقہ فرض کرتے وقت ایک سبب کے طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ اس کے بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ آیت کے آخری ٹکڑے سے فقہاء کی ایک جماعت نے یہ حکم اخذ کیا ہے کہ بشرطِ ضرورت ہر وارث پر اپنے مورث کا نفقہ واجب ہے۔ دوسرے فقہاء اس کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر باپ مر جائے تو اس کے ورثاء پر بچہ کو

---

[1] : بخاری: کتاب النفقات۔ باب اذا لم ینفق فللمرأة ان تاخذ .... الخ

[2] : مسلم: کتاب الحج۔ باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دودھ پلانے والی ماں کا نفقہ واجب ہے۔

بعد کی دو آیتوں میں ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے ساتھ معروف کے مطابق برتاؤ فرض قرار دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ نادار والدین کی کفالت حسنِ سلوک اور معروف برتاؤ کا پہلا تقاضا ہے۔

پہلی تین حدیثوں سے لڑکے کے مال میں باپ کا حق اور آخری حدیث سے شوہر کے ذمہ بیوی کا نفقہ واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چوتھی حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اولاد اور بیوی کا نفقہ آدمی کے مال میں واجب ہے اور اس کی مرضی کے بغیر بھی وصول کیا جا سکتا ہے۔

ان آیات، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور عملی نظائر سے نفقاتِ واجبہ کے باب میں فقہائے اسلام نے جو اصول اخذ کیے ہیں ان کا ذیل میں مختصراً ذکر کیا جائے گا۔ فقہاء کے درمیان تفصیلات میں جو اختلاف ہے اس کے مطالعہ کے لیے اور ہر مکتبِ فقہ کے استدلال کے جائزہ کے لیے مختلف مستند مراجع کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے جن میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ بھی کر دیا گیا ہے[۱]۔

زوجہ (بیوی) کا نفقہ :

تمام مکاتبِ فقہ اس بات پر متفق ہیں کہ شوہر پر اپنی بیوی کا نفقہ واجب ہے۔ وہ عورت

---

[۱] : چاروں مکاتبِ فقہ کی رایوں کے مطالعہ اور مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو :

احمد ابراہیم ابراہیم : نظام النفقات فی الشریعۃ الاسلامیہ مطبع سلفیہ۔ قاہرہ ۱۳۴۹ھ

عبدالرحمٰن الجزیری : الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۴ کتاب الطلاق۔ مباحث النفقات۔

حنفی مکتبِ فقہ کے لیے : بدائع الصنائع جلد ۴ صفحہ ۱۵ تا ۴۰

مالکی مکتبِ فقہ کے لیے : المدونۃ الکبری جلد ۲ صفحہ ۱۹۲/۱۹۴ اور الشرح الصغیر لاحمد الدردیر جلد ۱ صفحہ ۴۸۰/۴۸۹

شافعی مکتبِ فقہ کے لیے امام نووی : المنہاج۔ کتاب النفقات۔ اور شہاب الدین احمد الرملی : نہایۃ المحتاج فی شرح المنہاج۔ کتاب النفقات جلد ۲۔ ص ۴۴ تا ۷۶۔ طبع مصر سنہ طبع ندارد

حنبلی مسلک کے لیے : ابنِ قدامہ : المغنی۔ جلد ۹ کتاب النفقہ۔ صفحات ۲۳۰ تا ۲۹۶

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا عورتیں جن سے کسی فرد کا معاہدۂ نکاح کے ذریعہ تعلق قائم ہو ان کی پوری کفالت اس فرد کے ذمہ قانوناً واجب ہے۔ خواہ عورت مالدار ہو یا غریب۔ کفالت کی تفصیلات کی تعیین عورت کی ضروریات، اس کے سابق معیارِ زندگی، عرفِ عام، اور شوہر کی مالی حالت کو سامنے رکھ کر کی جائے گی[۵۱]۔ اگر شوہر نادار ہو تو بھی اس کے ذمہ بیوی کا نفقہ واجب ہوگا، البتہ اس سے ناداری کی حالت میں اس کا مطالبہ نہیں کیا جا سکے گا بلکہ وہ رقم اس کے ذمہ قرض سمجھی جائے گی جسے فراخی ہونے پر وصول کیا جا سکے گا۔

ماں باپ اور اولاد کا نفقہ:

اس بات پر بھی تمام مکاتبِ فقہ متفق ہیں کہ ہر فرد پر اپنے نادار ماں باپ، نادار نابالغ اولاد اور کسبِ معاش سے معذور نادار بالغ اولاد کا نفقہ واجب[۵۲] ہے۔ اس بالغ بیٹی کا نفقہ بھی واجب ہے جو غیر شادی شدہ ہو یا بیوہ یا مطلقہ ہونے کی وجہ سے باپ کے گھر واپس آ گئی ہو۔ البتہ یہ نفقہ اسی صورت میں واجب ہوگا جب یہ فرد نادار نہ ہو بلکہ اپنی ضرورت سے فاضل مال رکھتا ہو۔ اس نفقہ کی فراہمی کے لیے اس فرد کو کسبِ مال پر نہیں مجبور کیا جا سکتا۔ نہ یہ قرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نفقہ کی مقدار ضروریاتِ زندگی اور عرفِ عام کے اعتبار سے متعین کی جائے گی۔ جن چیزوں کا اہتمام ضروری ہے ان میں مکان، لباس اور غذا شامل ہیں۔

---

[۵۱]: اس کے بارے میں تین رائیں ہیں۔ پہلی یہ کہ نفقہ کی مقدار کی تعیین میں صرف شوہر کی مالی حیثیت کا لحاظ کیا جائے گا۔ سرخسی، کاسانی اور شامی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں کی مالی حالت کا لحاظ رکھا جائے گا۔ یہ رائے امام مالک کی ہے اور حنفی فقہاء میں سے خصاف اور مصنفِ ہدایہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ احناف اسی رائے پر عمل کرتے ہیں۔ تیسری رائے یہ ہے کہ صرف عورت کی مالی حالت کا لحاظ کیا جائے گا۔ یہ رائے شاذ ہے۔ (نظام النفقات، صفحہ ۱۹)

[۵۲]: امام شعبی کی طرف یہ رائے منسوب کی گئی ہے کہ ان اعزہ کا نفقہ بھی واجب نہیں مندوب ہے۔ (نظام النفقات صفحہ ۴۷)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ :

امام مالک کے نزدیک فرد پر ماں باپ کے علاوہ کسی دوسرے رشتہ دار کا نفقہ واجب نہیں ہے[51]۔ امام شافعی کے نزدیک ماں باپ کی طرح دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ کا اور اولاد کی طرح پوتے، پوتی، نواسے، نواسی وغیرہ رشتہ داروں کا بھی، جو فرد کے اصول اور فروع میں داخل ہوں، نفقہ واجب ہے[52]۔ امام احمد کے نزدیک ان رشتہ داروں کے علاوہ فرد پر ہر اس رشتہ دار کا نفقہ واجب ہے جس کے مرنے پر وہ اس کا وارث ہو سکتا ہو[53]۔ امام احمد نے اس رائے کے حق میں قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت پیش کی ہے جس میں "وعلی الوارث مثل ذالک" کہہ کر وراثت کو نفقہ کے وجوب کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اس طور پر امام احمد کے نزدیک ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی، پوتے نواسے وغیرہ صُلبی رشتہ داروں کے علاوہ بھائی، بہن، چچازاد بہن، پھوپھی، بھتیجی وغیرہ کا نفقہ بھی واجب ہو سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک مذکورہ بالا صُلبی رشتہ داروں کے علاوہ صرف ان اعزہ کا نفقہ واجب ہو گا جن سے فرد کوئی رحمی قرابت رکھتا ہو اور جن کا وہ محرم ہو۔ اس رائے کے مطابق چچازاد بھائی کا نفقہ نہیں واجب ہو گا، اگرچہ اس کے مرنے پر یہ فرد اس کا وارث ہو سکتا ہے۔ امام صاحب کے نزدیک اصول (دادا، نانا) اور فروع (پوتا، نواسہ) کے علاوہ باقی رشتہ داروں کے درمیان نفقہ کا مدار رحمی قرابت پر ہے نہ کہ وراثت پر[54]۔

اس اصول پر تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ بیوی کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ کسی فرد پر اسی صورت میں واجب ہے جب وہ فرد خود اپنی ضرورت سے زائد مال رکھتا ہو اور یہ رشتہ دار نادار اور محتاج ہوں۔

---

[51] : احمد الدردیر : الشرح الصغیر جلد ۱ صفحہ ۴۸۸ - ۴۸۹ اور نظام النفقات صفحہ ۴۷

[52] : نظام النفقات صفحہ ۵۰

[53] : ایضاً صفحہ ۵۹، نیز المغنی جلد ۹ صفحہ ۲۶۴ - ۲۷۱

[54] : ایضاً صفحہ ۶۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب ایک نادار فرد کے نفقہ کے متعدد ذمّہ دار موجود ہوں تو یہ ذمہ داری ان کے درمیان کس طرح تقسیم کی جائے، اس کے بارے میں فقہا کے درمیان خاصا اختلاف ہے[۵۱]۔ ہمارے نزدیک قابلِ ترجیح رائے وہ ہے جو کاسانی نے بدائع الصنائع میں اختیار کی ہے، یعنی ہر محتاج فرد کی کفالت کی ذمّہ داری اس کے وارثوں پر ان کے حصّۂ وراثت کی نسبت سے تقسیم کر دی جائے گی۔ یہی رائے امام احمد کی بھی ہے[۵۲]۔

اگر نادار باپ کا لڑکا موجود ہو، یا نادار لڑکے کا باپ موجود ہو تو ان کا نفقہ تمام تر لڑکے یا باپ کے ذمّہ ہوگا، اور رشتہ داروں کے ذمّہ نہیں ہوگا[۵۳]۔

ب ۔ فریضۂ زکوٰۃ

نفقاتِ واجبہ کا تعلق صرف ان افراد سے ہے جو فرد کے خاندان میں شامل ہیں۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، معاشرہ کے عام اہلِ حاجت کی کفالت اور اجتماعی امور کی انجام دہی کے سلسلہ میں بھی صاحبِ مال افراد کے لیے کچھ مال خرچ کرنا ضروری ہے۔ یہ سوال کہ کس فرد کے لیے کتنا مال خرچ کرنا ضروری ہے، تو اس کی تعیین ایک طرف سماجی ضروریات اور دوسری طرف انفرادی وسعت اور گنجائش کے لحاظ سے کی جا سکتی ہے۔ سماجی ضروریات حالات کی تبدیلی کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں اور مختلف صاحبِ مال افراد پر ان کی تکمیل کے سلسلہ میں جو ذمّہ داری عائد کی جائے گی وہ ان افراد کی مالی حیثیت کی نسبت سے ہوگی۔ اس اصول سے جو نتائج نکلتے ہیں ان پر غور کرنے سے پہلے انفرادی ذمّہ داری کی اس کم سے کم قانونی حد کا ذکر بھی ضروری ہے جو تمام حالات میں ہر صاحبِ مال فرد کے لیے لازمی قرار دی گئی ہے۔ یہ حد زکوٰۃ ادا کرنے کی ذمّہ داری ہے۔

---

۵۱ : نظام النفقات۔ صفحہ ۶۱ تا ۸۰

۵۲ : 〃 〃 ۔ صفحہ ۶۱

۵۳ : ابن قدامہ : المغنی۔ جلد ۹۔ صفحہ ۲۶۲

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس قانونی فریضہ کی رو سے ذاتی اموال کا ایک حصہ ریاست کو منتقل ہو جاتا ہے اور اجتماعی طور پر اہلِ حاجت کی کفالت اور بعض اہم اجتماعی امور کی انجام دہی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی اس نوعیت کے پیشِ نظر اس کا تفصیلی مطالعہ آٹھویں باب میں کیا جائے گا۔

زکوٰۃ ادا کرنا ہر "صاحبِ نصاب" مالک کا فرض ہے، خواہ عمالِ ریاست اس کا مطالبہ کریں یا نہ کریں۔ زکوٰۃ تقریباً ہر طرح کے مال و املاک پر عائد کی گئی ہے۔ بخاص خاص مستثنیات میں آلاتِ پیدائش مثلاً مشینیں وغیرہ، رہائشی مکانات اور کارخانوں کی عمارتیں وغیرہ، اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں مثلاً فرنیچر، برتن، کپڑے وغیرہ شامل ہیں۔ زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط مال کا "نامی" ہونا بھی ہے، خواہ یہ نمو بالفعل ہو یا بالقوۃ۔ چنانچہ آٹھویں باب میں ان چیزوں کی صراحت کی جائے گی جن پر زکوٰۃ واجب ہے۔

شریعت میں جو اشیاء قابلِ زکوٰۃ ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں[1]:-

۱۔ سونا چاندی، جبکہ وہ سال کے آغاز و اختتام پر بقدرِ نصاب یا اس سے زائد موجود ہوں۔

۲۔ نقد روپیہ، جو سونے چاندی کا قائم مقام ہو۔

۳۔ اموالِ تجارت۔

۴۔ مویشی، جبکہ وہ افزائشِ نسل کے لیے پالے گئے ہوں، اور سال کے آغاز و اختتام پر بقدرِ نصاب موجود ہوں۔

۵۔ زرعی پیداوار، فصل کٹنے کے بعد۔

۶۔ معدنیات اور زمین سے برآمد ہونے والے دفینے۔

نقدی، سونے چاندی، اموالِ تجارت اور کارخانوں کے اموال، نیز بعض حالات میں معدنیات کی زکوٰۃ کی شرح ۲½ فی صدی ہے۔ زمین سے برآمد ہونے والے دفینے کے لیے زکوٰۃ کی شرح ۲۰ فی صدی ہے۔ زرعی پیداوار اگر بارانی زمین سے حاصل کی گئی ہو تو اس کی زکوٰۃ ۱۰ فیصدی ہے اور اگر آبپاشی کے ذریعہ حاصل کی گئی ہو تو ۵ فیصدی ہے۔ مویشی کے لیے زکوٰۃ

---

[1]: تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: سید ابوالاعلیٰ مودودی: رسائل و مسائل جلد ۲ طبع لاہور ۱۹۵۷ء نیز اسی کتاب کا آٹھواں باب۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کی شرح کا بیان تفصیل طلب ہے اور اس کا مطالعہ فقہ کی کسی کتاب میں کیا جا سکتا ہے[1]۔ اگر مویشی تجارت کے لیے ہوں تو ان کی قیمت پر مالِ تجارت کی زکوٰۃ لی جائے گی یعنی ۲½ فی صدی۔

ج۔ مزید انفاقِ مال کی ذمہ داری

زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی مال دار آدمی پر مزید انفاقِ مال کی ذمہ داری باقی رہتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی صراحت فرما دی ہے:

عن فاطمة بنت قيس قالت سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: ان في اموالكم حقًا سوى الزكوٰة[2]۔

فاطمہ بنت قیس سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ "تمہارے اموال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے"۔

یہی روایت ترمذی میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

ان في المال حقًا سوى الزكوٰة[3]۔

"مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے"

عن فاطمة ابنة قيس قالت سألت او سُئل النبي صلى الله عليه وسلم عن الزكوٰة فقال: ان في المال حقًا سوى الزكوٰة۔ ثم تلا هذه الآية التي في البقرة: ليس البر ان تولوا وجوهكم ...... الآية[4]۔

فاطمہ بنتِ قیس سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے زکوٰۃ

[1]: نیز ملاحظہ ہو سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی جلد ۵ صفحات ۱۶۵ تا ۱۶۷، مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۳۵ء

[2]: مسند دارمی: کتاب الزکوٰۃ۔

[3]: ترمذی: کتاب الزکوٰۃ۔ باب ما جاء ان فی المال حقًا سوی الزکوٰۃ۔

[4]: ایضًا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بارے میں دریافت کیا، یا یہ کہا کہ آپ سے دریافت کیا گیا، تو آپ نے فرمایا "مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔" پھر آپ نے سورۂ بقرہ کی یہ آیت تلاوت کی "نیکی اسی کا نام نہیں ہے کہ تم اپنے منہ (مشرق یا مغرب کی طرف) پھیر لو۔۔۔ ۔۔۔ (آخر تک)

رہا یہ سوال کہ اس مزید ذمہ داری کے حدود کیا ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدود اہلِ حاجت کی ضروریات اور اجتماعی کاموں کے مالی تقاضوں سے متعین ہوتے ہیں، مال دار لوگوں پر بحیثیتِ مجموعی اس حد تک مزید انفاقِ مال کی ذمہ داری ہے جس حد تک کہ اہلِ حاجت کی حاجت روائی اور اجتماعی امور کی انجام دہی کے لیے درکار ہو۔ البتہ کسی مخصوص فرد کی ذمہ داری اس کی اپنی مالی حالت کے مطابق ہو گی۔ اصول یہ ہے کہ مزید انفاق کی ذمہ داری کا تعلق ذاتی مال و املاک کے صرف اسی حصہ سے ہے جو فرد کی اپنی ضروریات سے فاضل ہو کوئی آدمی اس بات کا مکلف نہیں کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل ترک کر کے دوسرے اہلِ حاجت کی حاجت روائی پر اپنا مال خرچ کرے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ (البقرہ : ۲۱۹)

اور یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا انفاق کریں۔ کہیے، جو کچھ (تمہاری اپنی ضروریات سے) فاضل ہو۔

البتہ اپنی ضروریات اور اصحابِ حقوق کے حق ادا کرنے کے بعد جو فاضل مال بچ رہے اسے خدا کی راہ میں خرچ کر دینا ہی زیادہ اچھا ہے۔

حدثنا شداد قال سمعت ابا امامة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا ابن آدم، انك ان تبذل الفضل خير لك وان تمسكه شر لك، ولا تلام على كفاف وابدا بمن تعول واليد العليا خير من اليد السفلى[1]

ہم سے شداد نے حدیث بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ابو امامہ کو یہ کہتے سنا ہے

[1] مسلم: کتاب الزکوٰۃ۔ باب بیان الید العلیا خیر من الید السفلی۔۔۔۔، نیز ترمذی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے آدم کے بیٹے تیرے لیے فاضل مال کا (خدا کی راہ میں) خرچ کر دینا بہتر ہے اور اسے روک لینا بُرا ہے۔ اپنی ضروریات کی تکمیل کرنے کی حد تک تجھ پر کوئی ملامت نہیں۔ اور خرچ کرنے میں ابتدا ان لوگوں (پر خرچ کرنے) سے کرو جن کی پرورش تمہارے ذمہ ہو۔ اور دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

عن ابی سعید الخدری قال بینما نحن فی سفر مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ جاء رجلٌ علی راحلة لہ ۔ قال فجعل یصرف بصرہٗ یمینًا و شمالاً فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "من کان معہٗ فضل ظہرٍ فلیعد بہ علی من لا ظہر لہٗ ومن کان معہٗ فضل زادٍ فلیعد بہ علی من لا زاد لہٗ"

قال: فذکر اصنافًا من المال ما ذکر حتّٰی رأینا انّہ لا حق لاحدٍ منّا فی فضلٍ[1]۔

ابو سعید خدری راوی ہیں کہ ایک بار ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر کر رہے تھے کہ ایک آدمی اپنی سواری پر آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کے پاس فاضل سواری ہو وہ اُسے اُس کو دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو۔ جس کے پاس فاضل توشہ ہو وہ اس کو دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو"۔

راوی کہتا ہے کہ آپ نے مختلف قسم کے اموال کا ذکر اسی طرح کیا یہاں تک کہ ہم نے محسوس کیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی اپنے فاضل میں کوئی حق نہیں حاصل ہے۔

عن عبد الرحمٰن بن ابی بکرٍ: ان اصحٰب الصُّفّة کانوا اناسًا فقراء

---

[1] مسلم: کتاب اللقطہ - باب استحباب المواساة بفضول المال - نیز ابو داود: کتاب الزکوٰة باب حقوق المال ــــ باختلافِ الفاظ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال مرۃً "من کان عندہ طعام اثنین فلیذھب بثالث، ومن عندہ طعام اربعۃٍ فلیذھب بخامسٍ بسادسٍ" او کما قال۔

وان ابا بکر جاء بثلاثۃٍ۔ فانطلق نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعشرۃٍ وابوبکر بثلاثۃٍ[۱]۔

عبدالرحمان بن ابی بکر سے روایت ہے کہ: اصحابِ صفہ غریب لوگ تھے۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ (اصحابِ صفہ میں سے) ایک تیسرے کو بھی لے جائے جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ پانچویں کو لے جائے، چھٹے کو لے جائے یا جو بھی آپ نے فرمایا۔

ابوبکر تین آدمیوں کو لائے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دس آدمیوں کو ساتھ لے گئے اور ابوبکر تین آدمیوں کو ساتھ لے گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر منقولہ املاک مثلاً زمین کے سلسلہ میں بھی اسی طرزِ عمل کو پسند فرمایا ہے۔ فرمایا ہے:

لان یمنح الرجل اخاہ ارضہ خیرٌ من ان یأخذ علیہ خرجًا معلومًا[۲]۔

اپنی زمین اپنے بھائی کو کرایہ کے بغیر دے دینا اس سے بہتر ہے کہ اس سے اس زمین پر ایک مقررہ لگان وصول کیا جائے۔

ان آیات واحادیث سے وہ اصول مستنبط ہوتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے یعنی مالک کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ مال ہو تو اس کی ذمہ داری ہے کہ اہلِ حاجت کی حاجت روائی کرے۔ اس حاجت روائی کا کم سے کم معیار یہ ہے کہ معاشرہ میں کوئی ایسا فرد باقی

---

[۱]: مسند امام احمد۔ مرتبہ استاذ احمد محمد شاکر۔ حدیث نمبر ۱۷۱۲

قال الاستاذ شاکر: اسنادہ صحیح۔ ورواہ مسلم عن طریق المعتمر عن ابیہ، وابوداؤد: عن الجریری

[۲]: مسند امام احمد۔ مرتبہ استاذ احمد محمد شاکر۔ حدیث نمبر ۲۵۴۱

یہی حدیث باختلافِ الفاظ بخاری ابواب الحرث والمزارعہ میں بھی آئی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ رہے جس کی بنیادی ضروریات — غذا، لباس، مکان اور علاج کی تکمیل نہ ہو سکے۔[۵۱]

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احتکر طعاما اربعین یوما فقد بری من اللہ وبری اللہ منہ وایما اھل عرصۃ اصبح فیھم امرؤ جائعا فقد برئت منہ ذمۃ اللہ[۵۲]

ابن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے چالیس دن غلہ کو (بازار سے) روکے رکھا۔ وہ اللہ سے الگ ہو گیا اور اللہ اس سے الگ ہو گیا۔ اور جس بستی میں کوئی شخص فاقہ سے رات گزارنے پر مجبور ہوا اس (کی سلامتی) سے اللہ بری الذمہ ہے۔

عن ابن عباس قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لیس المؤمن بالذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ۔[۵۳]

ابن عباس سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مومن وہ نہیں ہے جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔

عن علی رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ان اللہ فرض علی اغنیاء المسلمین فی اموالھم بقدر الذی یسع فقراءھم ولن تجھد الفقراء اذا جاعوا وعروا الا بما یصنع اغنیاءھم۔ الا وان اللہ عزوجل یحاسبھم حسابا شدیدا ویعذبھم عذابا الیما۔[۵۴]

---

۵۱ : بنیادی ضروریات کی اس فہرست پر قدرے تفصیلی گفتگو گیارھویں باب میں کی جائے گی۔

۵۲ : حاکم: مستدرک جلد ۲ صفحہ ۱۲؛ مسند امام احمد مرتبہ استاذ احمد محمد شاکر۔ مسند ابن عمرؓ حدیث نمبر ۴۸۸۰

۵۳ : مشکوٰۃ: کتاب الآداب۔ باب الشفقۃ۔ والرحمۃ۔ بحوالہ بیہقی شعب الایمان با حاکم: مستدرک جلد ۲۔ صفحہ ۱۲۔

۵۴ : طبرانی: المعجم الصغیر صفحہ ۹۱۔ مطبع انصار دہلی۔ اس روایت کا مرفوع ہونا ایک مشتبہ امر ہے۔ اسے حضرت علی کے قول کے طور پر بھی روایت (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "اللہ تعالیٰ نے مال داز مسلمانوں پر ان کے مال میں اس قدر (انفاق) فرض کیا ہے جس سے ان کے اہلِ حاجت کی کفالت ہو جائے۔ فقراء اگر بھوکے اور ننگے رہنے کی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے معاشرہ کے مال داروں ہی کے کرتوت کے نتیجہ میں۔ آگاہ رہو، خدائے عزّ وجل یقیناً ان لوگوں سے سخت محاسبہ کرے گا اور انھیں دردناک عذاب دے گا۔

انّ علیّاً قال: انّ اللہ عزّ وجل فرض علی الاغنیاء فی اموالھم ما یکفی الفقراء فان جاعوا او عروا او جھدوا فیمنع الاغنیاء وحقّ علی اللہ تبارک وتعالیٰ ان یحاسبھم ویعذّبھم۔[۵]

حضرت علیؓ نے کہا ہے کہ اللہ عزّ وجل نے مال دار لوگوں پر ان کے مال میں اتنا فرض کیا ہے جو غریبوں کے لیے کافی ہو۔ اب اگر یہ لوگ بھوکے یا ننگے رہیں یا مشقت میں مبتلا ہوں تو اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ مال دار لوگ ان کو (ان کا حق) نہ دیں۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے ضروری ہوگا کہ ان (مال داروں) سے محاسبہ کرے اور انہیں سزا دے۔

ان احادیث و آثار سے اس اصول کی مزید تاکید ہوتی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اپنے پڑوسی اہلِ حاجت کی حاجت روائی، اپنی بستی کے بھوکوں کا پیٹ بھرنا، اور اس سے آگے بڑھ کر پورے معاشرہ میں اس بات کا اہتمام کرنا کہ بھوکے کو کھانا ملے، ننگے کو کپڑا ملے، اور اہلِ حاجت کی دوسری ضروریات پوری ہوں، اصحابِ استطاعت کی ذمہ داری ہے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۵) کیا گیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ لیکن اس روایت کے مفہوم کی تائید قرآن وسنت کی دوسری نصوص سے ہوتی ہے۔ اس مفہوم پر مزید بحث کے لیے ملاحظہ ہو باب ۱۲ میں مزید محاصل کی بحث، بالخصوص ابن حزم کا وہ اقتباس جو وہاں دیا گیا ہے۔

۵ : (حاشیہ صفحہ ہٰذا) ابو عبید: کتاب الاموال۔ صفحہ ۵۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اوحی اللہ الی موسیٰ ابن عمران ...... یا موسیٰ "وما احبت الفقراء ان خزائنی ضاقت علیھم وان رحمتی لم تسعھم ولکنی فرضت للفقرا ء فی مال الاغنیا ما یسعھم اردت ان ابلو الاغنیا کیف سارعتھم فیما فرضت للفقرا ء فی اموالھم ذالک انعمت علیھم نعمتی واضعفت علیھم فی الدنیا ۔ للواحدۃ عشرا مثالھا ۔

یا موسیٰ" کن للفقراء کنزا وللضعیف حصنا وللمستجیر غیثا اکن لک فی الشدۃ صاحبا وفی الوحدۃ انیسا واکلاک فی لیلک ونھارک[1] ۔

اللہ نے موسیٰ بن عمران کی طرف وحی فرمائی کہ ...... اے موسیٰ! میں نے غریبوں کو اس لیے مجبور نہیں کیا ہے کہ میرا خزانہ ان کے لیے تنگ ہے اور میری رحمت میں ان کے لیے گنجائش نہیں ۔ بلکہ میں نے مال داروں کے مال میں غریبوں کے لیے اتنا فرض قرار دیا ہے جو ان کے لیے کافی ہو ۔ میں نے چاہا کہ مال داروں کی آزمائش کروں کہ غریبوں کے لیے ان کے مال میں میں نے جو کچھ واجب کیا ہے اس کے بارے میں ان کی روش کیسی ہے ۔ میں نے مال داروں پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دنیا میں ان کے لیے چند در چند صلہ مقرر کیا ۔۔۔ ایک نیکی کا صلہ دس گنا ۔

اے موسیٰ! غریبوں کے لیے خزانہ بن کر رہو ۔ اور کمزوروں کے لیے مستحکم قلعہ اور پناہ چاہنے والے کے لیے پناہ دینے والے، تو میں تنگ حالی میں تمہارا رفیق اور تنہائی میں تمہارا دوست بن کر رہوں گا اور رات و دن تمہاری نگرانی اور محافظت کروں گا ۔"

جن لوگوں کے پاس اپنی ضرورت سے فاضل مال و املاک ہوں ان کو چاہیے کہ خود اہل حاجت کا سراغ لگا کر ان کی حاجت روائی کریں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :

---

[1] : کنز العمال جلد ۳ نمبر ۶۱۷۶ ۔ بحوالہ ابن النجار عن انس رضی ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ومن کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ[۵۱]۔

جو اپنے بھائی کی حاجت روائی میں لگتا ہے اللہ اس کی حاجت روائی کیا کرتا ہے۔

واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ[۵۲]۔

بندہ جب تک اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے خدائے تعالیٰ اس کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

اور یہ کہ:

الساعی علی الارملۃ والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ او القائم اللیل والصائم النھار[۵۳]۔

بیوہ و مسکین کے کام کے لیے کوشش کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح یا راتوں کو نماز (تہجد) پڑھنے والے اور دن کو روزہ رکھنے والے کی طرح ہے۔

لیکن جب کوئی حاجت مند خود سامنے آکھڑا ہو تو فاضل مال رکھنے والے کی ذمہ داری ہے کہ اس کی ضرورت پوری کرے۔ اس ضمن میں تین طرح کے افراد کا حق کافی اہمیت رکھتا ہے۔

۱۔ وہ ضرورت مند جو عالم مسافرت میں ضیافت کا طالب ہو۔

۲۔ وہ حاجت مند جو دستِ سوال دراز کرے۔

۳۔ وہ حاجت مند جو شدید اضطرار کی حالت میں مبتلا ہو۔

۱۔ مہمان کا حق:

ہر صاحبِ استطاعت، فرد کے لیے لازم ہے کہ مہمان ہونے والے (مسافر) کو کم از کم ایک دن اور ایک رات کا قیام و طعام پیش کرے۔

---

[۵۱]: مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، ابوداؤد: کتاب۔ باب المواخاۃ۔

[۵۲]: ابوداؤد: کتاب الادب۔ باب فی المعونۃ للمسلم۔ اور ترمذی

[۵۳]: بخاری: کتاب النفقات۔ باب فضل النفقۃ علی الاھل۔ اور مسلم۔

KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عن ابی کریمة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : لیلة الضیف حق علی کل مسلم۔ فمن اصبح بفنائہ فھو علیہ دین ان شاء اقتضی وان شاء ترک[1]۔

ابوکریمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مہمان کی ایک رات ضیافت کرنا، ہر مسلمان پر فرض ہے۔ جس کے صحن میں (مہمان) صبح کرے اس پر یہ حق قرض ہے، (مہمان) چاہے تو اس کا تقاضا کرے اور چاہے تو چھوڑ دے۔

عن ابی شریح الکعبی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ جائزتہ یوم ولیلة والضیافة ثلثة ایام۔ فما کان بعد ذالک فھو صدقة۔ ولا یحل ان یثوی عندہ حتی یحرجہ[2]۔

ابوشریح کعبی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو شخص بھی خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ اس کا حق ایک دن اور ایک رات ہے۔ مہمانی کی مدت تین دن ہے۔ اس کے بعد جو کچھ کیا جائے وہ صدقہ ہے۔ اور مہمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ میزبان کے یہاں اتنے طویل عرصہ ٹھہرا رہے کہ اسے تنگی میں مبتلا کر دے۔

یہ حدیثیں یہ بتاتی ہیں کہ ایک شب و روز کا قیام و طعام ہر صاحب استطاعت مسلمان مقیم پر مسافر مہمان کا حق ہے۔ مسافر مہمان کے لیے تین دن تک اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے، اور میزبان کو چاہیے کہ خوش دلی کے ساتھ اس کی ضیافت کرے۔ تین دن کے بعد اگر میزبان کچھ کرتا ہے تو اس کی حیثیت صدقہ کی ہے۔ اور مہمان کو حتی الامکان تین

---

[1] : ابوداؤد: کتاب الاطعمہ۔ باب من الضیافة اور ابن ماجہ ابواب الادب۔ باب حق الضیف
ابن ماجہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: لیلة الضیف واجبة علی کل مسلم ۔۔۔ الخ

[2] : بخاری: کتاب الادب۔ اور مسلم۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دن سے زیادہ قیام سے پرہیز کرنا چاہیے۔ رہی ایک شب و روز کی ضیافت تو وہ میزبان پر مہمان کا واجب الادا حق ہے جسے اگر مہمان کے لیے کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو وہ جبراً بھی وصول کر سکتا ہے۔

عن عقبۃ ابن عامر قال قلت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم انک تبعثنا فننزل بقوم فلا یقرونا، فما تری، فقال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان نزلتم بقوم فامر والکم بما ینبغی للضیف فاقبلوا فان لم یفعلوا فخذوا منھم حق الضیف الذی ینبغی لھم۔[1]

عقبہ ابن عامر سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمیں (باہر) بھیجتے ہیں تو کبھی کبھی ہم ایسے لوگوں کے یہاں ٹھہر جاتے ہیں جو ہماری میزبانی نہیں کرتے۔ آپ نے ہم سے کہا "جب تم کسی آبادی میں جاکر ٹھہرو اور وہاں کے لوگ تمھارے لیے وہ کچھ مہیا کر دیں جو مہمان کو ملنا چاہیے تو اسے قبول کر لو۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان سے مہمان کا وہ حق وصول کر لو جو انھیں ادا کرنا چاہیے تھا۔

سماج کے دوسرے افراد کو چاہیے کہ وہ مہمان سے تعاون کر کے اُسے اس کا حق دلوائیں

عن المقدام ابی کریمۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایما رجل اضاف قوما فاصبح الضیف محروما فان نصرہ حق علی کل مسلم حتی یاخذ قری لیلتہ من زرعہ ومالہ۔[2]

مقدام ابی کریمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو شخص کسی کا مہمان ہو اور مہمان صبح تک (کھانے پینے سے) محروم ہی رہ جائے تو اس کی مدد کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے تاآنکہ وہ اپنی ایک رات کی خوراک

---

[1]: بخاری: کتاب الادب، مسلم: کتاب اللقطۃ۔ باب الضیافۃ ونحوھا، ابوداؤد: کتاب الاطعمہ ابن ماجہ: ابواب الآداب۔ باب حق الضیف، اور ترمذی۔

[2]: ابوداؤد: کتاب الاطعمہ۔ باب من الضیافۃ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان لوگوں کی کھیتی اور مال میں سے نہ لے۔

کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ تمدنی دور میں عالمِ مسافرت کے وُہ معنی نہیں گئے ہیں جو پہلے تھے آج ہر جگہ ہوٹل اور قیام و طعام کو قیمتاً حاصل کرنے کے دُوسرے ذرائع موجود ہیں۔ ان حالات میں مہمان کو یہ حق دینا غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ بات ایک حد تک دُرست ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ استطاعت رکھنے اور مذکورہ بالا ذرائع سے اپنی ضرورت پوری کرنے پر قادر ہونے کے باوجود کسی شخص کے حقِ مہمانی وصول کرنے کا امکان بہت کم ہے۔ پھر عالمِ مسافرت میں ایسے حالات بھی پیش آ سکتے ہیں کہ مسافر ہوٹل میں قیام و طعام کے اخراجات نہ برداشت کر سکتا ہو۔ لاتعداد بستیاں ایسی ہیں جہاں کسی بھلے آدمی کو قیام و طعام کے لیے کوئی ہوٹل یا کوئی دوسری معقول جگہ نہیں مل سکتی۔ دنیا کی اکثر آبادیاں اب بھی تمدنی ترقی کی ان برکات سے محروم ہیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر وہ حکم اب بھی باقی سمجھا جانا چاہیے جو مذکورہ بالا حدیثوں سے نکلتا ہے۔

۴۔ سائل کا حق:

سائل کو جواب دے دینا ٹھیک نہیں، بالخصوص اُسے ڈانٹ کر بھگا دینا تو بہت بُرا ہے۔

وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَر۔ (ضحیٰ: ۱۰) سائل کو مت جھڑکو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ جو آدمی اللہ کا واسطہ دے کر کچھ مانگے اُس کی طلب پوری کر دینی چاہیے:

عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من استعاذ کم باللہ فاعیذوہ ومن سألکم باللہ فاعطوہ[۵] ....

ابنِ عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو تم سے اللہ کا واسطہ دے کر پناہ چاہے اسے پناہ دو، اور جو تم سے اللہ کا واسطہ دے کر سوال کرے اسے دو ....

---

۵ : بیہقی: السنن الکبریٰ۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب عطیۃ من سال باللہ عزوجل۔ اور سنن نسائی باب من سال باللہ۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر آدمی کے پاس خود مال کی کمی ہو تو بھی چاہیے کہ مانگنے والے کو کچھ نہ کچھ دے کر واپس کرے خواہ کتنی ہی حقیر چیز کیوں نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

ردّوا السائل ولو بظلف محرق[1]

سائل کو (کچھ دے کر) واپس کرو خواہ جھلسا ہوا کھر کیوں نہ ہو۔

اگر آدمی کے پاس مال اپنی ضرورت سے فاضل ہو پھر بھی وہ سائل کو نہ دے تو اس کا انجام بُرا ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

"لا یاتی رجل مولاہ یسألہ من فضل عندہ فیمنعہ ایاہ الا دعی لہ یوم القیامۃ شجاع یتلمظ فضلہ الذی منع[2]"

کوئی آدمی اپنے دوست کے پاس آئے اور اس سے اس کے فاضل مال میں سے کچھ مانگے، اور وہ اُسے دینے سے انکار کر دے تو قیامت کے دن اس کے لیے ایک بڑا سانپ بلایا جائے گا جو اپنے پھن نکال کر اس فاضل چیز کے پیچھے دوڑے گا جسے دینے سے انکار کیا تھا۔

۳۔ اضطراری حالات میں مبتلا اہلِ حاجت کے حقوق :

حاجت مند فرد اگر اضطراری کیفیت میں مبتلا ہو تو اس کا حق ایک قطعی قانونی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اضطرار کے معنی یہ ہیں کہ کوئی فرد اپنی بنیادی حاجات کی تکمیل کے لیے —— بھوک کی حالت میں کھانے کا، پیاس میں پانی کا، سردی، سخت گرمی اور دھوپ یا بارش سے بچنے کے لیے سر چھپانے کی جگہ کا، یا شدید مرض کی حالت میں دوا کا اتنی شدت سے محتاج ہو کہ ضرورت نہ پوری ہونے کی شکل میں اس کی جان چلی جانے کا اندیشہ ہو۔ ایسے

---

[1] : بیہقی: السنن الکبریٰ، کتاب الزکوٰۃ۔ باب التحریض علی الصدقۃ۔
ترمذی: کتاب الزکوٰۃ۔ باب ما جاء فی حق السائل۔ نسائی: کتاب الزکوٰۃ۔ باب ردّ السائل

[2] : نسائی: سنن۔ باب من یسأل ولا یعطی۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضرورت مند کی فوری امداد ان افراد کا فرض ہے جو خود اس سے بہتر حالت میں ہوں۔
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ افراد اپنی ذمہ داری نہ پوری کریں تو اضطرار میں مبتلا آدمی کیا کرے؟

اس سوال کے جواب سے پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ یہ ایک انتہائی استثنائی صورت حال ہے۔ اسلام نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ ایسی صورتِ حال نہ پیدا ہونے پائے۔ اتنی زیادہ ضرورت مندی سے پہلے ہی آدمی زکوٰۃ کا مستحق ہو کر اس بات کا حقدار ہو جاتا ہے کہ ریاست کے خزانہ سے مدد حاصل کر سکے۔ پھر ایسی حالت میں اسے سوال کرنے کی اجازت ہے، اور ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ایسے سائل کی مدد ضروری ہے۔ لیکن ان تمام انتظامات کے باوجود ایسی صورتِ حال رُونما ہو سکتی ہے۔ شدید پیاس اور بیماری کا معاملہ خاص طور پر ایسا ہے کہ آدمی سرکاری خزانہ سے اپیل کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہ جاتا۔ تقریباً یہی حال دوسری ضروریات کا بھی ہے۔ یہ صورتِ حال آدمی کے اپنے وطن میں بھی پیش آ سکتی ہے، اور گھر سے دور تو خاص طور پر وہ اچانک ایسے حالات میں مبتلا ہو سکتا ہے۔
شدید مجبوری کی یہی استثنائی شکلیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے حرام کھانے کی بھی اجازت دی ہے:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۔ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ (البقرہ: ۱۷۳)

اللہ نے تمہارے لیے صرف مردار، خون، سؤر کا گوشت اور وہ چیزیں حرام کی ہیں جن پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔
ایک دوسری آیت میں حرام اشیاء کے ذکر کے بعد یہ فرمایا ہے کہ:

...... فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (المائدہ : ۳)

البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

حرام کھانے کی اجازت دینے کی وجہ اضطراری کیفیت ہے، اور اس اجازت کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کی جان بچ جائے۔ عام حالات میں دوسرے افراد کا مال بغیر ان کی مرضی کے چھین لینا بھی حرام ہے۔ لیکن اضطراری کیفیت کی وجہ سے جان بچانے کی خاطر آدمی کو اس کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ یہ بات مذکورہ بالا آیات سے مستنبط کی جاسکتی ہے۔ اگر کسی دوسرے فرد کے پاس اضطرار میں مبتلا فرد کی ضرورت کی چیز، اُس فرد کی اپنی ضرورت سے فاضل، موجود ہو اور وہ باوجود مانگنے کے اُسے نہ دے تو مضطر کو اپنی ضرورت کی چیز، بقدرِ ضرورت، جبراً چھین لینے کا حق حاصل ہے۔

سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں مشہور مالکی مفسر، ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی، نے لکھا ہے کہ:

"اضطرار یا تو کسی ظالم کے مجبور کرنے سے پیدا ہوگا یا فاقہ کی حالت میں بھوک سے ...... فاقہ کشی یا تو مسلسل ہو گی یا نہیں۔ اگر مسلسل فاقہ کی کیفیت ہو تو اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس آدمی کے لیے مُردار کھا کر پیٹ بھر لینا جائز ہے۔ البتہ اگر وہ کسی مسلمان کا ایسا مال حاصل کر سکتا ہو جس کے لینے میں اُسے (چوری کی سزا میں) ہاتھ کاٹے جانے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کے لیے مُردار کھانا جائز نہیں۔ وہ کھجور جو درختوں پر ہوں، یا وہ بکری جو رات میں چراگاہ سے چُرائی جائے۔ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کے لینے میں ہاتھ کاٹے جانے یا کسی اور مصیبت میں مبتلا ہونے کا ڈر نہیں۔ یہاں تک کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ:

"ایک بار ہم سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ ہم نے ایک اونٹ دیکھا جو درخت سے بندھا ہوا تھا۔ ہم اس کی طرف لپکے تو رسول اللہ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پکارا اور ہم آپ کے پاس واپس چلے آئے۔ آپ نے فرمایا: "یہ اونٹ کسی مسلمان خاندان کا ہے۔ یہی ان کی روزی، اور اللہ کے بعد ان کا سہارا ہے۔ کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ جب واپس جا کر اپنے توشہ دان دیکھو تو معلوم ہو کہ جو کچھ اس میں تھا وہ غائب ہو چکا ہے۔ کیا تمہارے نزدیک یہ انصاف کی بات ہو گی؟ لوگوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ (اس اونٹ پر قبضہ کرنا) بھی ایسا ہی ہے۔ ہم نے کہا اگر ہم کھانے پینے کو محتاج ہوں تو آپ کی کیا رائے ہے (ہم کیا کریں) آپ نے فرمایا: "کھاؤ اور پیو مگر (کھانے پینے کی چیزیں) ساتھ اٹھا کر مت لاؤ۔"

اس حدیث کو ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ میرے نزدیک یہی روایت ثابت ہے۔ اس کا ذکر ابن منذر نے (ان الفاظ میں) کیا ہے کہ (راوی نے) کہا: ہم نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول جب ہم میں کوئی اضطرار میں مبتلا ہو تو اس کے لئے دوسرے کے مال میں سے کیا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ کھائے اور اٹھا کر نہ لائے، پئے اور اٹھا کر نہ لائے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ اس کے علاوہ ہر مختلف فیہ بات کے بارے میں فیصلہ اس اصول کے مطابق کیا جائے گا کہ اللہ نے (دوسروں کے) اموال کو حرام قرار دیا ہے۔

ابو عمر (قرطبی) کہتے ہیں کہ اس مسئلہ کے بارے میں خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب ایک مسلمان پر کسی دوسرے مسلمان کی جان بچانا فرض ہو اور یہ ذمہ داری اُس پر اس طرح متعین ہو جائے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا فرد اسے پورا کر سکنے والا وہاں موجود نہ ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس آدمی کی جان بچانے (کے لیے اس کی ضرورت پوری کرنے) کا انتظام کرے۔ اگر ایسے آدمی کو وہ شخص (بقدرِ ضرورت) مال دینے سے انکار کر دے تو اس آدمی کو اس کا حق حاصل ہے کہ اس شخص سے لڑائی کرے اور مرنے مارنے پر اُتر آئے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں اس کی جان چلی جائے۔ اہلِ علم کے نزدیک یہ حق صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب وہاں صرف ایک ہی فرد ہو جو مضطر کی ضرورت پوری کر سکتا ہو (کوئی دوسرا موجود نہ ہو) اس وقت اُس ایک

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرد پر متعین طور پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے۔ اگر بہت سے لوگ ہوں، یا ایک معتد بہ جماعت موجود ہو، تو یہ ذمہ داری ان سب کے لیے فرض کفایہ ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں پانی وغیرہ وہ ساری چیزیں جو مسلمان کی جان بچانے کے لیے درکار ہوں، یکساں حیثیت رکھتی ہیں۔ البتہ اہلِ علم کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس (ضرورت مند) پر اس چیز کی قیمت ادا کرنا واجب ہوگا یا نہیں جس کے ذریعہ اس نے اپنی جان بچائی ہے۔ بعض حضرات نے اسے واجب قرار دیا ہے[۵] اور بعض حضرات نے یہ بات نہیں تسلیم کی ہے۔ خود ہمارے مسلک میں دونوں ہی رائیں ظاہر کی گئیں ہیں۔ البتہ اہلِ علم کے درمیان، خواہ وہ متقدمین ہوں یا متاخرین، اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب کسی مسلمان کی جان جانے کا اندیشہ ہو اور تھوڑی سی چیز دے کر اس کی جان بچائی جا سکتی ہو اور ضرورت پوری کی جا سکتی ہو ــــــ جبکہ اس چیز کے مالک کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچ رہا ہو ــــــ تو ایسا کرنا واجب ہے۔"

"ابنِ ماجہ نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

۔۔۔۔۔۔ ابو بشر جعفر بن ایاس نے روایت کی ہے کہ:

"میں نے عباد بن شرحبیل کو، جو بنی عنبر کا ایک فرد ہے، یہ کہتے سنا ہے کہ ایک سال ہم پر فاقے پڑنے لگے تو میں مدینہ آیا اور اس کے ایک باغ سے (غلہ کی) بالیں توڑ کر اس کے دانے الگ کیے اور کھایا، اور کچھ اپنے کپڑے میں رکھ لیا۔ پھر باغ کا مالک آیا تو اس نے مجھے مارا اور میرا کپڑا چھین لیا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کو اس واقعہ کی خبر دی تو آپ نے اس آدمی سے یہ فرمایا کہ "یہ بھوکا تھا تو تُو نے اسے کھلایا نہیں، اور ناواقف تھا تو تُو نے اسے سکھایا نہیں" پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو ایک وسق یا آدھا وسق گیہوں دلوا دیا۔"

---

۵ : مثلاً ملاحظہ ہو قرافی: الفروق جلد ۱، صفحہ ۱۹۶ - (مصنف)

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"میری رائے میں یہ حدیث صحیح ہے"[۱]

ہم نے یہ طویل اقتباس اس لئے دیا ہے کہ اس میں دلائل کے ساتھ وہ اصول ثابت کیا گیا ہے جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ مہمان اور سائل کے سلسلہ میں اوپر جو بحث کی گئی ہے وہ بھی اس اصول کی تائید کرتی ہے۔ ان دلائل کے علاوہ متعدد دوسرے شرعی دلائل سے یہ ثابت ہے کہ اہلِ حاجت کی حاجت روائی معاشرہ پر ایک فرضِ کفایہ ہے[۲]۔ کسی فرضِ کفایہ کی ادائیگی سے عام لوگ غفلت برتیں تو اصحابِ استطاعت کے لئے وہ فرضِ عین بن جاتا ہے۔ لہٰذا اس مجبور محتاج کی حاجت روائی اصحابِ استطاعت پر فرض ہے جس کی ضرورت پوری کرنے سے پورا معاشرہ غافل رہا، تاآنکہ اب وہ موت کے کنارے آپہنچا۔ مضطر فرد سے اس چیز کی قیمت کا مطالبہ بھی کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ اس کا اپنا حق تھا جو اسے شریعت نے عطا کیا ہے اور اس نے وصول کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک نظیر یہ بتائی ہے کہ عام قحط کے زمانہ میں چوری کی حد نہیں جاری کی جاتی۔ اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ قحط کی وجہ سے بعض افراد بھوک سے مجبور ہو کر بھی چوری کر سکتے ہیں۔ اس شبہ کی بنا پر ایسے حالات میں چوری کے ارتکاب پر شرعی حد نہیں جاری کی جاتی۔ آپؓ نے فرمایا ہے:

لا قطع فی عام سنۃٍ۔[۳]

قحط کے زمانہ میں چوری کی سزا میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

امام ابو محمد ابن حزم اس اصول کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ:

"کسی مسلمان کے لیے جو اضطرار میں مبتلا ہو یہ جائز نہیں کہ مردار یا سور کا گوشت کھالے جبکہ اسے ایسا کھانا میسر آ سکتا ہو جو کسی مسلمان یا ذمی ساتھی کی ملک میں ہو اور اس کی

---

[۱] : قرطبی: الجامع الاحکام القرآن۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۲۵-۲۲۶

[۲] : بعض دلائل اوپر گذر چکے ہیں اور بعض کا ذکر نیچے گیارھویں اور بارھویں باب میں کیا گیا ہے۔

[۳] : ابو عبید: کتاب الاموال صفحہ ۵۵۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی ضرورت سے زیادہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ کھانے کے مالک پر بھوکے کو کھانا کھلانا فرض ہے۔ اس بات کے پیشِ نظر وہ (مضطر) مردار یا سؤر کا گوشت کھانے پر مجبور نہیں۔ اسے یہ حق حاصل ہے کہ اس معاملہ میں قتال کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اگر وہ خود قتل ہو جاتا ہے تو اس کے قاتل کو دیت ادا کرنا ہوگی، اور اگر مزاحمت کرنے والے کو قتل کر دیتا ہے تو وہ کم بخت خدا کی لعنت کا سزاوار ہوگا۔ کیونکہ اس نے ادائے حق میں مزاحمت کی اور وہی باغی فریق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ [۵۱] (پھر اگر ان میں سے ایک فریق دوسرے فریق پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے گروہ سے جنگ کرو تا آنکہ وہ اللہ کے فیصلہ کا تابع ہو جائے) [۵۲]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک نظیر سے بھی یہی اصول مستنبط ہوتا ہے۔ یحییٰ ابن آدم القرشی نے روایت کی ہے کہ "ایک شخص نے کسی چشمہ کے پاس جا کر اس کے مالکوں سے پانی مانگا، لیکن ان لوگوں نے اسے پانی پلانے سے انکار کر دیا۔ تا آنکہ وہ پیاس کے مارے مر گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے اس شخص کی دیت وصول کی" [۵۳]

امام ابو یوسف لکھتے ہیں:

"ہمارے اصحاب کے نزدیک اگر آدمی کو اپنی جان جانے کا اندیشہ ہو تو وہ پانی حاصل کرنے کے لیے مسلح جنگ کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ جس کے پاس پانی ہو وہ اس کی اپنی ضرورت سے زیادہ ہو۔ کھانے کے بارے میں ان کی یہ رائے نہیں ہے۔ کھانے کے لیے وہ صرف بغیر قتال چھین لینے اور غصب کر لینے کی اجازت دیتے ہیں" [۵۴]

---

۵۱ : سورۃ الحجرات۔ آیت : ۹

۵۲ : ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم : المحلّی۔ جلد ۶ صفحہ ۱۵۹ مطبعۃ النہضہ۔ مصر ۱۳۴۷ھ

۵۳ : یحییٰ ابن آدم : کتاب الخراج۔ صفحہ ۱۱۱ ؛ ابن جوزی : سیرۃ عمر ابن خطاب۔ صفحہ ۹۹

۵۴ : کتاب الخراج : صفحہ ۱۱۶۔ طبع ۱۹۴۶ء

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گویا اختلاف اس میں نہیں کہ مضطر کو کھانا زبردستی چھین لینے کا حق ہے، بلکہ صرف جنگ کرنے کے حق میں اختلاف ہے۔ اگر غور کیجیے تو پانی اور کھانے کے درمیان اس تفریق کی کوئی معقول وجہ نہیں موجود ہے۔ کیونکہ جان جانے کا اندیشہ دونوں میں ہے شدید بھوک میں کھانے کی ضرورت ویسی ہی ہے جیسی کہ شدید پیاس میں پانی کی چنانچہ ابن حزم نے اس رائے پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ان لوگوں نے پیاس کی شدت سے موت سے بچنے کے لیے قتال کی اجازت دی ہے اور بھوک یا ننگے بدن ہونے سے موت کے اندیشہ سے بچنے کے لیے قتال کی اجازت نہیں دی ہے۔ مگر ان دونوں حالتوں میں آخر کیا فرق ہے[۵]؟"

صحیح بات وہی ہے جو قرطبی نے لکھی ہے، یعنی اس اصول کا اطلاق آدمی کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرنے والی ان تمام چیزوں پر ہوتا ہے جو جان بچانے کے لیے ضروری ہوں۔ مضطر کو اپنی ضرورت کی چیز بقدرِ ضرورت حاصل کر لینے کا حق ہے۔ خواہ اسے حاصل کرنے کے لیے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

اس موضوع پر ہم نے قدرے تفصیلی بحث اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ اس سے ملکیت کے باب میں اسلام کے بنیادی نقطۂ نظر کے ایک اہم پہلو کی وضاحت ہوتی ہے۔ بلاشبہ اسلام ذاتی ملکیت کا حق دیتا ہے۔ مالک کو اپنی ملکیت کے محفوظ رکھنے اور دوسروں کو اس میں مداخلت سے روکنے کا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن چونکہ ملکیت خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، فی الجملہ حیاتِ انسانی کی بقا کے لیے دی گئی ہے لہٰذا جب یہ مقصود ہی خطرے میں پڑ جائے تو میری اور تیری کی ساری حد بندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ سارے ذاتی حقوق بے معنی ہو جاتے ہیں اور ہر مال براہِ راست اپنے مقصودِ آخر کے تابع ہو جاتا ہے۔ مال کی اصل غرض حیاتِ انسانی کا قیام و بقا ہے۔ جہاں اس غرض کے لیے انسانی زندگی کو مال کی ضرورت ہو وہاں اس کا حاصل ہونا ضروری ہے، قطع نظر

---

[۵] : ابن حزم: المحلّی جلد ۶ صفحہ ۱۵۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے کہ وہ کس کی تحویل میں ہے۔

(د) قرض اور عاریت

اُوپر انفاق مال کی وہ شکلیں زیر بحث لائی گئی ہیں جن میں مالک کو اپنے مال کا ایک حصّہ دوسرے کی ملک میں دے دینا ضروری ہوتا ہے۔ بعض حالات میں اپنی مملوکہ چیز یا نقدی کو عاریت یا قرض کے طور پر دے دینا بھی کافی ہوتا ہے۔ ایسے حال میں مالک کو چاہیے کہ اپنے مال و املاک کو قرض یا عاریت کے طور پر ضرورت مند کو استفادہ کے لیے دینے سے نہ گریز کرے۔

قرض اور عاریت کی اہمیت بعض اوقات انفاق مال سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ غیرت مند افراد ضرورت کے باوجود صدقہ خیرات قبول کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان سے کبھی اس بات کی توقع نہیں کی جاتی کہ وہ دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کریں گے، اور ان کو اپنی حاجت مندی کا یقین دلانے کے لیے الحاح سے کام لیں گے۔ لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ سفید پوش شرفاء کو بھی ضرورتیں لاحق ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی مدد قرض یا عاریت دے کر بدرجۂ احسن کی جاسکتی ہے۔

عاریت کے مسئلہ پر ایک اور حیثیت سے غور کیجیے۔ بہت سی پائدار اشیاء صرف ایسی ہوتی ہیں جن کو خریدنے اور اپنی ذاتی ملک میں رکھنے کی استطاعت ہر ایک کو نہیں میسّر ہوتی۔ البتہ تمام افراد کو کبھی کبھی ایسی چیزوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ بعض لوگوں کے پاس اس طرح کے بعض سامان ہوتے ہیں اور بعض کے پاس کچھ دوسرے سامان ہوتے ہیں۔ عاریت کے ذریعہ کم استطاعت لوگوں کو بہت سہولت ہو جاتی ہے اور مختلف سامانوں کے مالکوں کو ایک دوسرے کے سامانوں سے استفادہ کا موقع ملتا ہے۔ اسی لیے ایک انسانی سماج میں اشیاء کے عاریتًا لین دین کا رواج ضروری ہوتا ہے۔

قرض اور عاریت کے انہیں امتیازی پہلوؤں کی وجہ سے اسلام میں ان پر خاص طور

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر زور دیا گیا ہے۔

عن انس ابن مالکؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

"رأیت لیلۃ اسری بی علیٰ باب الجنۃ مکتوبًا: الصدقۃ بعشر امثالھا والقرض بثمانیۃ عشر، فقلت یا جبریل ما بال القرض افضل من الصدقۃ- قال لان السائل یسأل وعندہٗ- والمستقرض لا یستقرض الّا من حاجۃ-" [1]

انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معراج کی رات میں نے دیکھا کہ جنت کے دروازے پر لکھا ہوا ہے کہ "صدقہ کا بدلہ دس گنا اور قرض کی جزا اٹھارہ گنا" تو میں نے جبریل سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ قرض صدقہ سے افضل قرار پایا؟ انھوں نے جواب دیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مانگنے والا کچھ رکھتے ہوئے بھی مانگ لیتا ہے مگر قرض لینے والا ضرورت ہی کے سبب قرض طلب کرتا ہے۔

نیز آپؐ نے فرمایا ہے:

کلّ قرض صدقۃ- [2]

قرض دینا صدقہ ہے۔

کوئی ضرورت مند قرض مانگے تو صاحبِ استطاعت آدمی کو چاہیے کہ اسے قرض دے دے۔

لا ینبغی لعبدٍ ان یاتی اخاہ یسألہ قرضًا وھو یجدہ فیمنعہ- [3]

کسی بندہ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اس کا بھائی اس سے قرض مانگنے آئے اور وہ اس (کو دینے) کی گنجائش رکھتا ہو، پھر بھی وہ اس سے انکار کر دے۔

---

[1] : ابنِ ماجہ: کتاب القرض۔

[2] : طبرانی: المعجم الصغیر صفحہ ۸۰

[3] : الطبرانی فی الکبیر بحوالہ کنز العمال جلد ۳ نمبر ۳۵۸۱

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہی حال عاریت کا ہے۔ روزمرّہ استعمال کی چیزوں کو عاریتًا دینے سے انکار کر دینا بے دین لوگوں کا کام ہے:

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ...... الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ۔ (الماعون)

تو نے دیکھا اس کو جو انصاف کے دن کا انکار کرتا ہے ...... وہ لوگ جو دکھاوا کرتے ہیں اور برتنے کی چیزیں مانگے نہیں دیتے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم لوگ پانی نکالنے کے ڈول اور کھانا پکانے کی پتیلیوں کو عاریتًا دینے کو ماعون میں شامل سمجھتے تھے[۱]۔ اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت علی سے بھی کی گئی ہے[۲]۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں سلے ہوئے کپڑوں اور زیورات کے عاریتًا دینے کا بھی رواج تھا۔

جس طرح شدید ضرورت کی حالت میں انسان کو اس کی ضرورت کی چیز دے دینا مالک پر فرض ہے۔ اسی طرح مضطر کا اضطرار رفع کرنے کے لیے سامانِ ضرورت کو عاریتًا دینا بھی ضروری ہے[۳]۔ مثلاً کسی آفت ناگہانی جیسے زلزلہ، سیلاب، آتش زنی وغیرہ کی وجہ سے بعض لوگ بےگھر ہو جائیں، یا کسی کو سواری کی شدید ضرورت پیش آ جائے ...... ایسے حالات میں عاریت دینا فرض ہو جاتا ہے۔ اصولی طور پر اس کے دلائل وہی ہیں جو اوپر گذر چکے ہیں۔

علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

"فرض کیجیے کہ آدمی کسی دوسرے فرد کے گھر میں قیام پر مجبور ہو جائے اور اس کے علاوہ اُسے کوئی ٹھکانا میسّر نہ ہو، یا کسی خاص سرائے میں اُترنے پر مجبور ہو جائے

---

[۱]: ابو داؤد: کتاب الزکوٰۃ، باب حقوق المال، نیز ملاحظہ ہو بیہقی: السنن الکبریٰ۔ کتاب الزکوٰۃ باب ما ورد فی تفسیر الماعون۔

[۲]: ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصّاص: احکام القرآن جلد ۳ صفحہ ۴۷۵ مطبع سلفیہ قاہرہ ۱۳۴۷ھ

[۳]: ایضًا ایضًا

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا اسے کوئی کپڑا مستعار لینے کی شدید ضرورت ہو تاکہ اس کے ذریعہ سردی سے بچ سکے۔ یا اسے آٹا پیسنے کی چکی کی سخت ضرورت ہو، یا پانی نکالنے کے لیے ڈول کی شدید حاجت ہو، یا ہانڈی، کلہاڑی وغیرہ کی سخت ضرورت پیش آجائے۔ تو اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مالک پر ان چیزوں کا اُسے دے دینا واجب ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اسے کرایہ وصول کرنے کا حق ہوگا کہ نہیں...... ہمارے استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اس پر ان چیزوں کا بلا عوض مستعار دینا واجب ہے، اور کتاب وسنت میں اس کے دلائل موجود ہیں[۱]۔"

اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اگر لینے والے فرد کو مستعار لی ہوئی چیز کی اتنی شدید ضرورت ہو کہ اس کے بغیر اس کی جان جانے کا اندیشہ ہو تو مالک کو اس سے کرایہ وصول کرنے کا حق نہیں۔ ایسے ضرورت مند کا حق ہو جاتا ہے کہ اس کی (بلا معاوضہ) مدد کی جائے۔ البتہ اگر ضرورت اتنی شدید نہ ہو تو مالک کے مطالبہ پر مستعار لینے والے آدمی کو اس چیز کا کرایہ دینا ہوگا۔ لیکن مالک کا یہ فعل اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ پہلی صورت میں عاریت دینا فرض ہے۔

"بعض حالات میں یہ (عاریت دینا) واجب بھی ہو جاتا ہے جیسے کہ صحرا میں شدید گرمی کے وقت ایک شخص دوسرے شخص سے ایک چھتری عاریتاً مانگے جس کے ملنے پر اس شخص کی زندگی کا انحصار ہو۔ یا اس کا کسی بیماری سے بچنا اس پر منحصر ہو۔ ایسے حال میں چھتری کے مالک پر واجب ہے کہ چھتری اسے عاریتہً دے دے[۲]۔"

---

[۱] : ابنِ قیم : الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ۔ صفحہ ۲۳۹، مطبعۃ المؤید۔ مصر، ۱۳۱۷ھ

[۲] : عبدالرحمٰن الجزیری : الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ جلد ۳۔ صفحہ ۲۷۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ھ) حقوقِ ارتفاق

انفاقِ مال، قرض اور عاریت کا تعلق زیادہ تر منقولہ املاک۔ نقد مال اور اشیاء استعمال سے ہے۔ غیر منقولہ املاک کے مالک پر بھی دوسروں کو سہولت بہم پہنچانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہر غیر منقولہ جائداد پر مالک کے علاوہ دوسرے افراد کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ فقہی اصطلاح میں ان حقوق کو "حقوقِ ارتفاق" کہا جاتا ہے۔ "حقِ ارتفاق کسی غیر منقولہ جائداد پر کسی دوسرے شخص کی غیر منقولہ جائداد کے فائدے کے لیے، ایک مقرر حق کا نام ہے"[۵۱]۔ ہر غیر منقولہ جائداد کے مالک کو ان حقوق کی ادائیگی کرنی چاہیے جو اس کی جائداد پر دوسرے لوگوں کو حاصل ہوں۔ ماہرین فقہ نے ان حقوق کو حسب ذیل بیان کیا ہے[۵۲]۔

۱ ۔ حقِ شرب

۲ ۔ حقِ مجری

۳ ۔ حقِ مسیل

۴ ۔ حقِ گذرگاہ

۵ ۔ حقِ جوار

۱ ۔ حقِ شرب :

پانی کی جو نہریں کسی فرد کی ذاتی ملک میں ہوں ان سے دوسرے افراد کو خود پانی پینے اور اپنے جانوروں کو پلانے کا حق حاصل ہے۔ البتہ چھوٹے چھوٹے چشموں، حوضوں اور کنوؤں سے دوسرے افراد کو خود پانی پینے کا حق تو حاصل ہے مگر اپنے

---

۵۱ : قدری پاشا : مرشد الحیران دفعہ ۳۷

۵۲ : تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو : عبدالرزاق احمد السنہوری : مصادر الحق فی الشرع الاسلامی جلد ۱، صفحہ ۳۰، مرشد الحیران : دفعات ۳۷ تا ۵۲، یوسف موسیٰ : الاموال و نظریۃ العقد فی الفقہ الاسلامی۔ صفحات ۱۷۱ تا ۱۸۵

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانوروں کو پانی پلانے کا حق نہیں[1]۔

۲۔ حقِ مجری:

اس کا مطلب ہے دوسرے کی مملوکہ زمین پر سے پانی کی نالی گذارنے کا حق۔ اگر کسی کا کھیت پانی کے ذخیرہ ـــــ تالاب، نہر یا دریا ـــــ سے فاصلہ پر واقع ہے اور اس کھیت تک پانی پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے دوسرے کی مملوکہ زمین پر سے گذارا جائے تو اس فرد کو ایسا کرنے کا حق ہوگا۔ دوسرے حقوقِ ارتفاق کی طرح یہ حق بھی قانونی نوعیت کا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک نظیر اس اصول کی وضاحت کرتی ہے:

اخبرنا مالك اخبرنا عمرو بن يحيٰی عن ابيه ان الضحاك بن خليفه ساق خليجًا له حتى النهر الصغير من العريض فاداد ان يمر به فى ارضٍ لمحمد بن سلمه فابى محمد بن مسلمه فقال الضحاك لم تمنعنى وهو لك منفعةٌ تشرب به اوّلًا واٰخرًا ولا يضرك فابى۔ فكلم فيه عمر بن الخطاب رضى الله تعالٰى عنه فدعا محمد بن مسلمه فامره ان يخلى سبيله فابى فقال عمر: والله ليمرن به ولو على بطنك۔ فامره عمر ان يجريه۔ نسخه۔[2]

ہمیں مالک نے خبر دی ہے کہ ہمیں عمرو بن یحییٰ نے اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ضحاک بن خلیفہ اپنی ایک نہر نکال کر اسے عُریض[3] سے نکلی ہوئی چھوٹی نہر تک لائے۔ پھر انہوں نے یہ چاہا کہ اسے محمد بن مسلمہ کی مملوکہ ایک زمین میں سے گذار کر آگے لے جائیں تو محمد بن مسلمہ نے اس کی اجازت دینے سے

---

[1]: یوسف موسیٰ۔ الاموال۔ صفحہ ۱۷۴

[2]: مؤطا امام محمد: کتاب الصرف وابواب الربا۔ باب الصلح فی الشرب وقسمۃ الماء، نیز ملاحظہ ہو مؤطا امام مالک: کتاب الاقضیہ۔ باب القضاء فی المرفق۔ اور یحییٰ ابن آدم القرشی: کتاب الخراج صفحہ ۱۱۲۔

[3]: مدینہ میں ایک وادی کا نام ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انکار کر دیا۔ ضحاک نے کہا کہ تم مجھے ایسا کرنے سے کیوں روکتے ہو جب کہ تمہیں اس سے فائدہ ہوگا، شروع سے آخر تک تم اس سے سینچائی کے لیے پانی لینا اور یہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے گی۔ انہوں نے اس کے باوجود انکار کیا تو ضحاک نے اس بارے میں عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے بات کی آپ نے محمد بن مسلمہ کو بلوایا اور ان سے کہا کہ ضحاک کو نہ روکیں پھر بھی انہوں نے انکار کر دیا۔ تو حضرت عمر نے فرمایا: خدا کی قسم وہ نہر گذاری جائے گی چاہے اسے تیرے پیٹ پر سے گذارنا پڑے۔ پھر حضرت عمر نے ضحاک سے کہا کہ وہ اپنی نہر (اس زمین پر سے گزار کر) نکالیں۔ آپ نے یہ بات انہیں لکھ کر دے دی۔

۳۔ حقِ مسیل:

گھروں کا گندا پانی یا بارش کا پانی باہر بہانے کے حق کو مسیل (بہنے کی جگہ) کا حق کہا گیا ہے۔ چونکہ پانی کے نکاس کے لیے جو نالیاں یا پرنالے بنائے جاتے ہیں۔ ان کو بسا اوقات دوسرے کی مملوکہ زمین یا دیوار سے گزارنا ہوتا ہے لہٰذا یہاں بھی وہی مسئلہ پیدا ہوتا ہے جو اوپر زیر بحث آچکا ہے۔ اس سلسلہ میں رواج کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اگر ایک مکان کا پانی قدیم زمانہ سے ایک جگہ سے گذر کر بہتا رہا ہے تو دوسروں کو اس مکان کے مالک کا یہ حق تسلیم کرنا پڑے گا۔ نزاعی امور میں حکام کو فریقین کی سہولت اور مفادِ عامہ کے ساتھ قدیم رواج اور اولیت کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا چاہیے۔

۴۔ حقِ گذرگاہ:

اگر کسی شخص کے اپنے مکان یا زمین تک پہنچنے کا راستہ دوسرے فرد کی زمین سے ہو کر گزرتا ہو، اس دوسرے فرد کو یہ حق نہیں کہ اس کو اپنی زمین پر سے گذرنے سے روک دے اس اصول کا اطلاق اُسی صورت میں ہوتا ہے جب کوئی متبادل راستہ نہ ہو[۵]۔

اسی اصول کا اطلاق اس شخص کی سواری اور جانوروں پر بھی ہوگا۔

وہ سڑکیں جو افراد نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے اپنی مملوکہ زمین پر بنوائی ہوں۔ ان

---

[۵]: قدری پاشا: مرشد الحیران۔ دفعہ ۴۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ذاتی ملکیت ہیں اور وہ دوسروں کو ان کے استعمال سے روک سکتے ہیں۔ لیکن غیر معمولی حالات میں عوام کو بھی ان کے استعمال کا حق حاصل ہوگا۔ مثلاً عام راستوں پر غیر معمولی بھیڑ بھاڑ ہو جائے تو عوام کو پرائیویٹ سڑکیں استعمال کر لینے کا حق حاصل ہو جائے گا۔[۱]

۵۔ حقِ جوار:

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے وہ پڑوسی جس کا مکان کسی دوسرے فرد کے مکان سے متصل واقع ہوا ہو اس فرد پر یہ حق رکھتا ہے کہ وہ خود اپنی ملک میں کوئی ایسا تصرف نہ کرے جو پڑوسی کے حق میں ضررِ فاحش کی تعریف میں آتا ہو۔ اس کے علاوہ اسے پڑوسی کو اپنے مملوکہ مکان سے ایسے فائدے اُٹھانے سے بھی نہیں روکنا چاہیے جن سے خود اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لا یمنعن جارٌ جارہ ان یغرز خشبۃً فی جدارہ۔[۲]

کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار میں کھونٹی گاڑنے سے نہ روکے۔

حقوقِ ارتفاق کی مذکورہ بالا مثالیں صرف نمونہ کے طور پر سامنے لائی گئی ہیں۔ موجودہ صنعتی دور میں کارخانوں اور گھروں کے مالکوں کے سامنے بہت سے ایسے مسائل آ سکتے ہیں جن میں اس حق کا استعمال یا اس کی صحیح تعبیر اور اس کے حدود کی تعیین ایک اہم مسئلہ بن جائے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس بارے میں شریعت کے مزاج اور بعض بنیادی اصولوں کی وضاحت کر دیں جن کی روشنی میں عملی مسائل کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ ضرر کا ازالہ ہو اور مصالح کا تحفظ عمل میں آئے۔

۱: محمد یوسف موسیٰ: الاموال ونظریۃ العقد۔ صفحہ ۱۸۱

۲: بخاری: ابواب المظالم والقصاص۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتواں باب

اجتماعی ملکیّت

گذشتہ ابواب میں اسلامی نظریۂ اجتماع اور فرد و اجتماع کے مابین حقوقِ ملکیت کی تقسیم کے تحت یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ انفرادی ملکیت کے پہلو بہ پہلو اجتماعی ملکیت کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہ حقیقت بھی واضح کی جاچکی ہے کہ انسان کے مالکانہ حقوق اپنے اصل منشاء میں اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب کہ انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں حقوقِ ملکیت کو ان کے اصل مقاصد کے تابع رکھے۔ چونکہ زندگی کے بہت سے مقاصد اپنی نوعیت کے اعتبار سے اجتماعی واقع ہوئے ہیں لہٰذا اجتماعی ملکیت کی ضرورت ایک بدیہی بات ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ عملی زندگی میں اجتماعی ملکیّت کیا شکلیں اختیار کرتی ہے اور مال و املاک کے مقاصد سے ان شکلوں کا کیا تعلق ہے۔

تفصیلات میں جانے سے پہلے مخصوص[1] مشترکہ املاک، عام[2] مشترکہ املاک اور[3] اجتماعی املاک کے درمیان فرق کر لینا ضروری ہے۔

۱۔ مخصوص مشترکہ ملکیّت سے وہ ملکیّت مراد ہے جس میں چند متعیّن افراد معلوم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نسبتوں کے ساتھ شریک ہوں۔

عام مشترکہ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی مجموعۂ افراد کو کسی چیز سے استفادہ کا عمومی حق حاصل ہو۔

اجتماعی ملکیت سے وہ ملکیّت مراد ہے جس پر کسی مجموعۂ افراد کو بحیثیتِ جماعت مالکانہ حقوق حاصل ہوں۔ عام طور پر جماعت یہ حقوق اپنے کسی نمائندہ ادارہ کے ذریعہ استعمال کرتی ہے، اور عرفِ عام میں یہی ادارہ اس چیز کا مالک قرار پاتا ہے۔

عام مشترکہ ملکیت اور اجتماعی ملکیت میں فرق یہ ہے کہ عام مشترکہ ملکیت کے تحت ہر فرد کو اس چیز سے آزادانہ استفادہ کا حق حاصل ہوتا ہے لیکن اجتماعی ملکیت میں مالکانہ تصرف کا اختیار صرف اس اجتماعی ہیئت کے لیے مخصوص ہوتا ہے جسے افراد نے یہ اختیار سونپا ہو۔ آئندہ ہمیں جن مسائل کا مطالعہ کرنا ہے ان میں یہ تقسیم قطعیت کے ساتھ نہیں ملحوظ رکھی جا سکتی، لیکن اس سے آئندہ مطالعہ میں باقاعدگی پیدا ہوگی۔

(ل) مخصوص مشترکہ ملکیّت

مخصوص مشترکہ ملکیت کی شکل یہ ہے کہ چند متعین افراد کو، کسی متعین چیز پر، جو انفرادی ملکیت کے قابل ہو، مشترکہ طور پر مالکانہ حقوق حاصل ہوں۔ ایک مشترکہ مکان جس میں دو بھائی شریک ہوں، اس کی ایک واضح مثال ہے۔ اسی طرح کوئی بھی جائداد یا سامانِ استعمال مشترکہ ملکیت ہو سکتا ہے۔ اس شکل میں ہر فرد کے حقوق استفادہ محدود اور متعین ہوتے ہیں، اور یہ تعیین اس معاہدہ کی رُو سے ہوتی ہے جس کے تحت یہ مشترکہ ملکیت وجود میں آئی ہو۔ اگر کوئی مشترکہ ملکیت وراثت کے ذریعہ وجود میں آئی ہے تو ہر ایک کا حق اس کے شرعی حصہ کے بقدر ہوگا۔ اگر چند افراد نے مل کر ایک چیز کو اپنے مشترکہ استعمال کے لیے خریدا ہے تو ہر ایک کا حصہ اس کی ادا کردہ قیمت کی نسبت سے ہوگا، یا کوئی باہمی راضی نامہ ان کے حقوق کی تعیین کرے گا۔ اسی طرح امداد باہمی کی انجمنوں،

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا مشترکہ کھیتی (Joint Farming) میں مالکانہ حقوق کی تفصیلات اس راضی نامہ کے مطابق ہوں گی جس کے تحت افراد نے اشتراکِ عمل کرنا طے کیا ہے۔ شریعت نے افراد کو اس طرح کے معاہدے کرنے، سامانِ زندگی یا جائداد کو مشترکہ ملکیت بنانے اور مشترکہ طور پر برتنے کی پوری آزادی دی ہے۔ مکان، جانور، اشیاءِ استعمال، کھیت، کارخانے، مشینیں سب اس کے تحت آسکتی ہیں۔

ملکیت کی اس شکل میں باہمی اختلاف یا نزاع کا حل باہمی مفاہمت، کسی حَکَم کے فیصلہ، یا عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ کیا جاسکے گا۔ اس حل کے اصولوں کی وضاحت فقہ کی کتابوں میں "شرکت" کے باب میں ملے گی۔

مخصوص مشترکہ املاک کے استعمال، ان میں تصرف اور ان کے تحفظ کا حق تمام شرکاء کو ان حدود کے اندر حاصل ہوتا ہے جو از روئے معاہدہ متعین ہوں۔ البتہ افراد کا حقِ انتقالِ ملکیت بعض پابندیوں کا تابع ہو جاتا ہے۔ ان خصوصی پابندیوں کے علاوہ جو باہمی راضی نامہ سے افراد نے اپنے اوپر عائد کر لی ہوں، ایک اصولی پابندی وہ ہے جو دوسرے شریک کے حقِ شفعہ کی وجہ سے عائد ہوتی ہے۔ کسی مشترکہ جائداد کے ایک حصہ کی فروخت کے وقت اس کے خریدنے کا اوّلین حق دوسرے شریک یا شرکاء کو پہنچتا ہے۔ جو اشیاءِ استعمال ناقابلِ تقسیم ہوں مثلاً جانور یا مشین وغیرہ ان میں کسی ایک شریک کو اس وقت تک حقِ انتقال نہیں حاصل ہوتا جب تک دوسرے شریک ایسا کرنے کی اجازت نہ دے دیں، یا خود اس حصہ کو خریدنے پر آمادہ ہو جائیں۔[1]

ان چند باتوں کے علاوہ ملکیت کی یہ شکل اپنی جداگانہ نوعیت کے باوجود انفرادی ملکیت سے ملتی جلتی ہے، اور اس پر علیحدہ تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

لے: ناقابلِ تقسیم اشیاءِ استعمال میں حقِ شفعہ کا مسئلہ اختلافی ہے۔ ہم نے جو رائے اختیار کی ہے اس کے دلائل اور مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ: الاموال ونظریۃ العقد فی الفقہ الاسلامی۔ صفحہ ۲۰۲ - ۲۵۳

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ب) عام مشترکہ ملکیّت

عام مشترکہ ملکیت کی مثالیں فضائے بسیط، سمندر، دریا، پہاڑ، جنگلات، غیر مملوکہ چراگاہیں اور چشمے وغیرہ ہیں۔ یہ قدرت کی ان قابلِ استفادہ اشیاء میں سے ہیں جن سے انسان بیشمار فائدے اُٹھاتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز انفرادی ملکیت کے تحت نہیں آتی بلکہ ساری دنیا، یا کسی ملک، یا کسی بستی کے انسانوں کی مشترکہ ملکیّت سمجھی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ تمام چیزیں انسانوں کے لیے بنائی گئی ہیں۔ زمین اور اس کے چاروں طرف فضاؤں میں جو کچھ بھی ہے سب انسانوں کے استفادہ کے لیے ہے۔ اس بات کا فیصلہ کہ ان میں سے کن چیزوں کو کس حد تک انفرادی ملکیت کے قابل سمجھنا چاہیے اور کن چیزوں کو متعلقہ انسانی گروہ کی مشترکہ ملکیّت سمجھنا چاہیے اشیاء کی نوعیّت، عرف عام اور شریعت کی ہدایات کو سامنے رکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان ایک بنیادی اصول فراہم کرتا ہے:

النّاس شرکاء فی الماء والکلاء والنّار[۱]

سارے انسان پانی، گھاس اور آگ میں شریک ہیں۔

المسلمون شرکاء فی ثلٰث، فی الماء والکلاء والنّار[۲]۔

مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں۔ پانی، گھاس اور آگ میں۔

ان تینوں چیزوں میں دو خصوصیات مشترک ہیں۔ پہلی خصوصیّت یہ ہے کہ یہ چیزیں قدرت کے ایسے عطیے ہیں جن کی پیدائش یا دریافت میں انسانوں کو کوئی خاص زحمت

---

[۱]: ابوعبید: کتاب الاموال۔ صفحہ ۲۹۵

[۲]: ابوداؤد: کتاب البیوع۔ باب فی منع الماء، ابویوسف: کتاب الخراج صفحہ ۱۱۵ اور ابن ماجہ: باب المسلمون شرکاء فی ثلاث۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں اٹھانی پڑتی، ان کو قابلِ استعمال بنانے کے لیے کوئی خاص محنت کرنی پڑتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام ضرورت کی چیزیں ہیں جن پر انفرادی قبضہ اور تسلط سماج کے عام افراد کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ جن دوسری چیزوں میں یہ دونوں خصوصیات پائی جائیں ان کو بھی ان اشیاء پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نمک کی کانوں کو مشترکہ ملکیت قرار دیا ہے۔ جیسا کہ آگے واضح کیا جائے گا، نیز تیسرے باب میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اسی اصول کے تحت ان تمام معدنی اشیاء کو جو سطح زمین پر پائی جائیں (معادنِ ظاہرہ) مشترکہ ملکیت سمجھا جاتا ہے۔

عام مشترکہ املاک تین قسم کے ہو سکتے ہیں: عالمی[۱]، ملکی[۲]، اور مقامی[۳]۔

۱۔ عالمی مشترکہ املاک:

عرف عام کے مطابق ساحلی حدود (Territorial Waters) سے باہر سمندر کو اور ملکی فضائی حدود (National) (Air-Space) کے آگے فضائے بسیط کو عالمی مشترکہ املاک کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان سمندروں کی تہہ میں، اور فضاء میں نہ جانے کیا کچھ ہو گا جو انسان کی قوتِ تسخیر کا منتظر ہے۔ شریعت کے عام اصول کی روشنی میں دنیا کی تمام قوموں اور سارے افرادِ انسانی کو ان سمندروں اور فضاؤں سے ہر ایسے استفادہ کا حق حاصل ہے جو دوسری قوموں یا افراد کے لیے مضرت کا باعث نہ ہوں۔ ان مشترکہ املاک کے غیر مضرت رساں استعمال کے لیے قومیں یا افراد باہمی رضامندی سے جو ضابطے (Convention) طے کر لیں ان کی حیثیت ایک معاہدے کی ہوتی ہے جس کا احترام سب کے لیے ضروری ہے۔

مشترکہ سمندروں سے استفادہ میں جہازرانی، مچھلیوں کا شکار، اور سمندر سے دوسری معدنی اور نباتاتی اشیاء کا حاصل کرنا شامل ہے۔ مضرت رسانی سے اجتناب کے جس اصول کا مطالعہ ہم نے انفرادی حقوقِ ملکیت کے حدود کے تحت پانچویں باب میں کیا ہے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کا اطلاق یہاں بھی ہوتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا جا سکتا ہے۔ بحری جہازوں کو دورانِ سفر میں اپنا استعمال شدہ ناکارہ تیل خارج کرنا ہوتا ہے۔ اگر یہ تیل ایسے علاقوں میں خارج کیا جائے جہاں مچھلیاں بکثرت ہوتی ہیں یا جہاں سے ساحل قریب ہو، تو اس سے بہت سے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مچھلیاں مر جاتی ہیں، ساحلی علاقوں کی نباتات پر بُرا اثر پڑتا ہے، اور بندرگاہوں میں اس تیل سے، جو سطح سمندر پر تیرتا رہتا ہے، آگ لگ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ چند سال ہوئے ایک بین الاقوامی معاہدہ کے ذریعہ خراب تیل خارج کرنے کو ایسے ضابطوں کا پابند بنا دیا گیا ہے جس سے ان مضرتوں کا سدِّباب ہو سکے۔ سمندری علاقوں میں ایٹمی تجربات کے مضر پہلوؤں سے بھی دنیا آگاہ ہو چکی ہے، اور اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انسانیت کو اس مضرت سے محفوظ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

مصنوعی سیّاروں (Satellite) کے اس دور میں عالمی مشترکہ فضائے بسیط کے استعمال میں 'لاضرر' کے اصول کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ایک ملک اپنی فضائے ملکی سے باہر خارجی فضا (Outer Space) میں سیّارے چھوڑے اور ان کو تعمیری یا تخریبی مقاصد کے لیے استعمال کرے۔ اسلامی اصول کی روشنی میں ایک طرف تو ہر ملک کو تعمیری اغراض کے تحت ایسا کرنے، دوسرے سیّاروں کی تسخیر کی کوشش کرنے، اور فی الجملہ فضاؤں کی تسخیر اور ان سے استفادہ کرنے کا حق حاصل ہے اور دوسری طرف اس پر یہ پابندی ہے کہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو دوسرے ممالک یا انسانیت عامّہ کے لیے قابلِ لحاظ نقصان کا باعث ہو۔ فضائے بسیط میں ایسے بم چھوڑنے، یا دوسرے خطرناک تجربات کرنے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا جن کا بُرا اثر دوسرے ممالک اور عام انسانوں پر، یا قدرت کی قابلِ استفادہ اشیاء پر مرتب ہوتا ہو۔

اصول کا تقاضا یہ بھی ہے کہ عالمی مشترکہ املاک سے استفادہ میں قومیں اور افراد قدرِ ضرورت سے آگے نہ بڑھیں تاکہ قدرت کی نعمتوں کا بلا ضرورت ضیاع نہ عمل میں آئے

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ ملکی مشترکہ املاک :

کسی ملک میں پائے جانے والے دریا، جھیلیں، قدرتی جنگلات، پہاڑ، اس کے سمندری ساحلی حدود، اور اس کی فضائے ملکی، اس ملک کے باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ ملک کے تمام افراد کو ذاتی ضروریات کے لیے ان اشیا سے استفادہ کا حق حاصل ہے۔ پینے اور آبپاشی کے لیے پانی، ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کے لیے یا تعمیر میں لگانے کے لیے لکڑیاں، اور اسی طرح پتھر وغیرہ ہر فرد قدرت کے ان خزانوں سے مفت حاصل کر سکتا ہے۔ جنگلات میں جانوروں کے شکار اور دریاؤں یا جھیلوں میں مچھلی کے شکار کا حق ہر فرد کو حاصل ہے۔ جیسا کہ نمبر ۔ باب میں واضح کیا جا چکا ہے، اس اصول کا ماخذ قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جن میں ان اشیاء کو انسانوں کے استفادہ کے لیے مباح قرار دیا گیا ہے اور ان اشیاء کی مشترکہ ملکیت کا اصول براہِ راست اس حدیث سے بھی ماخوذ ہے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرام کے آثار یہ بتاتے ہیں کہ مشترکہ املاک میں صرف پانی، گھاس اور آگ ہی نہیں شامل ہیں بلکہ دوسری اشیاء بھی جو انہی چیزوں کی طرح قدرت کی پیدا کردہ اور عام ضرورت کی چیزیں ہوں اسی ذیل میں آتی ہیں :

عن مکحول رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "لا تمنعوا کلاءً ولا ماءً ولا نارًا، فانہ متاعٌ للمقوین وقوۃٌ للمستضعفین"۔[۱]

حضرت مکحول رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "کسی کو بھی گھاس، پانی یا آگ لینے سے نہ روکو کیونکہ یہ مسافروں کا سامانِ ضرورت اور کمزوروں کا سہارا ہیں۔"

---

[۱]: ابو یوسف : کتاب الخراج۔ صفحہ ۱۱۵

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس حدیث سے واضح ہے کہ ان قدرتی پیداواروں کو جو عام ضرورت کی چیزیں ہیں مشترکہ ملکیت قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ ہر ایک ان سے فائدہ اُٹھا سکے، کیونکہ یہ چیزیں جو بغیر کسی محنت کے حاصل کی جا سکتی ہیں بے روزگاروں، محتاجوں اور کمزوروں کو وقت آنے پر سہارا دیتی ہیں۔ عرب کی مخصوص معیشت میں اس نقطۂ نظر سے ان چیزوں کو خاص اہمیت حاصل تھی جن کا اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ اہل عرب کے لیے پانی اور گھاس کی حیثیت بنیادی ذرائع کی تھی جن پر ان کے مویشیوں کی زندگی کا انحصار تھا خود ان کی معیشت زیادہ تر ان جانوروں کے دودھ اور گوشت کے سہارے قائم تھی۔ ان کے لیے دوسرا اہم ذریعہ معاش زراعت اور باغبانی تھا جن کے لیے پانی بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس حدیث میں صرف تین چیزوں کے ذکر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسی نوعیت کی حامل دوسری اشیاء یہ مقام نہیں حاصل کر سکتیں۔ طرزِ معیشت ایک بدلتی رہنے والی چیز ہے اور یہ کام ہر دور کی اسلامی ریاست کا ہے کہ وہ حالات اور ضروریات کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کرے کہ کونسی قدرتی اشیاء مشترکہ ملکیت شمار ہوں گی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر نمک پر بھی اسی اصول کا اطلاق کیا ہے :

عن ابیض بن حمال المازنی انہ استقطع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الملح الذی بمأرب، فقطعہ لہ۔ فلما ولی قیل یا رسول اللہ أتدری ما اقطعت لہ، انما قطعت لہ الماء العد قال فرجعہ منہ۔[1]

ابیض بن حمال مازنی سے مروی ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مأرب میں واقع نمک کی جھیل مانگی تو آپ نے اسے یہ بطور جاگیر دے دیا جب وہ جانے لگا تو آپ سے کہا گیا کہ : اے اللہ کے رسول آپ جانتے ہیں کہ آپ نے

---

[1] : ابو عبید : کتاب الاموال، صفحہ ۲۷۵، نیز ملاحظہ ہو ابو داؤد : کتاب الخراج … باب فی اقطاع الارضین۔ حدیث نمبر ۷

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے کیا دے دیا؟ آپ نے تو اسے "بہتا ہوا پانی" دے دیا۔ راوی کہتا ہے کہ پھر آپ نے اس سے یہ جاگیر واپس لے لی۔

عن ابیض ابن حمّال: انہ استقطع النبی صلی اللہ علیہ وسلم الملح الذی بمأرب فاراد ان یقطعہ ایاہ۔ فقال رجل انہ کالماء العد۔ فابی ان یقطعہ[۵۱]

ابیض ابن حمّال سے مروی ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مارب میں واقع نمک کی جھیل، مانگی، تو آپ نے ارادہ کیا کہ اُسے بطور جاگیر اس کو دے دیں۔ ایک آدمی نے کہا کہ وہ (نمک کا ذخیرہ) تو بہتے ہوئے پانی کی طرح ہے۔ تو آپ نے اسے بطور جاگیر دینے سے انکار کر دیا۔

نمک کے اس ذخیرہ کو ذاتی ملکیت میں نہ دینے کا سبب یہ ہوا کہ وہ بہتے ہوئے پانی کی طرح قدرت کی ایسی پیداوار تھا جس سے استفادہ کے لیے محنت کی ضرورت نہ تھی۔ اور جس کی ضرورت پانی کی طرح عام تھی۔ اسی اصول کے تحت اس قسم کی دوسری اشیاء کو بھی مشترکہ ملکیت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عینی، شارح بخاری خطابی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"چشمہ کا پانی اور معادنِ ظاہرہ جیسے نمک، رال، مٹی کا تیل، اور اس کے مثل تمام چیزوں کا بطور جاگیر یا عطیہ دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ سارے انسان نمک پانی، اور ان چیزوں میں جو اسی قسم کی ہوں برابر کے شریک ہیں"[۵۲]

اور ماوردی نے صراحت کر دی ہے کہ معادنِ ظاہرہ، مثلاً "سرمہ، نمک، تارکول، پٹرول" وغیرہ پانی کی طرح ہیں جن کا کسی ایک آدمی کو دے دینا جائز نہیں۔ سارے انسان ان میں برابر کے شریک ہیں۔ جو پہنچ جائے وہ انھیں لے

---

۵۱ : یحییٰ ابن آدم القرشی: کتاب الخراج۔ صفحہ ۱۱۰

۵۲ : بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد العینی: عمدۃ القاری۔ جلد ۲ صفحہ ۲۰۳۔ دارالسلطنۃ عثمانیۃ طبع ۱۳۰۸ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکے گا"۔[1]

مشترکہ املاک اگرچہ ان معنیٰ میں ریاست کی ملکیت نہیں ہوتیں جن معنیٰ میں حکومت کا خزانہ، سرکاری عمارتیں یا سرکاری زمینیں ریاست کی ملکیت ہوتی ہیں، پھر بھی ریاست کو ان پر خصوصی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ وہی ان کے مناسب استعمال پر نگران ہوتی ہے۔ اُسے خود ان املاک سے استفادہ کا حق حاصل ہے اور وہ اجتماعی ضروریات کے لیے، یا قومی مفاد کی خاطر، ان املاک کے ایک حصّہ کو سرکاری اغراض کے لیے مخصوص بھی قرار دے سکتی ہے۔ البتہ ان املاک کی مشترکہ نوعیّت کا تقاضا ہے کہ کبھی بھی کسی ایک قسم کی مشترکہ ملکیّت کو اس طرح سرکاری ملکیت نہ قرار دے دیا جائے کہ افراد اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ان سے استفادہ نہ کر سکیں، یا ان کی قیمت ادا کرنے پر مجبور ہوں۔ جن قدرتی اشیاء کے خزانے محدود ہوں ان کے استعمال پر ریاست قومی مفاد اور آئندہ نسلوں کے مفاد کے پیشِ نظر ایسی پابندیاں عائد کر سکتی ہے جن کا مقصد ان کے بلا ضرورت یا مُسرفانہ استعمال کا سدِّ باب ہو۔ اسی طرح اگر بعض افراد مشترکہ املاک کو کاروباری اغراض کے لیے بڑے پیمانہ پر استعمال کرنا چاہیں تو ریاست مفادِ عامہ کے تحفظ کے لیے ان پر مناسب پابندیاں عائد کر سکتی ہے اور ان سے معاوضہ بھی وصول کر سکتی ہے۔ اس شکل میں یہ شرط بھی ملحوظ رکھنی ہو گی کہ کسی مشترکہ ملکیّت کو کسی ایک کاروباری فرد یا گروہ کے حوالہ کرنے سے عام افراد کا حقِ انتفاع مجروح نہیں ہونا چاہیے۔

افراد کو مشترکہ قومی املاک سے استفادہ میں جن حدود کی پابندی کرنی ہو گی ان میں فضول ضائع کرنے اور اسراف سے پرہیز اور مضرت رساں استعمال سے اجتناب شامل ہے۔ ان حدود کی تشریح پانچویں باب میں کی جا چکی ہے۔ یہاں صرف اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ مشترکہ املاک سے استفادہ میں افراد کو اپنی قدرِ ضرورت کا لحاظ رکھنا

---

[1] الاحکام السلطانیہ، صفحہ ۱۷۴، نیز بدائع الصنائع جلد ۶، صفحہ ۱۹۴۔ اور ابو یعلیٰ: الاحکام السلطانیہ، صفحہ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۷ھ

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہییے اور ایسے طریقے نہیں اختیار کرنے چاہییں جن سے دوسرے افراد کو دشواریوں کا سامنا ہو یا وہ حقِ انتفاع سے محروم ہو جائیں۔

کسی ملک کے باشندوں کو انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنی زمینیں، ساحلی سمندر اور فضائے ملکی کے ایسے استعمال کا حق نہیں پہنچتا جو دوسرے ملکوں یا عام انسانوں کے لیے ضرر کا باعث ہو۔ یہ بات شریعت کے اس بنیادی اصول سے ماخوذ ہے کہ "کسی مالک کو اپنی ملکیت کے ایسے استعمال کا حق نہیں حاصل ہے جو پڑوسی کے لیے کھلے ہوئے نقصان کا باعث ہو" مالک خواہ ایک فرد ہو یا پوری قوم، اس اصول پر عمل ضروری ہے۔ ایٹمی طاقت، ہائیڈروجن بم، اور بین البرّ اعظمی ہتھیاروں (Inter-Continental Missiles) اور خارجی فضاء میں چھوڑے جانے والے مصنوعی سیاروں (Space Satellites) کے اس دور میں اس اصول کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ایک ملک اپنے مملوکہ خطۂ زمین یا سمندری علاقہ میں ایک بم چھوڑنے کا تجربہ کرتا ہے جس کے زہریلے اثرات دور دراز تک ہواؤں اور سمندروں میں پھیل جاتے ہیں۔ خشکی، سمندر اور فضا کے جانداروں پر اور نباتات پر اس کے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور پڑوسی ممالک میں انسانی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اپنی ملکیت کا یہ استعمال صریحاً "کھلا ہوا نقصان" پہنچانے کے مترادف ہے۔ اسلام کے تصورِ ملکیت کے مطابق کسی قوم کو اپنی زمین یا سمندری علاقے کے ایسے استعمال کا حق حاصل نہیں ہے۔ جو قومیں حقِ ملکیت کے نام پر ایسی حرکتوں کو بجا قرار دیتی ہیں وہ ایک جھوٹے حق کا سہارا لیتی ہیں جسے اسلام نہیں تسلیم کرتا۔

۳۔ مقامی مشترکہ املاک:

قبائلی دور میں جب آبادیاں دور دور اور ایک دوسرے سے ممتاز ہوتی تھیں مختلف آبادیوں کی اپنی مشترکہ چراگاہیں اور چشمے، کنوئیں وغیرہ ہوتے تھے۔ آج بھی بہت سے علاقوں میں اس طرح کی مقامی مشترکہ املاک پائی جاتی ہیں۔ خود ہمارے ملک

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں گاؤں کے گڑھے اور تالاب گاؤں والوں کی مشترکہ ملکیت سمجھے جاتے ہیں قرن اول میں اس طرح کی مشترکہ املاک کا رواج بہت زیادہ تھا۔ شریعت نے ان مشترکہ چراگاہوں اور چشموں کو متعلقہ آبادیوں کی مشترکہ ملکیت تسلیم کیا ہے۔ ایک طرف تو ان آبادیوں کے ہر فرد کو ان املاک سے استفادہ کا حق حاصل تھا۔ اور دوسری طرف اس آبادی کو دوسری آبادیوں کے مقابلہ میں اپنی ان املاک کے تحفظ اور ان کو ان میں مداخلت سے روکنے کا بھی حق حاصل تھا۔

مقامی مشترکہ املاک کے بارے میں اصل چیز عرفِ عام ہے۔ بشرطیکہ کسی علاقہ یا کسی زمانہ کا عرفِ عام شریعت کے اصولوں یا اس کی واضح ہدایات سے نہ ٹکراتا ہو۔ دورِ جدید کی اسلامی ریاست اپنے حدودِ اختیار کے اندر عرفِ عام کا جائزہ لے کر مقامی مشترکہ املاک کی نوعیت اور ان سے استفادہ کے حدود وغیرہ سے متعلق ضابطے وضع کر سکتی ہے۔

(ج) اجتماعی ملکیّت

اجتماعی ملکیّت کو بھی دو نمایاں قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱ - ادارہ یا انجمنوں کے املاک۔

۲ - مقامی حکومتوں کے املاک۔

۳ - ریاستی املاک۔

مقامی حکومتوں کے املاک بھی اصولاً ریاستی املاک میں شامل ہیں۔ لیکن مطالعہ میں سہولت کی خاطر ہم نے ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ ریاستی ملکیت کا مطالعہ ہم آئندہ ابواب میں کریں گے، البتہ سماج کی دوسرے انجمنوں اور اداروں کے املاک اور مقامی حکومت خود اختیاری کے املاک کا مطالعہ ذیل میں کیا جائے گا۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ اجتماعی اداروں اور انجمنوں کے املاک :

سماجی ادارے اور انجمنیں بالعموم کسی متعین مقصد کے تحت بعض مخصوص اعمال و وظائف بجا لانے کے لیے قائم کی جاتی یا وجود میں آتی ہیں۔ سیاسی جماعتیں، مذہبی ادارے ثقافتی اور تعلیمی ادارے یا انجمنیں، یا تفریحی انجمنیں، وغیرہ اسی ذیل میں آتی ہیں۔ یہ ادارے اور انجمنیں مقامی، ملکی یا بین الاقوامی ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق کبھی کسی خاص ملک یا ملت کے لوگوں سے ہوتا ہے، کبھی کسی خاص پیشے کے لوگوں سے، لیکن یہاں ان کی مختلف قسمیں گنانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

افراد کی طرح یہ ادارے اور انجمنیں بھی ملکیت حاصل کر سکتی ہیں اور ان کو بھی جملہ مالکانہ حقوق حاصل ہیں، البتہ ان کے مالکانہ حقوق اور افراد کے مالکانہ حقوق کے درمیان حدود و اختیارات کے اعتبار سے چند نمایاں فرق ہیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ ان کے مالکانہ تصرفات، ان کے مقاصد اور اعمال و وظائف کے تابع ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے مقاصد سے ہٹ کر اپنی ملکیت کے استعمال کا حق حاصل نہیں ہے۔ ان کو اپنے مقاصد کی تعیین، یا ان میں ترمیم و تبدیلی کے بارے میں پوری آزادی حاصل ہے، مگر ان مقاصد کو شرعی حدود کے اندر ہونا چاہیے۔ ان کے مالکانہ تصرف و اختیار کی تفصیلی حد بندی کرنا ان افراد، جماعتوں، یا قوموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو ان کی تشکیل کرتی ہیں۔ جو افراد یا مجالس ان اداروں کے منتظم کی حیثیت سے عملاً ان مالکانہ تصرفات کی مجاز ہوتی ہیں ان کی حیثیت نمائندہ (وکیل) اور نائب کی ہوتی ہے، اور وہ ان حدود کی پابند ہوتی ہیں جو ادارہ نے متعین کر دیے ہوں۔

دوسرا فرق ان ذرائع کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جن سے ادارہ نے ملکیت حاصل کی ہو۔ جو املاک عطیہ کے طور پر یا خرید کر حاصل کی گئی ہوں ان کے سلسلہ میں تو ان اداروں کو جملہ مالکانہ حقوق حاصل ہیں، لیکن جو املاک وقف کے ذریعہ حاصل ہوئی ہوں وہ اسلامی قانون وقف کے تحت متعدد ضوابط کی پابند ہوتی ہیں۔ وقف کرنے والے نے، یا بعض

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شرائط کے تحت وصیت کے ذریعہ ملکیت منتقل کرنے والے نے، جو پابندیاں عائد کی ہوں ان کے علاوہ وقف کردہ املاک کے سلسلہ میں یہ ادارے ان ضوابط کے بھی پابند ہوں گے جو اسلامی حکومت نے اوقاف کے لیے وضع کیے ہوں۔ ان ضوابط کے بنیادی اصول فقہ کی کتابوں میں وقف کے باب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک اہم پابندی انتقالِ ملکیت کے حق سے متعلق ہے۔ موقوفہ جائداد فروخت نہیں کی جا سکتی۔ نہ اسے کسی اور طریقہ سے کسی ایک فرد کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ہر وقف اصلاً پورے سماج کی ملکیت ہے، اگرچہ اس سے انتفاع کا حق اس متعین فرد یا ادارہ کو حاصل ہوتا ہے جس کے حق میں وقف کیا گیا ہو۔ موقوفہ جائداد انفرادی ملکیت میں واپس نہیں لوٹ سکتی۔ اگر متعلقہ ادارہ یا انجمن ختم ہو جائے اور کوئی نیا ادارہ اس کی جگہ نہ پُر کرے تو موقوفہ ملکیت اسلامی ریاست کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو پورے سماج کی نمائندہ ہے۔

اسی طرح کسی اجتماعی ادارہ کو جو جائداد یا مال سرکاری امداد کے طور پر اسلامی حکومت سے ملے اس کے استعمال میں وہ ان ضوابط کا بھی پابند ہوگا جن کے تحت یہ مدد دی گئی ہو۔ چونکہ ان اجتماعی املاک کے صحیح استعمال اور ان سے وابستہ ذمہ داریوں کی بجاآوری کا تعلق پورے اجتماع یا اس کے کسی جزو کے مفادات و مصالح سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جن افراد کے ہاتھوں میں ان کے استعمال کے اختیارات ہوں ان پر نگرانی کا حق ریاست کو حاصل ہوگا۔ ریاست اجتماعی املاک کے رجسٹریشن کے قواعد و ضوابط بنا سکے گی اور ان کے غلط یا مسرفانہ استعمال پر مداخلت کر سکے گی۔ ریاست نگرانی کے لیے احتساب کے ایسے طریقے اختیار کرے گی جو ان اداروں کی آزادی عمل کو مجروح کرنے ہوں۔ اسلامی ریاست کے حدود میں جو بین الاقوامی ادارے ہوں ان املاک پر احتسابی نگاہ رکھنے میں وہ ان بین الاقوامی معاہدوں کی پابند ہوگی جن کے تحت یہ ادارے کام کر رہے ہوں۔ جہاں کوئی متعین معاہدہ یا ضابطہ [redacted] نہ موجود ہو، وہاں شریعت کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں عرف عام کو اپنا رہنما بنائے گی۔

۱؎ بصائع جلد ۲ - صفحہ ۲۲۱

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عبادت گاہوں اور ان پر موقوفہ املاک کے سلسلہ میں بھی ریاست کا موقف یہی ہوگا۔ جہاں تک مسلمانوں کی مساجد کا تعلق ہے، اسلامی ریاست کی نگرانی فرہی اور سرپرستانہ ہوگی، اور وہ ان کے انتظامات بہتر رکھنے کی کوشش کرے گی۔ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے امور ان مذاہب کے پیروؤں پر مشتمل ملکی یا مقامی انجمنوں کے سپرد ہوں گے۔ عبادت گاہوں کو معروف کے خلاف دوسرے مقاصد کے لیے نہ استعمال کیا جا سکے گا۔ انہیں کبھی کسی فرد کی ذاتی ملکیت نہ بنایا جا سکے گا۔ ریاست بھی ان کو سرکاری ملکیت بنانے یا ضبط کر لینے کے اقدامات نہ کر سکے گی۔ البتہ اگر کسی عبادت گاہ کو شر و فساد اور سازشوں کا مرکز بنا لیا جائے تو ریاست اس فتنہ کے سدِ باب کے لیے مناسب اقدامات کرے گی۔[۱]

۲۔ مقامی حکومت کی املاک:

پنچایت، ٹاؤن ایریا کمیٹی، میونسپلٹی، اور کارپوریشن وغیرہ مقامی حکومت خود اختیاری کے وہ ادارے ہیں جن کو مرکزی یا صوبائی حکومت کے زیرِ نگرانی مقامی باشندے خود تشکیل دیتے ہیں۔ یہ ادارے مقامی طور پر حفظانِ صحت، تعلیم، صفائی، روشنی اور ذرائع نقل و حمل وغیرہ مختلف سماجی ضروریات کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں۔ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے یہ ادارے مختلف معروف ذرائع سے مال و املاک حاصل کرتے ہیں۔

اسلام کے سیاسی اور تمدنی نظام میں بھی اس طرح کے اداروں کی پوری گنجائش ہے، اور دورِ جدید کی اسلامی ریاست میں ہمیں اس طرح کے اداروں کا وجود تسلیم کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے۔

ان اداروں کی نوعیت، اور ان کے ذرائع ملکیت دوسرے سماجی اداروں سے مختلف ہیں۔ ایک طرف تو یہ براہِ راست ریاست کے تحت ہوتے ہیں۔ اس سے مالی امداد پاتے ہیں، اور بعض حالات میں بالائی حکومت ان کو توڑ کر جملہ انتظامات خود سنبھال

---

[۱]: ملاحظہ ہو، بارھواں باب۔ جلد دوم

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لینے کا اختیار رکھتی ہے۔ دوسری طرف یہ مقامی شہریوں سے مختلف محاصل وصول کرنے، اور مقامی مشترکہ املاک سے اجتماعی اغراض کے تحت استفادہ کرنے کے حقدار ہوتے ہیں۔ یہ اپنی فراہم کردہ خدمات —— سڑکوں، روشنی اور پانی کے انتظام، تعلیمی اداروں وغیرہ —— کے ذریعہ مزید سرمایہ بھی جمع کر سکتے ہیں۔ ان کے مالکانہ حقوق اور ذمہ داریاں ریاست اپنے قوانین کے ذریعہ طے کرتی ہے۔

ان اداروں کی ملکیت میں بعض مقامی سرکاری عمارتیں، سڑکیں، پارک، میدان اور انکا اپنا خزانہ شامل ہوتا ہے۔ ساری مقامی مشترکہ املاک مثلاً چراگاہیں، تالاب، کنوئیں وغیرہ ان کی زیرِ نگرانی ہوتے ہیں۔ ان مشترکہ املاک کے بعض حصّوں کو وہ ریاست کے مقرر کردہ ضابطوں کے تحت، مقامی آبادی کے نمائندوں کے مشورہ سے سرکاری کاموں کے لیے مخصوص کر سکتے ہیں۔ البتہ انہیں یہ حق نہیں حاصل ہے کہ کسی مباحِ عام چیز کو کلیتہً اپنے لیے مخصوص کر لیں، اور ان کو عوام کے ہاتھوں قیمت لے کر فروخت کریں۔

ان املاک کو امانت کے طور پر برتنے، ان کے ذریعہ عوام کی خیرخواہی کا حق ادا کرنے، اور ان کو اپنے ذاتی مفاد کی ترقی کا ذریعہ بنانے کی جو ذمہ داریاں مقامی حکومت کے کارکنوں پر عائد ہوتی ہیں وہ اصولاً وہی ہیں جو خود عمّالِ ریاست پر ریاستی املاک کے سلسلہ میں عائد ہوتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کا تفصیلی مطالعہ آئندہ کیا جائے گا۔

المكتبة الرحمانية
۹۹-بے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
06264
نمبر ....

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ